شاگردانِ انیس

ڈاکٹر سید تقی عابدی حسین جعفری

ڈاکٹر سیّد قمقام حسین جعفری

شاگردانِ انیسؔ

maablib.org

شاگردانِ انیسؔ

ڈاکٹر سیّد تقمقام حسین جعفری

اکادمی بازیافت

پہلی اشاعت : نومبر ۱۹۷۹ء (مکتبہ جعفریہ کراچی)
دوسری اشاعت : مئی ۲۰۰۳ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: ۷۷۵۱۳۴۴
قیمت : ۲۵۰/ روپے
جملہ حقوق محفوظ

Shagirdan-e-Anees
(Research, Criticism)

By : Dr. Syed Qamqaam Hussain Jafri

Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 7751428
e-mail: mukalama@cyber.net.pk

شیدایانِ انیس

کے نام معنون کرتا ہوں

maablib.org

فہرست

چند تاثرات	پروفیسر سحر انصاری	۱۱
اس مقالے کے بارے میں چند معروضات	تقام حسین جعفری	۱۴
حرفِ آغاز		۱۵
مرثیے کا مفہوم اور اس کے اصول		۱۷
مرثیے کا آغاز		۱۸
دکنی دور کے مشہور مرثیہ گو		۱۹
شمالی ہند میں مرثیے کا آغاز		۲۰
مرثیے کا تعمیری دور		۲۳
مرثیے کے اجزائے ترکیبی		۲۵

شاگردانِ انیس (مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں) حروفِ تہجی کے اعتبار سے

۱۔ جلیس، سیّد محمد حیدر	۲۸
۲۔ خلد، سیّد حیدر حسین	۲۹
۳۔ رفیق، مرزا علی حسین	۲۹
۴۔ رئیس، میر احسان علی، رئیس کے ایک مرثیے کا اجمالی خاکہ	۲۹

۵۔ رئیس، میر محمد عسکری، رئیس کے مرثیوں کی چند خصوصیات ۴۳
۶۔ ریاض، سید ریاض الدین حسن، ریاض کے چار مرثیوں پر تبصرہ ۵۸
۷۔ زار، سید آغا علی زوار ۸۷
۸۔ سلیس، میر محمد، سلیس کے مرثیوں میں اخلاقی درس اور کرداری نگاری کے نمونے ۸۸
۹۔ شریف، سید شریف الحسن، انیس کے ایک گم نام شاگرد ۱۰۶
۱۰۔ ضیا، سید باقر حسن ۱۰۹
۱۱۔ فارغ، سید محمد افضل، فارغ کی رزمیہ شاعری ۱۱۰
۱۲۔ لطیف، سید محمد حسین ۱۴۱
۱۳۔ محسن، سید محمد محسن ذوالقدر: مختصر حالات اور کلام کا نمونہ ۱۴۲
۱۴۔ مونس، میر نواب، باکمال شاعر اور معجز نما مصور ۱۴۴
۱۵۔ نفیس، میر خورشید علی، مرثیہ اور میر نفیس ۱۶۹
۱۶۔ وقار، سید فضل علی، وقار کے مراثی پر ایک نظر ۱۹۴
۱۷۔ یونس، میر کاظم حسین ۲۰۸

باب دوم

دکن میں مرثیہ گوئی کی ابتدا ۲۰۹
بہمنی دور: ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۵ء تک ۲۰۹
عادل شاہی دور: ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک ۲۱۰
قطب شاہی دور: ۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک ۲۱۳
شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کا آغاز ۲۱۵
مرثیہ گوئی میں تلمذ رکھنے والے شعرا
۱۔ ابو محمد ۲۲۲
۲۔ آرزو، حکیم سید بندہ رضا ۲۲۲
۳۔ ازل، سید آغا حسن ۲۲۳

۴۔ حزیں، حکیم محمد علی ۲۲۳
۵۔ خسرو، نواب حسن علی خاں ۲۲۶
۶۔ ذکی، مرزا محمد خاں ۲۲۶
۷۔ سراج، سید سراج الدین احمد ۲۲۷
۸۔ شیدا، حکیم محمد رسول ۲۲۸
۹۔ عابد، عابد علی ۲۳۰
۱۰۔ عروج، نواب مرزا محمد باقر علی خاں ۲۳۶
۱۱۔ فردوس، میر ولایت علی ۲۴۷
۱۲۔ لطیف، محمد لطیف ۲۴۸
۱۳۔ مریخ، سید حسن علی ۲۴۹
۱۴۔ معزز، سید محمد علی ۲۴۹
۱۵۔ طول، میر جعفر علی ۲۵۰
۱۶۔ ناظم ۲۵۱
۱۷۔ یونس، سید علی ۲۵۱

باب سوم

مرثیہ خوانی کے بارے میں چند عمومی اشارات ۲۵۳
۱۔ حافظہ ۲۵۵
۲۔ مصرع کے ٹکڑے کرنا ۲۵۵
۳۔ رُخ سے مصرع کی ادائگی ۲۵۶
۴۔ لہجہ ۲۵۷
مرثیے کے مختلف اجزائے ترکیبی کی ادائگی کے ضمن میں ملحوظات ۲۵۸
خوانندگی میں شاگرد ۲۶۶
۱۔ اچھے صاحب (داروغہ) ۲۶۶
۲۔ آغا میر ۲۶۷

۳۔ امیر علی (شیخ)	۲۶۷
۴۔ امیر علی (منشی)	۲۶۸
۵۔ سلامت علی (میر)	۲۶۸
۶۔ عکس مرزا محمد عباس	۲۶۹
۷۔ علی حسن (میر)	۲۶۹
اختتامیہ	۲۷۰

ضمیمہ باب اوّل

ا۔ مانوس، سید علی	۲۷۳
۲۔ نگار، سید محمد مہدی کے مختصر حالات اور ان کے ایک مرثیے پر تبصرہ	۲۷۴

ضمیمہ باب دوم

ا۔ ازل، حکیم آغا حسن کے ایک مرثیے کا تجزیہ (باب دوم، ص ۲۲۴)	۲۹۴
۲۔ عطا، آغا وزیر حسین خاں	۳۰۳

ضمیمہ باب سوم

ا۔ حضور، نواب امجد علی خاں	۳۰۴
۲۔ میر امجد حسین	۳۰۵
چند محققین کی آرا	۳۰۷
تعارف	۳۰۸
کتابیات	۳۱۱
اخبار و جرائد	۳۱۴
مخطوطات	۳۱۵
مخطوطات	۳۱۶
قطعۂ تاریخ	۳۱۷

چند تاثرات

میر انیس کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور ہنوز نئے گوشوں کی تلاش جاری ہے۔ میر انیس کا انفرادی اسلوبِ سخن اب تاریخِ ادب کے مسلمات میں شامل ہے۔ انھوں نے اردو مرثیہ نگاری کو جو رنگ و آہنگ بخشا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ واقعۂ کربلا کو انھوں نے جس طرح چشمِ تصور سے دیکھا اور دلِ دردمند کے ساتھ محسوس کیا، اس کا اعلیٰ ترین اظہار میر انیس کے مرثیوں میں موجود ہے۔

انیس شناسی کے متعدد گوشے مختلف ناقدین اور محققین کی کاوشوں سے اجاگر ہوئے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایک مدت تک روایات اور غیر محقق واقعات سے بھی کام لیا گیا ہے جس سے کئی امور میں غلط فہمیاں راہ پاگئی ہیں۔ انھی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میر انیس نے بہت کم شاگرد بنائے۔ تاہم تحقیق کے نئے باب برابر وا ہو رہے ہیں اور مختلف وسائل سے مستند معلومات کی فراہمی اور ان پر محاکے کا عمل جاری ہے۔

ڈاکٹر سید مقام حسین جعفری نے اس تاثر کو کہ میر انیس کے شاگردوں کی تعداد کم تھی، اپنی ایک عمدہ تحقیقی کاوش "شاگردانِ انیس" کے ذریعے رد کردیا ہے۔

ڈاکٹر سید مقام حسین جعفری تحقیق کے فن سے ایک فطری مناسبت رکھتے تھے۔ وہ جنوری ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے کیا، اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں اور ۱۹۳۶ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے بالترتیب عربی اور اردو میں ایم اے کیا۔ وہ ساری عمر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ نومبر ۱۹۳۶ء سے اپریل

۱۹۴۴ء تک گارڈن کالج راول پنڈی میں شعبۂ اردو اور عربی کے استاد رہے۔ جولائی ۱۹۴۴ء سے اگست ۱۹۵۹ء تک پاک فضائیہ میں افسرِ تعلیم رہے۔ کراچی گرامر اسکول میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۱ء تک اور سینٹ پیٹرکس کالج کراچی میں جولائی ۱۹۶۲ء سے ۳۱؍ مارچ ۱۹۷۳ء تک استاد شعبۂ اردو رہے۔

جعفری صاحب نے ۱۹۷۰ء میں کراچی یونی ورسٹی سے اردو میں "شہرِ آشوب" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان کی چند اہم تصانیف میں "آثارِ انیسؔ"، "تحقیقِ نوادر"، "گلزارِ نفیسؔ" اور "شاگردانِ انیسؔ" شامل ہیں۔ انھوں نے سلام نگاری پر بھی ایک تحقیقی کتاب تالیف کی ہے جو ہنوز تشنۂ طباعت و اشاعت ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کا ایک قول ہے کہ تحقیق دراصل چیونٹیوں کے منھ سے شکر چھین کر شیرہ بنانے کا فن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات متعلقہ موضوع پر اس قدر کم مواد ملتا ہے اور وہ بھی اتنا منتشر اور غیر مرتب ہوتا ہے کہ:

پایا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

کے مصداق دلِ لخت لخت کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی تحقیق میں صبر، تحمل، مسلسل کاوش اور پتّا مارنے کا عمل درکار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمقام حسین جعفری نے "شاگردانِ انیسؔ" اسی انداز سے مرتب کی ہے۔ بہت چھان بین کر کے اُن کے شاگردوں کے نام، حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف کی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ اُن کی اس کاوش کی داد اُسی وقت اہلِ نظر نے پیش کردی تھی۔ جب نومبر ۱۹۷۹ء میں پہلی بار "شاگردانِ انیسؔ" شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر جعفری کی اس کتاب کے بعد شاگردانِ انیسؔ کی تلاش و جستجو بھی اہلِ تحقیق کے لیے اہم موضوع بن چکا ہے۔ اس میں اضافہ بھی ممکن ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس عمارت کی خشتِ اوّل ڈاکٹر جعفری ہی نے رکھی ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے درست لکھا ہے کہ "ڈاکٹر جعفری نے چھیالیس (۴۶) شاگردانِ انیس کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام مہیا کر کے اردو میں ایک یادگار کتاب کا اضافہ کیا ہے۔" شاگردانِ انیس کا تجسس ڈاکٹر جعفری کا ایک بے مثل تحقیقی کام ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں ڈاکٹر جعفری نے متعدد دانشوروں، کتب خانوں اور ماخذ و مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ تاہم اُس وقت خوش قسمتی سے علی محمد صاحب عارف

کے خلف سیّد یوسف حسین زیدی بقیدِ حیات تھے اور ڈاکٹر جعفری نے بعض امور میں اُن سے استفسار کر کے کئی غلط روایتوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔

میر انیسؔ کے صد سالہ جشن کے موقع پر ڈاکٹر جعفری نے میر انیسؔ سے متعلق اپنے تحقیقی نوادر کو متعارف کرانے کا اہتمام کیا تھا۔ اس کتاب میں مرثیہ گوئی میں انیسؔ کے شاگردوں کے احوال کے ساتھ ساتھ اُن شاگردوں کی بھی تفصیلات آگئی ہیں جنھوں نے میر انیسؔ سے مرثیہ خوانی کی تربیت حاصل کی ہے۔ یہ گوشہ بھی بہت اہم ہے۔

''شاگردانِ انیسؔ'' جس نوعیت کی کتاب ہے اس کو عموماً مؤلف و مصنف ایک تذکرے کی شکل دے دیتے ہیں، اور بیانیہ انداز میں چند حقائق پیش کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی ایک مدت تک تحقیق اور تنقید کو الگ الگ شعبوں میں رکھا جاتا رہا ہے۔ تاہم جدید تنقید تحقیق کے بغیر اور تحقیق ایک تربیت یافتہ تنقیدی شعور کے بغیر ادھوری ہی رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر ضمیر حسین جعفری نے اردو مرثیے کی ابتدا اور مرثیے کے تعمیری دور سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے اور ہر مرثیہ نگار کے فن اور اسلوب پر تنقید، تبصرہ اور تجزیہ بھی کیا ہے۔

راقم الحروف کو ڈاکٹر ضمیر حسین جعفری سے ذاتی ملاقاتوں کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ مرحوم ایک انتہائی مہذب، خلیق اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں رجائیت اور اَن تھک محنت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آخر وقت تک فعال اور چاق چوبند رہے۔ کئی کتابیں اپنی زندگی ہی میں شائع کیں اور کچھ مسودے ابھی تک منتظرِ طباعت ہیں۔

ڈاکٹر جعفری کے تحقیقی کام ''شاگردانِ انیسؔ'' کی مانگ ہر دور میں رہی ہے لیکن بوجوہ مدت تک اس کی اشاعتِ ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر ضمیر حسین جعفری کے فرزندِ ارجمند سیّد ابوالحسن جعفری نے اپنے قابلِ احترام والدِ مرحوم کی کتابوں کی از سرِ نو اشاعت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ اس سلسلے کا آغاز ''شاگردانِ انیسؔ'' کی نئی اشاعت سے ہو رہا ہے۔ آئندہ بھی طباعت و اشاعت کا یہ کام جاری رہے گا۔

پروفیسر سحر انصاری

سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

اس مقالے کے بارے میں چند معروضات

انیس مرحوم کے جشنِ صد سالہ کے موقعے پر ہند و پاکستان کے بہت سے اہلِ قلم اور دانشوروں نے انیس پر تنقیدی مضامین لکھے، مرثیے کی افادیت اور اس کے مختلف گوشوں پر پُر مغز اور سیر حاصل تبصرے کیے لیکن انیس مرحوم کے شاگردوں پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔

محترم افسر صاحب امروہوی کے مشورے پر میں نے انیس کے شاگردوں پر کام شروع کیا، اس ضمن میں بہت سے اربابِ سخن سے گفتگو بھی ہوئی اور خط و کتابت بھی، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

جنوری ۱۹۷۳ء میں میری کتاب "آثارِ انیس" میر ابراہیم ٹرسٹ کراچی سے شائع ہوئی تھی جس میں ایک مضمون "شاگردانِ انیس کا ایک جائزہ" بھی شامل تھا۔ مختلف رسالوں نے "آثارِ انیس" پر تنقیدیں لکھیں اور اس مضمون کو بہت سراہا اور یہ تجویز بھی پیش کی کہ "داستانِ دبیر" کے طرز پر انیس کے تلامذہ پر بھی ایک کتاب لکھی جائے۔

"آثارِ انیس" کی ایک کاپی میں نے مشہور محقق ڈاکٹر صفدر صاحب آہ کی خدمت میں بھیجی روانہ کی۔ صاحب موصوف نے مجھے متعدد خطوط لکھے جن میں شاگردانِ انیس کے بارے میں قیمتی مشورے بھی دیے اور "کتب نما" جامع دہلی میں اس مضمون پر تبصرہ بھی فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب اور دوسرے کرم فرماؤں کی ہمت افزائی سے میں نے اس موضوع پر یکسوئی سے کام شروع کردیا۔ خداوند تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ چھ سال کی مسلسل کوشش اور محنت کے بعد میں یہ مقالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اس سلسلے میں بہت سے دانشوروں نے میری مدد فرمائی، جن میں ڈاکٹر صفدر صاحب آہ کے علاوہ ڈاکٹر سید نیر مسعود صاحب (لکھنؤ)، محمد رشید صاحب (لکھنؤ)، افسر صاحب امروہوی (محقق انجمن ترقیِ اردو، کراچی)، ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب (ترقیِ اردو بورڈ، کراچی) ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب زیدی، کسریٰ منہاس صاحب (لاہور) اور علی ضامن خاں صاحب (جون پور) کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات کا میں ممنون ہوں۔

آخر میں سید افتخار حسین صاحب رضوی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جو کاتب، اور راقم الحروف کے درمیان ایک وسیلہ بنے رہے، ان کی مستعدی اور انہماک کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

تمقام حسین جعفری

۱۹۷۶ء

حرفِ آغاز

"میر انیس نے اپنی مدت العمر میں دو باتوں کی طرف بہت کم توجہ دی ایک تو کثرت سے شاگرد بنانے میں اور دوم فرمائشوں پر سلام کہنے میں... میر مونس کی سفارش اور دوسرے بااثر لوگوں کے اصرار سے کچھ لوگوں کو شاگرد بنالیا تھا۔"[☆۱]

اس ضمن میں عہدِ حاضر کے محققین کے بیانات بھی ملاحظہ فرمایئے:

"میر انیس صاحب بڑے مرثیہ گو تھے لیکن انھوں نے یہ فن صرف اپنے بھائیوں اور بیٹے کو سکھایا۔ سید محمد ہادی صاحب لائق اور سید محمد عباس ایم اے نے جو اس وقت میر انیس کے ورثا ہیں، راقم الحروف[☆۲] سے بہ اصرار و تاکید یہ ارشاد فرمایا کہ میر انیس صاحب کا کوئی شاگرد نہیں تھا اور اُن کے بھائیوں یا بیٹوں کے علاوہ جو شخص مرحوم کی شاگردی کا دعویٰ کرے وہ غلط گو ہے۔"[☆۳]

مندرجۂ بالا بیان کو صداقت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

☆۱۔ شاد عظیم آبادی مرحوم، حیاتِ انیس، طبع اول، مرتبین سید نقی احمد ارشاد کاظمی، ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی، مطبع اردو ڈائجسٹ پرنٹرز۔ لاہور، ناشر بارگاہِ ادب۔ لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۹۵

☆۲۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر

☆۳۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستانِ دبیر، بار اول، مطبوعہ صفدر پریس لکھنؤ، ناشر نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۶

میر انیس کے شاگردوں کی تعداد کم ہے جس میں اُن کے خاندان کے علاوہ ایسے افراد بھی شامل ہیں جن کا تعلق نہ خاندانِ انیس سے تھا اور نہ لکھنؤ سے۔

"انیس سے خوانندگی اور مرثیہ گوئی[☆۱] سیکھنے والوں میں میرے علم میں صرف چار شاگرد ایسے ہیں جن کے مطبوعہ مراثی اس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان چار میں خود تین خاندانِ انیس کے افراد ہیں یعنی اُنس (برادرِ انیس)، مونس (برادرِ انیس) اور نفیس (فرزندِ انیس) چوتھے شاگرد فارغ ہیں جو خاندانِ انیس سے تو نہیں لیکن ہر اعتبار سے فخرِ دبستانِ انیس ہیں۔"

سیّد یوسف حسین صاحب زیدی (خلفِ علی محمد صاحب عارف مرحوم) ناقل ہیں کہ:

> خود انیس نے مرثیہ خوانی کی تعلیم اپنے والد میر خلیق سے پائی اور اُنھوں نے اپنے اہلِ خاندان کو اور دوسرے شاگردوں کو اس کی تعلیم دی۔

"جب تک میر خلیق زندہ رہے اُس وقت تک یقیناً دونوں بیٹوں کا کلام اُن کی نگاہ سے گزرتا رہا اور دونوں مساوی حیثیت سے میر خلیق کے شاگرد رہے۔ بچپن سے لے کر ۳۸ سال کی عمر تک باپ سے اصلاح لینے کے بعد یقیناً اتنی مشق بہم پہنچ چکی تھی کہ میر اُنس[☆۲] کو کسی استاد کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ فیض آباد میں اپنے والد کی حیات میں یہ دونوں بھائی ساتھ رہے ہوں تو رہے ہوں لیکن لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد یہ دونوں یک جا نہیں رہے۔

میر مہدی حسن احسن نے "واقعاتِ انیس" میں اپنی یہ تحقیق لکھی ہے کہ میر خلیق نے امجد علی شاہ کے زمانۂ حکومت میں لکھنؤ میں مستقل رہائش اختیار کی۔ امجد علی شاہ کا زمانۂ حکومت ۱۲۵۸ھ لغایت ۱۲۶۳ھ ہے اگر میر خلیق کا لکھنؤ آنا ۱۲۵۸ھ ہی میں فرض

☆۱۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، انیس کے ایک مایۂ ناز شاگرد فارغ، "افکار" شمارہ نمبر ۱۹، کراچی، ص ۱۸

☆۲۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے میر اُنس کو میر خلیق کا شاگرد لکھا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے اُن کو میر انیس کا شاگرد لکھا ہے، یہ درست نہیں ہے جس کی وضاحت ہم آئندہ سطور میں کریں گے۔

کرلیا جائے تو وہ بھی لکھنؤ آنے کے بعد دو سال کے اندر وفات پاگئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میر خلیقؔ کی عمر کے آخری دو سال چھوڑ کر ان کی ساری عمر فیض آباد میں بسر ہوئی۔

میر انیسؔ کی عمر ۴۲ سال تھی جب انھوں نے اپنے والد اور اہل و عیال کے ساتھ آکر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ میر اُنسؔ اس وقت بھی لکھنؤ نہیں آئے بلکہ فیض آباد میں قیام پذیر رہے اور جب بعد میں لکھنؤ کی سکونت اختیار کی جب بھی میر انیسؔ کے ساتھ نہیں رہے بلکہ باورچی ٹولہ میں ایک مکان لے کر اس میں رہے۔ افسوس ہے کہ میر اُنسؔ کے حالاتِ زندگی تفصیلاً کسی اجمال کے ساتھ نہیں ملتے جن سے نتائج برآمد کیے جاسکیں لیکن ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں میں کافی بُعد اور دوری رہی، ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ میر اُنسؔ کی میر انیسؔ کے یہاں بہت کم آمد و رفت تھی۔

تیسری بات یہ ہے کہ میر اُنسؔ کے کلام میں کہیں اس کا اظہار نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے میر انیسؔ سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ اس سے بھی ہمارے خیال کو تقویت پہنچتی ہے...

میر اُنسؔ اور اُن کے اَخلاف میں کسی کی قبر مقبرۂ انیسؔ میں نہیں ہے بلکہ سب کی قبور کہیں اور ہیں۔"☆۱

مرثیے کا مفہوم اور اُس کے اصول

"دستور قدیم ہے کہ کسی عزیز و قریب یا دوست خواہ امیر و رئیس کی وفات کا واقعہ اور حزن و ملال کا حال مرثیے میں لکھتے ہیں اور یہ وضع صرف اہلِ فارس کی نہیں ہے بلکہ عرب میں بھی یہ دستور قدیم سے جاری ہے اور اب اکثر مرثیہ وہی ہے جس میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت کا حال اور واقعۂ کربلا لکھا جاتا ہے اور مسدس یا مثمن، ترجیع بند خواہ ترکیب بند کی شکل میں ہوتا ہے۔"☆۲

☆۱۔ راقم الحروف کے اصرار پر سید یوسف حسین صاحب زیدی نے مندرجۂ بالا سطور تحریر فرمائیں تاکہ اس غلط فہمی کا ازالہ کیا جاسکے کہ اُنسؔ نے میر انیسؔ سے اصلاح لی۔ یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ میر خلیقؔ کا انتقال اسّی سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ میں ہوا، اُس وقت میر انیسؔ کی عمر ۴۲ سال اور میر اُنسؔ کی اڑتیس سال تھی۔

☆۲۔ محمد نجم الغنی نجمی، بحر الفصاحت، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۶ء، ص ۱۲۰

مرثیہ گوئی کے لیے چند اصول وضع کیے گئے ہیں تاکہ مرثیے کے مفہوم کی وضاحت ہوسکے۔ان میں مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں:

۱۔ ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اُس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اُس پائے کا شخص اُٹھ گیا۔

۲۔ اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے، اُس کا ذکر کیا جائے۔

۳۔ اس کو مخاطب کرکے ایسے خیالات ظاہر کیے جائیں جن سے یہ بات ثابت ہو کہ منتہائے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ لکھنے والے کو اُس کے مرنے کی بھی خبر نہیں اور وہ اب تک اُس کو اُسی طرح مخاطب کرکے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا تھا۔☆۱

مرثیے کا آغاز

اردو مرثیے کے آغاز کا سہرا جنوبی ہندوستان کے سر ہے۔ اس ضمن میں ایک مشہور نقاد کا نظریہ ہے کہ "گیارھویں صدی ہجری کے آخری دو چار برسوں (یعنی ۱۶۸۵ء سے ۱۶۸۷ء تک) میں دکن ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوا جس نے اس سرزمین کی تہذیب و شائستگی اور علم و فضل کی بنیادیں ہلا دیں... سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی شکست اور قید کے بعد اُن شہروں کی وہ مرکزیت ختم ہوگئی جو علم و فضل اور شعر و سخن کا گہوارہ ثابت ہوئی تھی... اور چوں کہ فاتحِ دکن شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر غازی اور اُن کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے وہ اپنے جذبات و خیالات کو صاف صاف ظاہر نہیں کرسکتے تھے، اس لیے مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنالیا اور اپنے غم زدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکالی۔"☆۲

مندرجۂ بالا بیان صداقت پر مبنی نہیں ہے کیوں کہ دکن میں اردو شاعری کا آغاز ہی مرثیے کا پیش خیمہ بھی تھا۔ دکنی ادب کی تاریخوں کی ورق گردانی سے اس امر کا ثبوت

☆۱۔ شبلی نعمانی، مولانا، شعر العجم، جلد اول، ناشر ملک نذیر احمد، اردو بازار۔ لاہور، ص ۶۴

☆۲۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، دکنی ادب کی تاریخ، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس۔ کراچی، ناشر اردو اکیڈمی سندھ، جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۰ تا ۱۰۲

ملتا ہے کہ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں فرماں روایانِ سلطنت کی سرپرستی میں مرثیے کو عروج ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی مرثیے کو اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

دکنی دور کے شعرا

حسبِ ذیل مشہور مرثیہ گو خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

بہمنی عہد میں ۱۵۰۳ء میں اشرفؔ نے مثنوی ''نوسرہار'' لکھی جو ابھی تک غیر مطبوعہ [☆۱] ہے۔

عادل شاہی دور

بیجاپور کے شعرا ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک

میاں خاں ہاشمیؔ، شاہ برہان الدین جانمؔ، ملک خوشنود علی عادل شاہ شاہیؔ، [☆۲] شاہ ندیم اللہ حسینیؔ، حسن شوقیؔ، کمال خاں رستمیؔ، مرزا سید میران ہاشمیؔ، سیوا، قادر لنگا، شاہ عبدالرحمٰن قادری، شاہ حسین ذوقیؔ۔

قطب شاہی دور

گولکنڈہ کے شعرا ۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک

محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ملا وجہیؔ، ملا احمد غواصیؔ، رازی، قطبیؔ، افضلؔ، کاظمؔ، لطیفؔ، مرزا ابوالقاسم، شاہ قلی خاں شاہیؔ، شاہ راجو، عابد، پیرزادہ روحیؔ، شجاع الدین نوریؔ۔

برہان پور کے شعرا

محمد قائم قائمؔ، میر مہدی متینؔ، ہاشم علی، یتیم احمد

☆۱۔ انجمن ترقی اردو، کراچی اسے عنقریب شائع کرنے والی ہے۔

☆۲۔ ملک خوشنود گولکنڈہ کا رہنے والا تھا مگر خدیجہ سلطان شہر بانو کے جہیز میں بیجاپور روانہ کردیا گیا تھا۔ اس لیے اُس کا شمار بیجاپوری شعرا میں ہوتا ہے۔

دکن کے دوسرے مشہور شعرا

احسانؔ، تقیؔ، داسؔ، رضا علی رضاؔ، سریؔ، نوازش علی شیداؔ، صادقؔ، محمد علی عاجزؔ، عشقیؔ، غلام حیدر/ غلام مرتضیٰ غلامیؔ، میر عبدالقادر نادرؔ، مریدیؔ، نظامیؔ، سید محمد علی نظرؔ (اورنگ آبادی)، سید ولی محمد (اورنگ آبادی)، میر ولی فیاض ولیؔ (ویلوری)۔

عمومی تبصرہ

تقریباً دو سو سال تک شعرا نے مرثیے لکھے۔ اس مدت میں مرثیے نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔

موضوع

موضوع میں تنوع پیدا ہوا۔ اجزائے ترکیبی میں واقعہ نگاری، رخصت، رجز، جنگ اور شہادت کا اضافہ ہوا۔

ہیئت

ابتدائی دور میں مرثیے، غزل اور قصیدے کے طرز پر لکھے گئے بعدازاں مثلث، مربع اور مخمس کا رواج ہوا۔

زبان

زبان نے بھی بتدریج ترقی کے مراحل طے کیے، ہندوی دکنی، زبان کو ریختہ کہا گیا۔ مرثیے کی دکنی روایات بھی قائم ہوگئیں اور اسے ادبی اہمیت بھی حاصل ہوگئی۔

یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ دکنی شعرا کے چند مرثیے شائع ہوئے ہیں زیادہ تر بیاضوں میں محفوظ ہیں۔

شمالی ہند

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی مرثیہ گوئی کی بھی ابتدا ہوئی۔

محمد شاہی☆[1] دور میں مصطفیٰ خاں یکرنگؔ، شاہ حاتمؔ، شاہ مبارک آبروؔ، خواجہ برہان الدین عاصیؔ، امامیؔ، میر محمد بیدارؔ اور علی نقی قدیمؔ قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے بعد سکندرؔ، گداؔ، مسکینؔ، حزیںؔ، غمگینؔ، حزوںؔ، محبؔ، احسانؔ اور افسردہؔ نے مستقل طور پر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ سکندرؔ نے اردو کے علاوہ پنجابی، پوربی اور مارواڑی زبانوں میں بھی مرثیے کہے۔

ہیئت

مرثیہ اس عہد میں تجرباتی دور سے گزر رہا تھا، ہیئت کے لحاظ سے بھی اور موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی۔

شروع میں مرثیے دو مصراعی ہوتے تھے اور ان میں غزل کی طرح ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی تھی۔ بعد میں چومصراعی ہونے لگے۔

اس ضمن میں سوداؔ کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ دکنی مرثیہ گوشعرا کی طرح اُنھوں نے ابتدا میں جو مرثیے لکھے، ان میں چار مصرعے ہوتے۔

"مرثیہ☆[2] اس کا کہ ہر استاد نے اس پر رشک کھایا مگر ایک بند بھی اس کے برابر نہ ہوا، وہ مرثیہ یہ ہے:

یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے　　انصاف سے جواب دو حیدرؓ کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی تھی پیمبرؐ کے واسطے　　یا ظالموں کی برّشِ خنجر کے واسطے

اب تک مرثیے کی ہیئت مربع/مخمس ہوا کرتی تھی، "ہیت لگانے کا شرفِ اوّلیت میاں سکندرؔ کو حاصل ہے یا مرزا سوداؔ کو، اس کا فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ مسدس☆[3] کی طرز کا مرثیہ جو لکھنؤ اور نواح میں بے حد مشہور ہوا، وہ سوداؔ کا نہیں

☆۱۔ ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۹ء

☆۲۔ ناصر سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، حصہ اوّل، طبع اوّل، مطبع ظفر سنز پرنٹرز۔ لاہور (مرتبہ مشفق خواجہ)، ناشر مجلسِ ترقیِ ادب۔ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۹

☆۳۔ قاصدِ صغرا کے حال کا لکھا ہوا مرثیہ بہت مقبول ہوا جس کا مطلع ہے:
"ہے روایت شترِ اسوار کسی کا تھا رسول"

بلکہ میاں سکندر پنجابی کا ہے۔"[☆۱]

ان کے ہم عصر مسکینؔ کی بابت مشہور ہے کہ انھوں نے کئی سو مرثیے کہے اور مربع میں فارسی کی بیت لگا کر مسدس کی طرف قدم اٹھایا۔

تھا مصلّیٰ بچھایا جس جا پر　　کہا اس وقت ہے یہ میرا گھر
نقش سجدے کے کر لیوں اس پر　　پھر کہاں گھر، کہاں یہ تدبیرات

"ہرکہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت"

سوداؔ نے بھی مرثیہ گوئی کے لیے مسدس کا انتخاب کیا۔ انھوں نے ہندوستانی رسم و رواج کو مرثیوں میں نظم کیا اور ان میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے مرثیوں میں سماجی رنگ کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور واقعہ نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ تعداد بند چالیس اور پچاس تک پہنچ گئی تھی۔

ان کے ہم عصر میر تقی میرؔ نے اپنے مرثیوں میں کربلا کے دردانگیز اور بلاخیز مناظر کا بیان کیا ہے۔ وفاداری، ایثار، کردار کی رفعت اور اخلاقی اقدار کی طرف اشارے کیے ہیں۔

سوداؔ اور میرؔ نے مرثیے کی ادبی اہمیت پر زور دیا اور اس صنف کو ترقی دی۔ دوسرے شعرا نے ان کی تقلید کی۔ مہربان خاں مہربانؔ، امیر حسنؔ، مصحفیؔ اور جرأتؔ نے مرثیوں کی روایت کو سراہا۔ جرأتؔ نے غزل اور مثنوی کے علاوہ مرثیے اور سلام بھی کہے لیکن عہدِ حاضر کے ایک محقق رقم طراز ہیں کہ:

"یہ مراثی و سلام اُس زمانے میں لکھے گئے ہیں جب اردو شاعری میں اس فن کی کوئی عظیم اور مستقل روایت قائم نہیں ہوئی تھی۔"[☆۲]

جب سلطنت مغلیہ پر ادبار کے بادل چھانے لگے اور زوال کے آثار نمایاں

☆۱۔ تاجور نجیب آبادی (مقدمہ)، پیامِ زندگی، جلد اوّل، بار اوّل، پبلشرز عطر چند کپور اینڈ سنز۔ لاہور، ناشر اردو مرکز۔ لاہور، ص ۴۹۔۵۰

☆۲۔ جرأت، شیخ قلندر بخش، مراثی جرأت، بار اوّل، مطبع اشرف پریس۔ لاہور (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی)، ناشرین اردو دنیا۔ لاہور و کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۔۱۶

ہونے لگے تو اس زمانے میں تہذیب وادب کے شیدائیوں نے دلّی کو خیرباد کہا اور جدھر سینگ سمایا چلے گئے۔

میر تقی میرؔ، مصحفیؔ اور کچھ شعرا لکھنؤ آ گئے۔ غلام حسین ضاحکؔ نے فیض آباد کا رخ کیا جو اودھ کے تاج دار کا دارالحکومت تھا۔ اُنھوں نے مرثیے لکھے اور اُن کے خلف میر حسن نے بھی۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے میر حسن کے تین مرثیوں کی نشان دہی فرمائی، دو مربع ہیں اور ایک مسدس[☆۱] ہے۔

مرثیے کا تعمیری دور

۱۷۷۵ء میں نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالخلافہ بنایا اور اس کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ یہ عہد مرثیے کی ترقی کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ مرثیے نے ارتقائی منزلیں طے کیں اور اس کے لیے ایک ڈھانچہ تیار ہوگیا۔

اردو مرثیے کا یہ تعمیری دور کہا جاتا ہے۔

میر خلیقؔ، مرزا فصیحؔ، ضمیرؔ اور میاں دلگیرؔ نے مرثیے کے تعمیری دور میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان حضرات نے مرثیے کے موضوع کو تنوع بخشا، رزمیہ اشعار لکھے، معرکۂ کارزار کی مرقع کشی کی، اس طرح اردو زبان بہت سی اصطلاحاتِ جنگ سے رُوشناس ہوگئی۔

مناظرِ قدرت اور جذبات نگاری کے نمونے بھی اُن کے مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔

اردو زبان کے بہت سے نقادوں نے ضمیرؔ کو موجودہ طرزِ مرثیہ نگاری کا موجد تسلیم کیا ہے اور اُن کا حسبِ ذیل بند بطورِ سند پیش کرتے ہیں۔

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکلِ نبی کے — تھے بارہ سو اُنچاس وہ سالِ نبوی[☆۲] کے

☆۱۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم، رسالہ "آج کل" دلی، ۱۹۶۵ء

☆۲۔ ایک نسخے میں مصرع اس طرح درج ہے:

"سنہ بارہ سو اُنچاس تھے ہجری نبوی کے"

اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے آگے کبھی دیکھے☆ نہ تھے یہ طرز کسی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا
جو جو کہے اِس طرز میں شاگرد ہے میرا

چوتھے مصرعے میں 'طرزِ نوی' قابلِ غور ہے۔

اس مرثیے کا آغاز سراپا سے ہوتا ہے۔

بند نمبر ۱

جس نور سے پُرنور یہ نورِ نظری ہے کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے
یہ کون سی تصویرِ تجلّی سے بھری ہے آمد ہی میں حیران قیاسِ بشری ہے
گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے
منبر مرا ہم مرتبۂ طور ہوا ہے

ضمیرؔ نے چونتیس بند میں حضرت علی اکبرؑ کا سراپا نظم کیا ہے۔ رخصت کے چند بند ہیں۔ آمد رجز، جنگِ شہادت کے اجزا بھی ہیں، ان کے معاصرین خلیقؔ، فصیحؔ اور دلگیرؔ کے ان مرثیوں میں بھی سراپا موجود ہے جو ۱۲۴۹ ہجری سے پہلے نظم کیے گئے تھے۔

مثنوی مظہرالعجائب میں ضمیرؔ نے اپنی مرثیہ گوئی کی بابت یوں نظم فرمایا تھا:

ہے ولے صد ہزار شکرِ خدا کہ مری طرز ہے سبھوں سے جدا
طرز یہ مرثیہ کی ٹھہرائی کہ سراپا ہو اور صف آرائی
پایا میرے کلام نے یہ رواج کہ نہیں ہے بیان کا محتاج

مندرجہ بالا اشعار اس امر کا ثبوت ہیں کہ ضمیرؔ 'سراپا' اور 'صف آرائی' کو مرثیے کی نمایاں خصوصیات تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے طرزِ نوی سے مراد سراپا کا تفصیلی بیان ہے اور یہی قرینِ قیاس بھی ہے۔

کسی فن پارے کی کامیابی کا معیار اس کے موضوع اور اجزائے ترکیبی یا اس کی

☆ ایک نسخے میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے:
"آگے تو یہ انداز نہ تھے کسی کے"

ساخت میں مضمر ہوتا ہے۔

مرثیے کا موضوع

مرثیہ ایک بیانیہ نظم ہے۔ کربلا کے خوں چکاں واقعات کے تصور سے دل میں جو جذبات موجزن ہوں، نظم میں اُن کی ترجمانی مرثیے کا موضوع ہے۔ مرثیہ نگار مؤرخ نہیں ہوتا لیکن واقعاتِ کربلا بیان کرنے کے لیے اسے پُر تاثیر فضا پیدا کردینی چاہیے تاکہ سامعین اور قارئین کے جذبات کو برانگیختہ کیا جاسکے۔ مرثیے کو ٹریجڈی (المیہ) نہیں کہا جاسکتا اور نہ ایپک (رزمیہ) لیکن اس میں ایک حد تک دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ مرثیے کے موضوع کو وسعت دی جائے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جائے تاکہ مرثیے میں مزید تنوع پیدا ہوسکے، جذبات کی تنظیم اور اخلاق کی بلندی کو سراہا گیا۔

خصوصیات

مرثیے میں اصنافِ سخن کی اعلیٰ شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ غزل کی ایمائیت، لوچ دار زبان، مثنوی کا تسلسل اور اس کی شان، قصیدے کا طمطراق اور اس کی آن بان، اسی لیے اردو ادب میں مرثیے کو ایک مثالی حیثیت حاصل ہوئی۔

ساخت کے لحاظ سے مرثیہ ایک قسم کی اکائی ہے جس میں ابتدا، ارتقا اور عروج پایا جاتا ہے۔

اجزائے ترکیبی

مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسبِ ذیل تسلیم کیے گئے ہیں:

(۱) چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶) جنگ (۷) شہادت اور (۸) بَین۔

(۱) چہرہ یعنی مرثیے کی تمہید

تمہید دلچسپ ہونی چاہیے تاکہ سامعین اور قارئین کی توجہ جلد مبذول ہوجائے۔

شاعر منظر نگاری سے مرثیے کی ابتدا کرتا ہے، بعض اوقات وہ تعلّی سے کام لیتا ہے یا ممدوح کی مدح سرائی کرتا ہے یا کسی تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے، مرثیے کے موضوع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرثیہ نگار کو چہرہ پرکشش انداز میں پیش کرنا چاہیے۔

(۲) سراپا

ہیرو کے سراپا کی مرقع کشی نہایت مشکل مرحلہ ہے، حسن و جمال کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیات اور سیرت کا تجزیہ بھی ضروری ہے، اس کے ذاتی محاسن کا بھی تذکرہ ہوتا کہ اس کی قربانی، وفاداری، ہمت اور جرأت کی خصوصیات بھی نمایاں ہوجائیں، شاعر کو تشبیہات اور استعارات کا سہارا لینا چاہیے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار ہوسکے۔

دشمن کا سراپا بیان کرتے وقت مدح و ذم کی آمیزش سے کامیاب مصوری کی جاسکتی ہے۔

(۳) رخصت

رخصت کا منظر بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اگر اسے تفصیل سے اور پرتاثیر الفاظ میں بیان کیا جائے تو سامعین اور قارئین کے جذباتِ غم و الم کو برانگیختہ کیا جاسکتا ہے۔

رخصت کا سماں نہایت روح فرسا ہے لیکن اگر شہادت کی سعادت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

(۴) آمد

سپاہِ حسینی کا ہر مجاہد نہایت آن بان سے میدانِ کارزار میں وارد ہوتا ہے، اسے اس بات کا یقین ہے کہ وہ حق پر ہے، مرضیِ معبود پر عمل پیرا ہے اور دینِ اسلام کی بقا کی خاطر وہ جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔

(۵) رجز

عرب کے قدیم دستور کی طرف اشارہ ہے، عربوں کو اپنے حسب و نسب پر

بہت ناز تھا، جب مخالف پہلوان ایک دوسرے کے مدِمقابل ہوتے تو اپنے اپنے اسلاف کے کارنامے فخریہ انداز میں بیان کرتے، اس کے بعد معرکہ آرا ہوتے اور اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتے۔

افرادِ مرثیہ کا تعلق ملکِ عرب سے تھا، اس لیے رجز بھی مرثیے کا ایک اہم جزو بن گیا۔

(۶) جنگ

بعض دکنی مرثیہ نگار شعرا کے کلام میں رزم کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں، مرثیے کے تعمیری دور میں رزم کو مرثیے میں شامل کیا گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ مجاہد کے لیے شمشیرِ آب دار اور رخشِ سبک رفتار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تلوار کی تعریف دراصل تلوار چلانے والے کی تعریف ہوتی ہے، تخیل کی گل کاریوں کے لیے یہ میدان نہایت وسیع ہے، رزمیہ شاعری کی مرقع کشی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مرثیہ نگار اسلحہ جنگ سے بھی بخوبی واقف ہوتا کہ میدانِ کارزار کے مختلف مناظر کی کامیاب عکاسی کرسکے۔

(۷) شہادت

''شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن'' اس لیے شہادت کا بیان مرثیے کا اہم جزو تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرثیے میں عموماً کربلا کے کسی مجاہد کی شہادت کا تذکرہ ہوتا ہے، موّدت کے جذبے سے سرشار ہوکر وہ موت کو خوش آمدید کہتا ہے۔

(۸) بَین

اردو مرثیہ گوئی کا آغاز دکن سے ہوا۔ اُس زمانے میں مرثیے کا مقصد واقعاتِ کربلا سن کر آہ وزاری اور گریہ کرنا تھا، آہستہ آہستہ مرثیہ کے قوام میں دوسرے اجزا بھی شامل کرلیے گئے لیکن بَین کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اگر مرثیے میں رثائیت نہ ہوتو وہ مسدس کہا جائے گا۔

جب تک طبیعت میں گداز اور دل درد مند نہ ہو، اس وقت تک مرثیہ گو اس

فرض سے بخوبی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بین لکھنا بھی مشکل ہے اور پڑھنا بھی "کارے دارد۔"

کون ہے جو کربلا کے خونیں واقعات کو سن کر اشک بار نہ ہو لیکن مرثیے پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا کیوں کہ مرثیہ نگار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ حسینی مجاہدین کی اخلاقی قدروں کو اجاگر کرے تاکہ سامعین اور قارئین اُن کے اخلاقِ حسنہ سے درس لے سکیں اُن کے نقشِ قدم پر چلیں اور اپنی زندگی اور معاشرے کو سنوارنے کی کوشش کریں۔

مرثیے کے تعمیری دور میں اس کا ایک ڈھانچہ تیار ہوگیا تھا لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مرثیے میں تمام اجزائے ترکیبی پائے جائیں، مثلاً وہ مرثیے جن میں فرزندِ پیغمبرؐ کی مدینے سے روانگی کا بیان ہے یا کربلا میں اُن کے ورود کا تذکرہ ہے، جو مرثیے شہادتِ امام حسینؑ کے بعد کے حالات پر مشتمل ہیں اُن میں اہلِ بیت علیہم السلام کی اسیری کا بیان ہے یا دربارِ یزید میں ورودِ اہلِ بیت، شام کے زنداں میں بی بی سکینہ کا انتقال، اہلِ بیت علیہم السلام کی قید سے رہائی، اُن کا کربلائے معلّٰی میں داخلہ اور لاشہ ہائے شہدا کو دفن کرنے کے بعد اُن کی مدینۂ منورہ واپسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

مرثیے کے تعمیری دور میں خلیقؔ، ضمیرؔ، دلگیرؔ اور مرزا فصیحؔ کی مساعی خوش آئند مستقبل کی ضمانت ثابت ہوئیں۔ ان باکمالوں کے بعد میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیے کے میدان کو مزید وسعت بخشی، موضوع میں تنوع پیدا کیا، رزمیہ شاعری کو فروغ دیا، جنگ کے مناظر نہایت خوبی سے بیان کیے اور اعجاز کی سرحدوں تک ان کی رسائی ہوگئی۔ مرثیے میں کردار نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے، زبان کو مالا مال کیا، حسنِ بیان پر حسنِ فصاحت نثار ہونے لگا۔ غرض ان دونوں فن کاروں نے عروسِ سخن کو خوب سنوارا اور مرثیہ اس دور کی عظیم الشان صنفِ سخن تسلیم کیا گیا۔

مرثیے کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کے بعد شاگردانِ انیسؔ مرحوم زیرِ بحث آئیں گے۔

ا۔ جلیسؔ

"سید محمد حیدر میر علی محمد عارفؔ کے والد بھی انیسؔ کے شاگرد تھے، اُن کی

وفات کے بعد تخلص میر ابو محمد صاحب عرف ابو صاحب کے فرزند میر سلیسؔ نے اختیار کیا۔"☆۱

۲۔ خلدؔ

"سید حیدر حسین صاحب خلدؔ حضرت انیسؔ و نفیسؔ کے شاگرد تھے۔ مرثیے بھی بے مثل پڑھتے تھے لیکن لکھنؤ میں شاید کبھی نہیں پڑھے۔"☆۲

۳۔ رفیقؔ

"مرزا علی حسین رفیقؔ ابن میرزا علی نقی رام پوری، مرد ذہین و ذکی مرثیہ و سلام میں میر ببر علی انیسؔ سے مشورہ ہے، مرثیہ خوانی کا رنگ اُنھیں سے سیکھا ہے اور اقسامِ شعر میں ابتداءً مولوی محمد بخش شہیدؔ شاگرد شیخ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد تھے، اب شیخ امداد علی بحرؔ سے تلمذ ہے۔"☆۳

بچاسی یا چھیاسی سال زندہ رہے، ۱۹۲۹ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

"انتخاب یادگار" میں حسبِ ذیل دو شعر نقل کیے گئے ہیں۔

کیوں کر نہ ان کا مصحفِ رخسار چومتے
آداب تھا ضرور کلامِ مجید کا

اپنی قسمت میں ہے جو تنہائی
نیند بھی رات بھر نہیں آتی

۴۔ رئیسؔ میر احسان علی کے ایک مرثیے کا اجمالی خاکہ

میر انیسؔ مرحوم کے ایک نواسے☆۴ میر احسان علی تھے جو رئیسؔ تخلص کرتے تھے۔ یہ نہایت خوش اخلاق اور خوش گو واقع ہوئے تھے۔ نواب مرزا امجد علی خاں بہادر

☆۱۔ میر علی احمد، نبیرۂ علی محمد عارفؔ مرحوم، بحوالہ ڈاکٹر نیر مسعود، گرامی نامہ موزخہ ۲۳؍ اکتوبر ۸۷ء

☆۲۔ شدید سید سجاد حسین (مقدمہ) ریاضِ شدید، جلد سوم، طبع اوّل، مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ناشر، صادق حسین شہیدؔ ۱۹۶۷ء، ص ۶

☆۳۔ منشی امیر احمد، انتخابِ یادگار، تاج المطابع، ۳ ذی الحجہ ۱۲۹۷ ہجری (مطابق ۱۸۸۰ء)، ص ۱۵۸

☆۴۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی (ڈی پی آئی، پنجاب) کی تحقیق کے مطابق رئیسؔ میر انیسؔ کی صاحب زادی کی صاحب زادی کے فرزند تھے یعنی پر نواسے۔ پر نواسے کو بھی نواسہ کہہ سکتے ہیں۔ "مرثیہ بعد انیس، بار اوّل، مطبوعہ پنجاب، آرٹ پریس، لاہور، ناشر سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۰۵

رئیسؔ شیش محل لکھنؤ کے داروغہ کی خدمت اُن کے سپرد تھی، وہ ''ابتدا میں تو میر انیسؔ سے اصلاح لیتے رہے، میر صاحب کے انتقال کے بعد اپنے ماموں میر نفیسؔ سے مشورۂ سخن فرماتے۔''[☆1]

اوّل تو خاندان اور ماحول کے اثرات پھر مناسب اور موزوں طبیعت، نتیجہ یہ ہوا کہ ذوقِ سخن خوب پروان چڑھا۔ اگرچہ ملازمت کی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر عام مشاعروں اور مجلسوں میں شرکت سے وہ معذور تھے مگر شیش محل کی مجالس میں اپنا نوتصنیف مرثیہ پڑھتے تھے اور اربابِ ذوق سے خوب دادِ سخن حاصل کرتے تھے۔

افسوس کہ اس ہونہار مرثیہ گو کی زندگی نے وفا نہ کی اور جوانی ہی میں وہ راہیِ ملکِ بقا ہوگئے۔

رئیسؔ مرحوم کے ایک مرثیہ کا مطلع ہے:

کھولا جو مہر نے علمِ زرنگار کو

اس مرثیے میں ۱۴۵ بند[☆2] ہیں، چند منتخب بند پیش کیے جا رہے ہیں جن سے شاعر کی صلاحیتوں کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

چہرہ

مرثیے کی تشبیب یا موضوع کا اصطلاحی نام ہے جس کے پیش کرنے میں شاعر تنوع سے کام لیتا ہے تاکہ سامعین، قارئین کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوسکے اور اُن میں شوق و انہماک پیدا ہوجائے۔

رئیسؔ نے مرثیے کے چہرے میں سحر کی منظرنگاری کے نہایت دل کش نمونے پیش کیے ہیں۔

بند ۱

کھولا جو مہر نے علمِ زرنگار کو　　　پُرنور کردیا فلکِ بے مدار کو

☆۱۔ عبدالرؤف عشرت، تذکرۂ آبِ بقا، بار اوّل، مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۲۸ء (مؤلف) (مرتبہ مرزا جعفر علی فصیح) ص ۱۲۳

☆۲۔ ایک نسخے میں ۱۰۳ بند ہیں۔

پایا جو خوش گوار نسیم بہار کو وجد آگیا ہر اک شجرِ سایہ دار کو
رونق دو چند ہوگئی دنیائے زشت کی
خوش بو ہوا سے آگئی باغِ بہشت کی

میر انیس کو صبح کے مناظر سے محبت تھی، انھوں نے متعدد مرثیوں میں سحر کی نمود اور اس کی مختلف کیفیات پر طبع آزمائی کی۔ رئیس نے بھی انیسیت کے اسی رجحان سے متاثر ہوکر مناظر کی کامیاب مرقع کشی کی ہے۔ طلوعِ سحر کے بیان میں یہ کہنا کہ نسیم بہار خوش گوار ہے اور وجد کے عالم میں شجرِ سایہ دار جھوم رہے ہیں، عمدہ تصویر کشی ہے۔

بند ۲

تڑکا وہ نور کا وہ بیاضِ سحر کا رنگ تھا زرد چرخِ نیلوفری پر قمر کا رنگ
کوسوں گلوں سے تھا شفقی دشت و در کا رنگ رہ رہ کے جھومتا تھا یہ تھا، ہر شجر کا رنگ☆
جھونکے ہوا کے چار طرف سرد سرد تھے
ذرّوں میں یہ چمک تھی کہ ہیرے بھی گرد تھے

پَو پھٹنے سے پہلے چاند کی روشنی مدھم پڑ گئی، اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ سرخ پھولوں کی کثرت کی وجہ سے دشت کا ماحول شفق آلود ہوگیا۔ اشجار پر وجدانی کیفیت طاری تھی، نسیم بہار میں خنکی تھی، آفتاب کے طلوع ہوتے ہی جب اُس کی روشنی زمین کے ذرّوں پر پڑی تو ان میں ایسی چمک دمک پیدا ہوگئی کہ ہیرے کی تابندگی بھی ان کے مقابلے میں ماند پڑ گئی۔

بند ۳

دلچسپ بلبلوں کے وہ نغمے دمِ سحر شاخوں پہ طائروں کا وہ پھرنا کشادہ پر
شاداب تھے جو برگ و گل و غنچہ و ثمر گویا دلہن بنی تھی ہر اک شاخِ بار ور
دیکھا جو رنگ سبزۂ دشتِ نبرد کا
مینا اتر گیا فلکِ لاجِ وردِ کا

☆ انیس مرحوم کا مصرع ملحوظِ خاطر رہے۔
"دم بہ دم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر"

ہندی اور سنسکرت شاعری میں کوئل اور پپیہے کا تذکرہ ملتا ہے۔ فارسی شاعری سے متاثر ہوکر اردو شاعری میں بھی بلبل و فاختہ اور قُمری کا رواج ہوا۔

اردو غزل میں طائروں کی صوتیات نظم کرنے کی ابتدا نظیر اکبر آبادی نے کی، جسے میر انیسؔ نے مرثیے میں کمال کو پہنچایا۔ رئیسؔ نے بھی اسے مرثیے میں خوب نبھایا۔ عنادل نغمہ سنج ہیں، مسرت کی وجہ سے غنچے چٹک رہے ہیں۔ کلیاں مسکرا رہی ہیں، سج دھج کے پیشِ نظر شاعر نے ہر شاخ کو دلہن سے تشبیہ دی ہے، زمین پر سبز اطلس کا فرش بچھا ہوا ہے جسے دیکھ کر آسمان کو بھی رشک آنے لگا۔

بیت بار بار پڑھیے اور اندازِ بیان سے لطف اٹھایئے۔

رئیسؔ کو جو منظر پسند ہوتا ہے، اسے وہ بار بار نئے انداز میں پیش کرتے ہیں اور ایک نیا لطف، نئی لذت اور جاذبیت پیدا کردیتے ہیں۔

بند ۴

وہ آب و تاب نہر کی اور خوش نما وہ بن — جس کے شجر تھے گلشنِ جنت پہ طعنہ زن
وہ سرخ سرخ بر میں ہر اک گل کے پیرہن — جن پر ہزار جاں سے فدا بلبلِ چمن
کیوں کر نہ اس زمیں کو یہ رتبے حصول ہوں
جس خاک پر بسے ہوئے زہرا کے پھول ہوں

نہرِ فرات کے پانی کی چمک دمک کا کیا کہنا، دشتِ نینوا کے اشجار گلشنِ جنت پر طعنہ زن تھے کہ مجھ سے بھلا تم کیا مقابلہ کروگے، اس ارضِ پاک کی خوش قسمتی، اور سعادت ہے کہ یہاں فاطمہ زہراؑ کے پھول بسے ہوئے ہیں۔

بند ۵

شب کا وہ اختتام سحر کی وہ ابتدا — وہ آسماں کا نور وہ صحرائے پُرفضا
وہ طائروں کا شور درختوں پہ جا بجا — پھولوں کی وہ مہک وہ خنک صبح کی ہوا
شبنم کے برگِ گل سے جو قطرے ٹپکتے تھے
شاداب ہو کے غنچہ و گل سب مہکتے تھے

جزئیات کے بغور مشاہدے سے شاعر کو منظر نگاری میں بڑی مدد ملتی ہے۔ سحر کے وقت آسمان پر نورانی کیفیت طاری ہوئی جس کی وجہ سے ماحول میں رعنائی پیدا ہوگئی۔ درختوں پر طیور نغمے بکھیر رہے ہیں، پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے جو قطرے نظر آتے ہیں، وہ غنچوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ان کے حسن کو نکھارتے ہیں اور فرحت و مسرت کی کیفیت پیدا کردیتے ہیں۔

بند ۶

خنکی وہ صبح کی وہ نہالوں کے لہلہے[☆۱] سبزہ وہ اور رنگ وہ پھولوں کے ڈہڈہے[☆۲]
مرغانِ خوش نوا کے وہ آپس میں چہچہے وقتِ سحر تدرو[☆۳] کے جنگل میں قہقہے
جھونکے نسیمِ صبح کے پیہم جو آتے تھے
خنداں تھے گُل تو غنچۂ تر مسکراتے تھے

مندرجہ بالا بند میں چاروں مصرعوں کے قوافی تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ صبح کے وقت ہوا میں خنکی ہوتی ہے، ارضِ نینوا پر سبز اطلس کا فرش بچھا ہوا ہے، اس خوش گوار ماحول میں پھول کھلے ہوئے ہیں، مختلف پرند اپنی اپنی بولیوں میں اپنی خوشیوں کا اظہار کر رہے ہیں، شاعر نے بیت میں اسے مدِ نظر رکھا کہ بہت سے پھول سحر کے وقت کھلتے ہیں۔ نسیمِ صبح کے جھونکوں کا یہ فیض ہے کہ غنچے چٹک رہے ہیں، کلیاں مسکرا رہی ہیں اور پھول کھل رہے ہیں۔

بند ۷

وہ نورِ نہر و دشت وہ تازہ گلوں کی بو وہ لالہ زار اور وہ سبزہ کنارِ جو
گلشن میں زمزمے وہ عنادل کے چارسُو وہ جاں فزا ترانۂ طوطیِ خوش گلو

☆۱۔ لہلہا (ہ) صفت تر و تازہ، شاداب اس کا اطلاق بیش تر سبز رنگ پر ہوتا ہے۔
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب کر رہے ہیں نظر کی دل داری (حسن)
☆۲۔ ڈہڈہا، صف سرسبز۔
☆۳۔ تدرو (ف) ایک قسم کا جنگلی پرندہ جو نہایت خوش رنگ، خوش رفتار اور خوب صورت ہوتا ہے۔

چہرے گلوں کے فرطِ مسرت سے لال تھے
کوکو سے قمریوں کی صنوبر نہال تھے

مندرجہ بالا بند میں رئیسؔ نے صبح کے منظر کو دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔عنادل، قمری، کوکو کے علاوہ طوطی کا اضافہ کردیا ہے۔ پانچویں مصرعے میں صنعتِ حسنِ تعلیل ہے اور چھٹے مصرعے میں صنعتِ ایہام۔ پھول سرخ ہیں، ان پر انبساط کی کیفیت طاری ہے، اس لیے کہ نواسۂ رسول ﷺ اور ان کے اعزہ و انصار وہاں قیام پذیر ہیں۔

چہرے کا آخری بند دیکھیے:

بند ۸

شاداب و تر وہ نخل، ہوا کا وہ اعتدال　　وہ وقت ہے کہ ہوتا ہے بیمار بھی بحال
عنبر فشاں شمیم معطر ہر اِک نہال　　ایک ایک شاخ جلوہ نما صورتِ ہلال
ملتا تھا لطف گلشنِ عنبر سرشت کا
دنیا کا باغ تھا کہ چمن تھا بہشت کا

صبح کے وقت ہوا معتدل ہوجاتی ہے، مریض کروٹیں بدل بدل کر طویل رات گزارتا ہے، سویرے کے وقت اس کی حالت میں نمایاں تغیر ہوجاتا ہے، صبا جب پھولوں سے گزرتی ہے تو ان کی خوش بو فضا میں بکھیر دیتی ہے۔ چوتھے مصرع میں رئیسؔ نے جلوہ نما شاخ کو ہلال سے تشبیہ دے کر اپنی فن کارانہ صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

دل کش اور پرکشش مناظر کی وجہ سے اس باغ پر بہشت کا گمان ہونے لگا تشبیب کے بعد گریز، شاعرانہ صنّاعی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کے باغ سرسبز و شاداب ہیں حیف صد حیف کہ:

بند ۹

پژمردہ ہو رہا تھا مگر گلشنِ رسولؐ　　بے آب و خشک تھے چمنِ فاطمہؑ کے پھول

تھا شدتِ عطش سے ہر اک غنچہ لب ملول　　کھلا گیا تھا سب چمنِ حیدرؑ و بتولؑ
بہتے تھے قحطِ آب سے آنسو حسینؑ کے　　دم توڑتے تھے پیاس سے گل رُو حسینؑ کے

اے نہرِ علقمہ وائے ہو تجھ پر ساقیِ کوثر کا لال اور تشنہ کام:

"آئی نظر سحر کی سپیدی جو ناگہاں"

لفظ "ناگہاں" سے ڈرامائی عجب انگیزی کا اظہار ہوتا ہے۔ امامِ عالی مقام حرم سرا سے برآمد ہوئے، حضرت علی اکبرؑ تشبیہِ پیغمبرؐ نے صوتِ حسن سے اذان دی جسے سن کر اعزہ اور رفقائے امام علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ (داخلی جوش کی وجہ سے)

وہ سب اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ شکلِ پیمبرؐ کی یہ آخری اذان ہے۔ سحر کا ظہور نقیب ہے طاعتِ الٰہی کا، بارھویں بند میں نہایت اختصار سے نمازیوں کی صفات کا بیان ہے جن کے مراتبِ عالیہ کے پیشِ نظر شاعر نے مفہوم کو اس طرح ادا کیا۔

"گویا ملک زمیں پہ لباسِ بشر میں تھے"

حسینی مجاہدین راہِ حق پر گامزن ہیں۔ نماز ختم ہوئی، امام عالی مقام اور دوسرے نمازی دعاؤں میں مشغول تھے، کوئی قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا تھا، کوئی یسٓ پڑھ کر دم کر رہا تھا، کوئی تن کے وایاک نستعین کا ورد کر رہا تھا۔ کسی کی نظر آسمان پر تھی۔ کسی کی زبان پہ اھدنا الصراط تھا، اتنے میں یزیدی لشکر کی طرف سے تیروں کی بوچھار شروع ہوگئی۔

"غصے سے تھرتھرا گئے سب خاص گانِ رب"

اعدا کی یہ جسارت کہ امامِ زمانہ کے ساتھ ایسی بے ادبی کریں، امامِ عالی مقام کا وقار مانع تھا، اس لیے وہ منھ سے تو کچھ نہ کہہ سکے لیکن شجاعت و جرأت کے پیکر تلواریں تول کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ افواجِ اعدا نے اُقتلوا الحسین کا نعرہ بلند کیا۔

مجاہدین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ مضطرب و بے قرار ہوکر انصار نے امام علیہ السلام سے معرکۂ کارزار میں جانے کی اجازت مانگی۔ میدانِ جنگ میں وہ

کارہائے نمایاں انجام دیے کہ اُن کی بہادری کے چرچے زباں زدِ خاص و عام ہو گئے اور "ایسے لڑے کہ تا بہ ابد نام رہ گیا۔"

انصار کے بعد امامِ عالی مقام کے اعزہ اجازت لے کر عازمِ جنگ ہوئے، یکے بعد دیگرے وہ بھی شہادت سے سرفراز ہوئے اور اعدا کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ،

"سب مل کے گھیر لو کہ اکیلے حسینؑ ہیں"

رزمیہ شاعری کی ایک جھلک:

بند ۱۷

ناگاہ طبلِ جنگ بجا کھل گئے علم   ہر سمت ترکشوں سے کھنچے ناوکِ ستم
تیغوں کو تول کر جو بڑھے اشقیا بہم   آمادۂ وغا ہوئے خود قبلۂ اُمم
باندھا کمر کو بخششِ امت کے واسطے
آئے حرم میں آخری رخصت کے واسطے

۱۸ سے ۴۸ تک رخصت کے بند ہیں:

رخصت مرثیے کا اہم جزو ہے، یہ منظر نہایت قیامت خیز ہوتا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں جذبات نگاری اور کردار نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

بند ۱۹

روتے ہوئے جو رانڈوں میں داخل ہوئے امام   دوڑے سب اہلِ بیتِ رسولؐ فلک مقام
آئے نظر جو یکہ و تنہا شہِ انام   شہ سے کیے لپٹ کے سکینہ نے یہ کلام
اماں ہیں مضطرب مہِ انور کو کیا کیا
بابا ہمارے چھوٹے برادر کو کیا کیا

امام حسینؑ کو یکہ و تنہا دیکھ کر اہلِ بیت علیہم السلام اُن کی طرف بڑھے لیکن اُن کے وقار کے پیشِ نظر کسی کو کچھ کہنے کی جسارت نہ ہوئی۔ جنابِ سکینہ نہایت چہیتی بیٹی تھیں، اس لیے اپنے باپ سے لپٹ گئیں اور اپنے چھوٹے بھائی علی اصغر کی بابت دریافت کیا۔

امام علیہ السلام کا جواب سنیے:

بند ۲۳

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہِ دیں پناہ بی بی شہید ہوگیا رن میں وہ رشکِ ماہ
پھٹتا تھا تشنگی سے جگر، حال تھا تباہ جنت میں لے گئی انھیں نہرِ لبن کی چاہ
دیکھا نہ پھر کے ماں کو اجل بھا گئی انھیں
آغوشِ قبر دیکھ کے نیند آگئی انھیں

بند ۲۶

بے جان ہوئے اب آنے کی اُن کے رکھو نہ آس
اب ہم بھی جاتے ہیں کوئی دم میں اُنھیں کے پاس
رونے لگے یہ کہہ کے جو شبیرِ حق شناس
آئیں قریب بانوئے بے کس بہ درد و یاس
فرقت جو دل پہ شاق تھی زہراؑ کے ماہ کی
دامن قبا کا تھام کے اک سرد آہ کی

اپنے والی کی زبان سے ایسی الم انگیز باتیں سن کر حضرت شہربانو نے:

"دامن قبا کا تھام کے اک سرد آہ کی"

رئیسؔ نے ایک ماہرِ نفسیات کے فرائض انجام دیتے ہوئے حضرت شہربانو کی قلبی کیفیات کو ایک مصرع میں نظم کردیا، یہ ہے شاعری کا اعجاز۔

صبح سے وقتِ عصر تک امامِ مظلوم شہدا کے لاشے مقتل سے اٹھا کر خیمہ گاہ میں لارہے تھے۔ سب انصار اقربا جامِ شہادت نوش کرچکے۔ حضرت شہربانو نے فرمایا، آپ بھی عازمِ جنگ ہیں۔ یہ تو ارشاد فرمایئے کہ آپ نے مجھے کس کے سپرد کردیا ہے، آپ کی شہادت کے بعد ممکن ہے کہ میرے سر سے چادر بھی چھن جائے۔

امام علیہ السلام نے حضرت شہربانو کو صبر کی یوں تلقین فرمائی۔

بند ۳۴

جس دم سنے حسینؑ نے بانو کے یہ کلام   گردن جھکا کے رونے لگے قبلۂ انام
فرمایا غم نہ کھاؤ یہ ہے صبر کا مقام   بانو کرے گا دکھ میں مدد رب ذوالکرام
ناحق یہ اضطراب یہ رقت کا جوش ہے
گر ہوگی بے ردا تو خدا پردہ پوش ہے

امامِ عالی مقام نے اہلِ بیت علیہم السلام کو رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کیا اور ان کو صبر وضبط کا درس دیا۔

بند ۴۸

فرما کے یہ حرم سے امامِ زمن چلے   دل پر اٹھا کے ہجر کے رنج و محن چلے
مرنے کو حق کی راہ میں تشنہ دہن چلے   پیچھے سب اہلِ بیتِ شہِ بے وطن چلے
کوہِ الم گرا جو دلِ دردناک پر
بنتِ رسولؐ گر پڑیں غش کھا کے خاک پر

حضرت زینبؑ کو اپنے ماں جائے سے بے انتہا محبت تھی۔ اس لیے آخری رخصت کے جان لیوا منظر کی تاب نہ لاسکیں اور انھیں غش آگیا۔ حقیقت پر مبنی جذبات کی کامیاب مرقع کشی ہے، سلطانِ ارجمند حرم سرا سے برآمد ہوئے تو ذوالجناح ان کی آمد کا منتظر تھا جب شاہِ حق پسند رخش پر جلوہ گر ہوئے اس وقت:

فیضِ قدم سے خاک کو یہ مرتبہ ملا
طبقہ زمیں کا چرخِ چہارم سے جا ملا

امامِ مبین کی بدولت ارضِ نینوا کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ وہ چرخِ چہارم سے آنکھ ملانے لگی۔ رسولِ اکرمؐ کا عمامہ امام علیہ السلام کے سرِ اقدس پر تھا۔ حضرت علیؑ کی ذوالفقار کمر میں اور حضرتِ حمزہؓ کی ڈھال اُن کے دوشِ مبارک پر تھی۔

بند ۵۵

اس شان سے جو رن میں گئے شاہِ کربلا　　　　غصّہ کر یہ ابنِ سعد ستم گر کو دی صدا
او بدنہاد و سرکش و بے دین و بے حیا　　　　ہاں دیکھ تین روز کے پیاسے کی اب وغا
ہنگام　کارزار　ہے　وقت　نبرد ہے
بڑھ کر علی کی تیغ کو روکے وہ مرد ہے

تیسرے مصرع میں عمر بن سعد کے کردار کا مختصر لیکن نہایت جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے اس کے بعد چیلنج ہے۔

"بڑھ کر علی کی تیغ کو روکے وہ مرد ہے"

مندرجہ بالا مصرع میں رجز کا انداز ہے۔ حضرت علیؑ کی ذوالفقار نے اپنے جوہر بدر و احد و خیبر و خندق اور دوسرے معرکوں میں دکھائے آج وہ کربلا میں بے نیام ہوگی۔

حسبِ ذیل بند رزمیہ شاعری کے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔

بند ۵۶

یہ سن کے طبلِ جنگ بجا پہلواں بڑھے　　　　نیزے اٹھے نشانِ ضلالت نشاں بڑھے
بہرِ وغا جو فوج کے نامی جواں بڑھے　　　　قبضے پہ ہاتھ رکھ کے امامِ زماں بڑھے
پیہم چلے جو تیرِ ستم فوجِ شام سے
نکلی علیؑ کی تیغ دو پیکر نیام سے

جب افواجِ شام کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی تو ذوالفقار تڑپ کر نیام سے نکل پڑی۔

اسلحۂ جنگ، شمشیرِ براں اور رخشِ سبک رفتار رزمیہ شاعری کے اہم اجزا ہیں۔

بند ۵۷

چمکی جو ذوالفقار کی بجلی میانِ فوج　　　　جل جل کے سرد ہونے لگے سب جوانِ فوج
تھیں قطع بیرقیں تو قلم تھے نشانِ فوج　　　　دو دو تھا ایک وار میں ہر پہلوانِ فوج

چھایا تھا ابرِ تیغ، اجل ہر عدو کی تھی
ریتی پہ سر برستے تھے، بہیا لہو کی تھی

اس بند کے پہلے مصرعے میں بجلی کی معنویت پر غور فرمایئے، بجلی میں چمک دمک ہوتی ہے، کبھی یہاں گرتی ہے کبھی وہاں گرتی ہے۔ یہی حال ذوالفقار کا ہے جس پر بجلی گری اس کا کام تمام ہوگیا۔ یہی کیفیت تیغ علیؑ کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں صنعتِ تضاد نے کس قدر لطف پیدا کردیا۔ بجلی کی خاصیت ہے جلانا اور زندگی کے چراغ کو بجھا دینا۔ بیرقیں☆ بھی ذوالفقار کی زد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ لشکریوں کے سروں پر ابرِ تیغ چھایا ہوا تھا، ہر طرف سر برس رہے تھے۔ چھٹے مصرعے میں۔ ہندی لفظ بہیا، کی فصاحت کی داد دیجیے۔ میدانِ کارزار میں ایک طوفانی کیفیت تھی۔ ہر طرف لہو کی نہریں رواں تھیں اور خون ہی خون نظر آرہا تھا جس میں دم بہ دم اضافہ ہوتا رہا۔

حضرت علیؑ کی ذوالفقار شرربار تھی۔ اس لیے شام کے خوں خوار سپاہی ٹھنڈے ہو رہے تھے (دم نکلنے کے بعد جسم سرد پڑ جاتا ہے) اسوار مارے خوف کے راہِ فرار اختیار کیے ہوئے تھے۔ تلوار ان کو صدا دیتی کہ یہ تمھارا خیال خام ہے تم میری زد سے ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتے۔

بچ کر کہاں چھپو گے حسامِ علیؑ ہوں میں
مدت کے بعد آج صفوں پر چلی ہوں میں
آج تمھارا لہو پی کر اپنی پیاس تو ذرا بجھالوں۔

بند ۶۱

وہ بانکپن وہ ناز سے چلنا اِدھر اُدھر — وہ سرخ رو صفوں سے نکلنا اِدھر اُدھر
وہ رن میں بحرِ خوں کا اُبلنا اِدھر اُدھر — وہ سو طرح کا رنگ بدلنا اِدھر اُدھر
دل پائمال لشکرِ اہلِ جفا کے تھے
آفت کی تھی ادا تو کرشمے بلا کے تھے

☆ بیرق، علم میں بندھا ہوا کپڑا۔

تلوار بانک پن نازو انداز سے دشمنوں کی صفوں پر چل رہی تھی اور سرخ رُو نکلتی تھی۔ سرخ رُو، کی معنی خیزی کی داد دیجیے۔ میدانِ جنگ میں خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، آفت اس کی (تیغ کی) ادا تھی اور بلا اس کا کرشمہ، اسی لیے تو اہلِ جفا کے دل پامال تھے، لہو پینے سے تیغ کا دم اور بڑھتا۔

جب تک دشمن کا سر دھڑ سے کٹ کر نہ گر پڑتا وہ اسے نہ چھوڑتی۔

مندرجہ ذیل بند کے تیور ملاحظہ ہوں۔

بند ۶۷

دہشت سے اس کی سخت جگر کانپتے تھے سب
پتے ہوئے تھے برگِ شجر کانپتے تھے سب
قدسی وہاں سے دور تھے پر کانپتے تھے سب
دریا میں تھے نہنگ مگر کانپتے تھے سب
ساتوں فلک جو ہلتے تھے خوف و دہشت سے
گاوے زمیں لپٹتی تھی ماہی کی پشت سے

تیغ کی دہشت سے بڑے بڑے سورماؤں اور بہادروں کے زہرے آب ہو رہے تھے، ملائک آسمان پر تھے لیکن اس کی برش سے وہ بھی خوف زدہ تھے ''پر'' کا لفظ قابلِ غور ہے۔ ذو معنی ہونے کی حیثیت سے، چوتھے مصرعے میں 'مگر' ذو معنی ہے۔

بیت نے مضمون کو کس قدر رفعت بخشی، آسمان کے ساتوں طبقے دہشت سے کانپ رہے تھے۔ ایک مفروضے کے مطابق گائے کے سینگ پر زمین قائم ہے لیکن اس کے بھی حواس باختہ ہوگئے تھے۔ رئیسؔ نے مصرعوں کو نہایت سلیقے سے مربوط کیا ہے تخیل کی کارکردگی اور اندازِ بیان کی رعنائی قابلِ ستائش ہے۔

بند ۶۸

وہ ہاتھ کی صفائیاں وہ تیغ کی چمک ہلتے تھے دل سما سے تزلزل تھا تا سمک

وہ آب وتاب گھاٹ[1] کی، وہ باڑھ[2] کی چمک   تھا آبِ شورِ تیغ ہر اک زخم پر نمک

منھ اپنا زخم کھولے تھے لطفِ غزا[3] یہ تھا

بسمل بھی ہونٹ[4] چاٹ رہے تھے مزا یہ تھا

امام حسینؑ کے دستِ مبارک میں ذوالفقار تھی۔ وہ فنِ سپہ گری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ زمین سے آسمان تک، عرش سے فرش تک تزلزل کی کیفیت طاری تھی۔ چوتھے مصرعے میں صنعتِ مراعات النظیر نے لطفِ کلام دوبالا کردیا۔ زخم پر نمک چھڑکنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ تیغ کا (کھاری) پانی نمک پاشی کررہا تھا۔ مشاہدہ ہے کہ زخم کا منھ کھلا رہتا ہے۔ ہونٹ چاٹنا محاورہ ہے کسی مزے دار چیز کا ذائقہ یاد رکھنا۔ چھٹا مصرع رنگِ تغزل لیے ہوئے ہے۔ اس بند میں خاندانِ انیسؔ کا رنگ واضح طور سے نمایاں ہے۔

اگلا بند کلائمکس (Climax) ہے، اس کے بعد situation بدلتی ہے۔ یعنی مرثیے کے موضوع میں یکایک تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

بند ۷۹

مصروف تھے دعا میں شہِ آسماں وقار   آئی صدائے حیدرِ صفدر یہ ایک بار

بیٹا تمھاری ہمت وجرأت کے میں نثار   اب ہاتھ اپنا روک لو اے میرے گل عذار

تم سے لڑے مجال بھلا یہ کسی کی ہے

پر جائے رحم ہے کہ یہ امتِ نبیؐ کی ہے

حضرت علیؑ کی آواز آئی، بس اپنا ہاتھ روک لو بھلا کس کی مجال ہے جو تم

☆۱۔ گھاٹ (ہ) دریا کا کنارہ، وہ مقام جہاں دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ تلوار کی وہ جگہ جہاں سے اس کا خم شروع ہوتا ہے:

گھاٹ سے اس کے گھٹ گیا طوفان

باڑھ سے بڑھ گئی ہے خوں خواری (منیر)

☆۲۔ باڑھ (ہندی) ذومعنی۔ سیلاب، دمِ شمشیر

☆۳۔ غزا (عربی غزاء) مؤنث مذہبی جنگ

☆۴۔ ہونٹ چاٹ ہی گیا ہر دہنِ زخم جگر

آج جھنجھلا کے جو قاتل نے نمکداں الٹا (داغ)

سے مقابلہ کر سکے۔ یہ تمہارے نانا کی امت ہے۔ اس پر رحم کرو، ورنہ یہ نیست و نابود ہو جائے گی۔

امامِ عالی مقام نے یہ آواز سن کر ذوالفقار نیام میں رکھ لی۔

خیمے کی سمت دیکھ کر امامِ مظلوم پر اداسی کی سی کیفیت طاری ہوگئی جو کچھ مخدراتِ عصمت پر گزرنے والا تھا، وہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ دستِ مبارک سے لگامِ فرس چھوٹ گئی۔ رکابوں میں قدم تھرانے لگے (داخلی جذبات کی شدت کی وجہ سے) رہوار کی فراست قابلِ داد ہے وہ امام علیہ السلام کا ارادہ سمجھ گیا۔ اُن کی طرف یاس سے دیکھ کر بزبانِ حال کہا... میرے مولا و آقا! آپ نے لڑائی سے کیوں ہاتھ روک لیا۔ بھاگے ہوئے دشمن پھر صف آرا ہوکر آپ پر حملہ کریں گے۔ امامِ مظلوم نے اس سے فرمایا، اے ذوالجناح ہنگامِ عصر ہے، یہی تو وعدۂ طفلی کے ایفا کا وقت ہے، اپنے نانا کی امت کو بخشوانے ہی کے لیے تو میں نے محضرِ شہادت پر دستخط کیے تھے۔

"آیا ہے وقتِ عصر لڑائی تمام ہے"

افواجِ اعدا نے امام علیہ السلام کو گھیر لیا ہر سمت سے تیروں اور پتھروں کی بارش ہونے لگی، تیروں اور تلواروں کے وار چلنے لگے، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ:

"دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا"

شہادت

شمر خنجر لیے ہوئے امامِ مظلوم کی طرف بڑھا، سجدے کی حالت میں سر و تن میں جدائی ہوگئی۔ جب ذوالجناح درِ خیمہ پر آگیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ راکبِ دوشِ رسولؐ نہیں تھا، زینِ فرس پر اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر اہلِ حرم میں کہرام مچ گیا۔ بی بیاں اپنے سروں کو پیٹنے لگیں اور ذوالجناح سے دریافت کیا کہ تیرا سوار کہاں رہ گیا، سر کو پٹک کر وہ بزبانِ حال گویا ہوا:

ماتم کرو کہ خانۂ زہراؑ اجڑ گیا　　　مجھ سے سوارِ دوشِ پیمبرؐ بچھڑ گیا

شہادت کی خبر ملتے ہی خیامِ اہلِ بیت میں قیامت برپا ہوگئی، رانڈوں کے

جاں گسل بین اور دل خراش نالے ہر طرف سنائی دے رہے تھے۔

بین

عموماً بین پر مرثیے کا اختتام ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں اسے مرثیے کا لازمی جزو تسلیم کیا گیا ہے۔ رئیس نے ایک روایت نظم کی ہے کہ حضرت شہر بانو سیدالشہدا امام حسینؑ کے رہوار پر سوار ہو کر کسی طرف روانہ ہو گئیں۔ بعد میں ان کے بھائی ملے جو امام حسین علیہ السلام کی امداد کے لیے ایک لشکر کثیر لیے ہوئے کربلائے معلی کی طرف آرہے تھے۔

بعض دوسرے مرثیہ گویوں نے بھی یہ روایت نظم کی ہے۔ فی الحال اس پر تبصرہ مقصود نہیں ہے۔

مندرجہ بالا مرثیے کے تجزیے کے بعد اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ رئیس نے مرثیہ گوئی میں اپنی خاندانی روایات کو مدِ نظر رکھا اور ترازوئے شعر کو سبک نہ ہونے دیا۔

وہ مرثیے کی تکنیک سے بخوبی واقف تھے۔ منظر نگاری، جذبات نگاری کے محاسن کے علاوہ ان کے مرثیے میں روزمرہ کی چاشنی ہے۔ محاوروں کا برمحل استعمال ہے۔ سہلِ ممتنع اشعار کی خاصی تعداد ہے۔ رزم و بزم کی مرقع کشی ہے۔ رئیس کے اندازِ بیان میں خاندان کا رنگ واضح طور پر نمایاں ہے۔ اگر اُن کے ورثا یا اربابِ ذوق اُن کے غیر مطبوعہ مرثیوں کی طباعت اور اشاعت کا بیڑا اٹھائیں تو یہ نہ صرف مرثیہ نگاری بلکہ اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔

۵۔ رئیس، میر محمد عسکری

"میر انیس کے دوسرے بیٹے میر عسکری اگرچہ سب طرح کی صلاحیت رکھتے تھے مگر دائم المریض، مجہول الحال ایسے رہے کہ کچھ محنت و ریاضت نہ کر سکے۔ میر انیس نے وہ مشہور مرثیہ انھیں کے نامزد کر دیا تھا۔"☆

"نمکِ خوانِ تکلم ہے فصاحت میری"

☆ شاد عظیم آبادی، پیمبرانِ سخن، ص ۲۷۶

ان کے بارے میں اس عہد کے محقق یوں رقم طراز ہیں:

رئیس میر محمد عسکری (خلف و شاگردِ میر ببر علی انیس لکھنوی) شعر و شاعری سے زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے۔ زندگی بھر میں تین چار مرثیے لکھے ہوں گے۔ غالباً ۱۳۰۸ھ میں بہ عمر ۵۵ سال انتقال کیا۔ کلام صاف اور سنجیدہ ہوتا تھا۔"[☆۱]

مرثیے کی تکنیک میں اس نکتے کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ کچھ مرثیے ایسے بھی ہیں جن میں تمام اجزائے ترکیبی نہیں پائے جاتے۔ مثلاً امام حسینؑ کی مدینہ منورہ سے روانگی، کوفے میں حضرت مسلم بن عقیلؑ کی شہادت، زنداں سے رہائی کے بعد حضرت مسلم کے دو صاحب زادوں کا حارث کے ہاتھوں شہید کیا جانا، وقتِ عصر زعفر جن کا امام علیہ السلام کی مدد کے لیے کربلائے معلیٰ پہنچنا اور دیگر روایتیں جو اس ضمن میں نظم کی گئی ہیں۔

رئیس نے "نامۂ یزید بنامِ ولید" نظم کیا ہے۔ اس پر بھی مرثیے کا اطلاق ہوگا۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ مسدّس ہے جو اس صنفِ سخن کے لیے معیّن کردی گئی تھی۔

موضوع کے لحاظ سے یہ خط امام حسینؑ اور اُن کے مجاہدین کی شہادت کا پس منظر ہے۔ مرثیے میں تیس بند ہیں۔ اس کا مطلع ہے "آیا خطِ یزید جو شاہِ انام کو"

رئیس کا ایک اور مرثیہ بھی[☆۲] دستیاب ہوگیا ہے جس کا مطلع ہے:

"اے زباں معرکۂ مقتلِ شبیرؑ دکھا"

اس مرثیے میں ۱۱۲ بند ہیں اور یہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بارے میں ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ بالا دونوں مرثیوں پر تبصرہ کیا جائے گا۔

واقعہ نگاری

مرثیہ ایک بیانیہ نظم ہے جس کی ایک نمایاں خصوصیت واقعہ نگاری ہے۔

☆۱۔ افسر امروہوی (مقالہ) فیضانِ انیسؔ، مطبوعہ سہ ماہی "اردو" کراچی، شمارہ ۳ و ۴، ۱۹۷۳ء، ص ۲۵۸

☆۲۔ رئیس مرحوم کے دونوں مرثیے سید یوسف حسین صاحب زیدی نے عنایت فرمائے جس کے لیے صاحب موصوف کا رہینِ منت ہوں۔

چودہ صدی کے گزرے ہوئے واقعات کو مرثیہ گو نظم کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ 'مقاتل' اور 'روایات' کو پیشِ نظر رکھتا ہے لیکن تخیل کی رنگ آمیزی سے بھی کام لیتا ہے تاکہ واقعات کے بیان میں دل کشی پیدا ہوجائے۔ نفسیات اور طرزِ معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو بھی وہ مدِنظر رکھتا ہے، واقعہ نگاری کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

بند ا

آیا خطِ یزید جو شاہِ انام کو　　　پیکِ ولید آیا بلانے امام کو
پہونچی خبر حسین علیہ السلام کو　　　فرمایا دل سے چلنا پڑا ملکِ شام کو

منظور تھا جو چرخِ کہن کو وہی ہوا
افسوس بے چراغ مزارِ نبیؐ ہوا

رئیسؔ نے آسان اور سلیس زبان میں واقعہ کربلا کی اس اہم کڑی کو نہایت دیانت داری سے نظم کیا۔ پنج تن پاک علیہم السلام میں صرف امام حسینؑ باقی رہ گئے تھے۔ اعدائے دین اُن کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ بیت میں ایک داستانِ غم مضمر ہے۔

خط ملتے ہی امامِ عالی مقام بیت الشرف سے روانہ ہوئے۔ آپ کے اعزہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔

بند ١٨

آکر درِ ولید پہ فرمایا شاہ نے　　　لو پیارو ہم کو جانے دو اور یاں رہو کھڑے
سب رک گئے وہیں پہ مگر بے حواس سے　　　عباسؑ ساتھ ہو لیے رومال تھام کے

فرمایا شہ نے بھائی نہ آتے تو خوب تھا
بولے وہ یوں جناب نہ جاتے تو خوب تھا

حکمِ امام سے مجبور ہوکر خاندانِ نبی ہاشم کے دوسرے افراد دروازے پر ٹھہر گئے مگر بے حواس سے، یہ ٹکڑا اُن کی نفسیاتی کش مکش کی غمازی کرتا ہے۔ حضرت عباسؑ اپنے آپ کو امامِ عالی مقام کا غلام کہا کرتے تھے۔ اس لیے ان کا رومال لے کر ساتھ

چلے گئے۔

ولید نے امام حسینؑ کو مسند پر بٹھایا۔ یزید کا خط دے کر اُن سے جواب کا طالب ہوا۔ امامِ عالی مقام نے فرمایا:

بند ۲۴

لکھ بھیج میری سمت سے اس کو کہ اے شقی   باہر کسی طرح سے نہیں ہے حسینؑ بھی
ہے میرے سر کے ساتھ یہ دینِ محمدی   ڈالے گا رخنہ دین میں کب نائبِ علیؑ
بیعت حسینؑ کرلے اگر ڈر کے جان سے
پھر کون لے گا نام نبیؐ کا زبان سے

خیر و شر کے نظریوں کا تصادم شروع ہوگیا، نواسۂ رسولؐ، پروردۂ آغوشِ بتولؑ، فرزند علی مرتضیٰ، برادر حسنِ مجتبیٰ نے بیعتِ یزید سے انکار کردیا۔ انھوں نے تو دینِ حق کی بقا و حفاظت کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر امامِ حسینؑ نے روضۂ رسولؐ پر آخری مرتبہ حاضری دینے کے بعد بتاریخ ۲۸/ رجب ۶۰ھ مدینہ منورہ کو خیر باد کہا۔ سنگلاخ پہاڑوں، تپتے ہوئے ریگستانوں اور ناہموار راستوں سے گزرتے ہوئے ۲/محرم ۶۱ھ کو اعزہ اور رفقا سمیت کربلائے معلیٰ میں وارد ہوئے۔

بند ۲

دشتِ غربت☆ میں جو یثرب کے مسافر آئے   تربتِ احمدِ مرسل کے مجاور آئے
بے کس و بے وطن و صابر و شاکر آئے   حق پہ مرنے کے لیے دین کے ناصر آئے
کربلا بن گئی بستی وطن آواروں کی
روشنی پھیل گئی فاطمہؑ کے تاروں کی

دینِ اسلام کے پرستار جذبۂ شہادت سے سرشار امامِ مبین کی سرکردگی میں دشتِ نینوا پہنچے تو امامؑ نے فرمایا بس یہی منزل ہے۔ یہ وہ ارضِ مقدس ہے جو

☆ مطلع، اے زباں معرکۂ قتلِ شبیرؑ دکھا۔

رَوِشِ گلشنِ فردوس ہے۔

بند ۳

تھم کے شہ نے یہ رفیقوں کو صدا دی اک بار
کوئی اس جا سے اب آگے نہ بڑھائے رہوار
رات دن جس کی جدائی میں نہ تھا صبر و قرار
یہ وہی ارضِ مقدس ہے، وہی ہے یہ کچھار
جلوۂ رحمتِ معبود نظر آتا ہے
خود بہ خود آج کنول دل کا کھلا جاتا ہے

نہرِ فرات کے کنارے خیامِ اہلِ بیت کے نصب کیے جانے کا اہتمام ہونے لگا۔ اتنے میں یزیدی فوج کا ایک دستہ اس پر مصر ہوا کہ خیمے ریتی پر برپا کیے جائیں، نہر کے قریب کوفہ و شام کے سرداروں کے خیمے ہوں گے۔

حضرتِ عباسؑ نے لشکرِ اعدا کو سمجھانے کی کوشش کی اور اُن سے یوں مخاطب ہوئے۔

سیکڑوں لکھ کے خطِ شوق بلایا ہم کو   ایسی گرمی میں مدینے سے چھڑایا ہم کو
دو قدم بھی کوئی لینے کو نہ آیا ہم کو   خوب دعوت کا سر انجام دکھایا ہم کو
مشورے قتل کے لشکر میں بہم ہونے لگے
ابھی اترے بھی نہیں ہم کہ ستم ہونے لگے

امامِ عالی مقام حضرتِ عباسؑ کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ ساربانوں نے اونٹ بٹھا دیے اور مخدّراتِ عصمت کے اتروانے کا بندوبست ہونے لگا۔

بند ۵۲

مہتمم عون و محمد تھے اِدھر اور اُدھر   پردہ روکے ہوئے تھے حضرتِ زینبؑ کے پسر
تھے قریں اکبرؑ و عباسؑ جھکائے ہوئے سر   ہاتھ ہمشیر کا تھامے تھے شہِ جن و بشر

کوئی پہلے نہ عماری سے سواری اتری
سب کے پہلے اسد اللہ کی پیاری اتری

واقعہ نگاری میں واقعات کی ترتیب میں خوش اسلوبی نہایت ضروری ہے۔ واقعات خاکے ہیں جن میں مرثیہ نگار اپنے تخیل سے رنگ بھرتا ہے تاکہ موضوع کو پُرکشش بنایا جائے۔

مصوری

مصوری بھی واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔ مصور متحرک واقعات میں سے کسی ایک واقعے کی تصویر کشی کرسکتا ہے لیکن مسلسل عمل کی مرقع کشی اس کے بس کی بات نہیں۔ بیانیہ شاعری میں الفاظ کی مدد سے شاعر تصویریں پیش کرتا ہے۔

یزیدی فوج کے دستے نے اطلاع دی تھی کہ کوفہ و شام کے سردار آنے والے ہیں اور اُن کے خیمے نہرِ فرات کے قریب نصب کیے جائیں گے۔

بند ۴۴

ذکر یہ تھا کہ اٹھا دشتِ پُرآفت میں غبار — ہوگیا گرد سے گھوڑوں کی جہاں تیرہ و تار
نظر آئے جو نشانِ سپہ ناہنجار — اٹھ کے تکنے لگے مولا کے عزیز و انصار
تھی یہ کثرت کہ زمیں دشت کی تھراتی تھی
دور تک فوج کے ڈنکے کی صدا جاتی تھی

رئیس نے اشاروں اور کنایوں سے احساس کو مخاطب کیا ہے۔ قوتِ باصرہ اور سامعہ کو متحرک کیا ہے "اٹھ کے تکنے لگے" مسلسل عمل کی مصوری ہے۔ ساتویں محرم سے امام علیہ السلام، ان کے عزیزوں اور رفیقوں پر پانی بند کردیا گیا، نویں محرم کو یہ کیفیت ہوگئی کہ:

بند ۵۷

جاں بہ لب پیاس سے تھے شہ کے عزیز و انصار
العطش کی تھی ہر اک آن صغیروں میں پکار

تشنگی سے جو نہ معصوموں کو آتا تھا قرار
خشک ہونٹوں پہ پھراتے تھے زبانیں ہر بار
ذکر پانی کا جو باہر کہیں سن پاتے تھے
بچے کوزے لیے خیمے سے نکل آتے تھے

چوتھے مصرعے میں حرکت پائی جاتی ہے۔ بیت میں حرکت کے علاوہ پیاسے بچوں کی نفسیات کا بھی تذکرہ ہے۔ شبِ عاشور خیامِ اہلِ بیت کے گرد خندقیں کھود کر ان میں آگ جلادی گئی تھی تا کہ اعدائے دیں رات کے وقت حملہ آور نہ ہوسکیں۔ رئیس نے اس منظر کی کامیاب مصوری کی ہے۔

بند ۵۹

گرد خیمے کے جو خندق میں بھڑکتے تھے شرر
تھی وہ گرمی کہ پھکے جاتے تھے سینوں میں جگر
شور باجوں کا ہر اک صف میں جو ہوتا تھا اُدھر
غش سے چونک اٹھتے تھے معصوم بحالِ مضطر
مائیں دیتی تھیں دلاسا پہ نہ چپ ہوتے تھے
دم بہ دم سہم کے منھ تکتے تھے اور روتے تھے

خارجی شاعری میں گرد و پیش کے مناظر کی اہمیت مسلم ہے۔ مندرجۂ بالا بند میں گرمی کی شدت کا بیان ہے اور معصوم بچوں کی ذہنی کیفیات کی تصویر کشی ہے۔

"دم بہ دم سہم کے منھ تکتے تھے اور روتے تھے"

سلاست اور نفسیات کے امتزاج نے مصرع میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

جذبات نگاری

مرثیے میں واقعہ نگاری بھی ہوتی ہے اور جذبات نگاری بھی۔
کبھی انسان کے دل میں خوشی اور مسرت کے جذبات کروٹیں لینے لگتے ہیں

اور کبھی وہ درد و غم سے دوچار ہوتا ہے، انھیں جذبات کی وجہ سے مختلف احساسات کی کش مکش ظہور پذیر ہوتی ہے، کہیں غصہ اور شجاعت، کہیں فرض ومحبت اور کہیں صبر و اختیار میں تصادم ہوتا ہے۔ ایسے ہی نازک موقعوں کی کامیاب جذبات نگاری مرثیہ گو (شاعر) کا طرۂ امتیاز ہے۔

فرض ومحبت کی کش مکش کی تصویر کشی ملاحظہ فرمایئے۔

جب امام حسینؑ ولید کے گھر روانہ ہوئے اس وقت دودمانِ بنی ہاشم کے افراد ان کے ہم راہ تھے۔

بند ۱۲

القصہ☆ اب کو لے کے چلے جب امامِ دیں اکبرؑ سے رو کے کہنے لگی بانوئے حزیں
قربان جاؤں وقت اطاعت کا یہ نہیں وہ لاکھ چھوڑیں ان کو نہ تم چھوڑنا کہیں
لاج اپنی اپنی یاد رہے اپنے ہاتھ ہے
واری یتیمی اور رنڈاپے کا ساتھ ہے

فرض ومحبت کی کش مکش کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔

بند ۱۳

زینبؑ نے کہا بیٹوں سے سنتے ہو واری ماں عزت پر آ بنی تو ادب قاعدہ کہاں
آج آگے آگے ماموں کے رہیو مرور جاں دھوکے میں کم سنی کے اٹھا [illegible]
قائل جہاں علیؑ کی رہا آن بان کا
اماں نثار روز ہے آج امتحان کا

اطاعت اور شجاعت کی کش مکش کی ایک مثال:

حضرت عباس اسد اللہ کے لال ہیں، جلال میں بھی [illegible]

یزیدی فوج کے ہراول دستے نے اصرار کیا کہ خیامِ اہلِ بیت [illegible]

حضرت عباسؑ کو جلال آ گیا۔

☆ مطلع، آیا خط یزید جو شاہِ امام کو۔

بند ۲۸

سن کے یہ☆ نہر پہ گونجا اسداللہ کا لال
اشقیوں کو جو الٹا تو ہلا دشتِ قتال
غیظ میں بڑھ کے صدا دی یہ سوئے فوجِ ضلال
ہم سے لے نہر یہ کیا شام کے حاکم کی مجال
شمرِ الفتِ بے دیں کا مزا چکھو گے
سر نہ ہوں گے جو ترائی میں قدم رکھو گے

اسی میں خیر ہے کہ لشکرِ شر آگے نہ بڑھے، یہ کس کا جگر ہے کہ شیروں سے نہر چھین لے اگر ہم تیغ علم کریں تو زمانہ تہ و بالا ہو جائے، نہر کے مالک و مختار تو شاہِ کائنات ہیں جن کی جرأت و شجاعت سے زمانہ واقف ہے۔

اعدائے دیں نے جواب دیا کہ ہم حکمِ حاکم سے مجبور ہیں، سرداروں کے خیمے تو لبِ دریا ہی برپا ہوں گے۔ یہ سن کر حضرت عباسؑ کو جلال آگیا اور شمشیرِ دو دم کھینچ کر بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ امامِ زمانہ کی آواز سنائی دی:

"تیغ کھینچو نہ مرے سر کی قسم ہے بھائی"

جذبات کی کش مکش نفسیاتی اپیل اور جذبات نگاری ملاحظہ فرمائیے۔

بند ۴۵

لو چلو محمل و ہودج میں حرم ہیں گریاں
بچے روتے ہیں بلکتی ہے سکینہ نادان
بھائی! اللہ یہ غصہ ہے کہ ہیں اشک رواں
غیظ میں کیا مری الفت بھی بھلا دی اس آن
جان ہو جسم کی تم زینتِ پہلو تم ہو
دل کو سو طرح کی قوت ہے کہ بازو تم ہو

شجاعت کا تقاضا تھا کہ حضرتِ عباسؑ لشکرِ اعدا کو تہ و بالا کر دیتے لیکن اطاعتِ امام کے پیشِ نظر شمشیر کے جوہر نہ دکھا سکے، اس لیے آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

☆ مطلع، اے زباں معرکہ مقتلِ شبیر دکھا۔

بند ۴۶

جوڑ کر ہاتھ یہ غازی نے کیا شہ سے کلام   کیا مجال اب کہ جو رکھے قدم آگے یہ غلام
آ کے آرام سے ساحل پہ رہے لشکرِ شام   اب زباں پر بھی نہ آئے گا کبھی نہر کا نام
یہ تو کیا ذکر جو اس فوج سے تکرار کروں
سر بھی کاٹیں اگر اعدا تو نہ انکار کروں

آپ کا حکم سر آنکھوں پر، کیا مجال جو آگے قدم بڑھاؤں، آقا مجھے تو بابا کے نام کا خیال تھا۔

رخصت

اعزہ وقتِ رخصت اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔ اس مرثیے سے امامِ مظلوم کی رخصت کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

بند ۶۱

آئے رخصت کو جو خیمے میں شہ عرش مقام   شورِ فریاد سے رانڈوں میں بپا تھا کہرام
شہ سے لپٹی ہوئی کرتی تھی سکینہ یہ کلام   آپ سے چھٹ کے نہ ہوگا مجھے دم بھر آرام
اب سکینہ جو نہ اس سینے کی بو پائے گی
شب کو صدقے گئی کیوں کر مجھے نیند آئے گی

بابا مجھے اس دشتِ بلا میں چھوڑ کر نہ جائیے، میں جاں بہ لب ہوں، میرے دل کو نہ کڑھائیے۔ اعدائے دیں بہت ظالم واقع ہوئے ہیں، آپ کی شہادت کے بعد کہیں ہمارے خیمے نہ لوٹ لیے جائیں۔

بند ۶۴

روکے حضرت نے یہ فرمایا کہ اے جانِ پدر
دم بہ دم فرقتِ اصغر میں تڑپتا ہے جگر

شب کو اس ظلم کے صحرا میں ہے سو طرح کا ڈر
تم کو لازم ہے کرو بھائی کی غربت پہ نظر
کس طرح رشتۂ الفت ابھی توڑیں بی بی
کیوں کر اس دشت میں تنہا انھیں چھوڑیں بی بی

ناز و نعم کا پروردہ اصغر آج دشتِ کربلا میں محتاجِ کفن ہے، نہ تو ماں اس کے پہلو میں ہے اور نہ سرہانے بہن ہے، گردِ بیاباں اس کا کفن ہے۔ اس کا تنِ عریاں جلتی ریت پر پڑا ہوا ہے، یہ سن کر خیامِ اہلِ بیت میں شور و فغاں برپا ہوگیا، حضرت شہر بانو نے فرمایا کہ میرے بغیر اصغر کو نیند کیسے آئی ہوگی۔

بند ۶۸

سن کے یہ ذکر ہوا دل پہ جو صدمہ اک بار
نکلے روتے ہوئے خیمے سے امامِ ابرار
آلِ احمدؐ میں ہوئی ہائے حسینا کی پکار
غش ہوئیں خاک پہ ڈیوڑھی کے قریں زینبِ زار
جب حرم شہ کی مصیبت کا بیاں کرتے تھے
منھ کو ڈھانپے ہوئے بچے بھی فغاں کرتے تھے

امامِ مظلوم نے اہلِ بیت کو صبر کی تلقین فرمائی۔ بعد ازاں خیمے سے برآمد ہوئے فرسِ تیز قدم پر سوار ہوئے۔ دستِ مبارک میں شمشیرِ دو دم لی اور عازمِ معرکۂ کارزار ہوئے۔ رئیس نے ایک بند میں امامِ عالی مقام کا سراپا اس طرح نظم کیا ہے۔

سراپا: بند ۷۰

وہ جلالت وہ تہور وہ نہیب اور وہ داب
وہ حشم اور وہ شوکت وہ غضب اور وہ عتاب
رخ پہ وہ نور کہ خورشید کو آتا تھا حجاب
تن وہ خوش بو تھا کہ مٹی ہے جہاں عطرِ گلاب
زلفِ مشکیں بھی اگر دوش پہ لہراتی تھی
عود و عنبر کی مہک دشت میں آجاتی تھی

آمد: بند ۲۷

پہنچے اس شان سے رن میں جو شہِ عرش نشیں
مورچے اپنے جمانے لگے بڑھ بڑھ کے لعیں
غل ہوا جنگ کے باجوں کا ہر اک صف کے قریں
آگئی گھوڑوں کی ٹاپوں سے تزلزل میں زمیں
تافلک فوج کے نیزوں کی چمک جانے لگی
جھوم کر شام کے لشکر کی گھٹا آنے لگی

بانیٔ شر چلّوں سے تیر ملانے لگے، فاتحِ خندق و خیبر کے وارث نے خشمگیں ہوکر قبضے پر نظر کی، نیام سے تڑپتی ہوئی ذوالفقار نکل پڑی۔

رزمیہ شاعری کی ایک جھلک

اس عہد میں رزمیہ شاعری مرثیے کے قوام میں شامل ہوچکی تھی، اس لیے مرثیوں میں معرکۂ کارزار کی جھلکیاں بھی ملیں گی اور رہوار و تلوار کی خوبیاں بھی۔

بند ۴۷

ہوگیا تیغ کے کھنچتے ہی تلاطم برپا ۔ مورچے تھے نہ وہ جنگی نہ سواروں کا پرا
ڈر سے تربتر ہوا وہ غول یہ بھاگا وہ گرا ۔ کیسے باجے کسی ظالم☆ کے نہ تھے ہوش بجا
سر نہ اٹھتے تھے یہ نوبت تھی علم داروں کی
بند تھی خوف سے آواز بھی نقاروں کی

ڈھل ڈھل کے ڈھل بھی چپ ہوگئے تھے، رزم گاہ میں قرنا بھی پھک کے رہ گئی تھی۔ جلا جل ہاتھ جوڑ کر خاموش ہوگئے تھے۔ لشکریوں میں ہلچل مچ گئی، شمشیرِ شرربار کبھی اس پار چمکی کبھی اُس پار چلی، دمِ پیکار ذوالفقار نے جس ظالم خوں خوار پر نظر ڈالی، وہ

☆ انیسؔ مرحوم کا مصرع ملحوظِ خاطر ہے:
"کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش"

اس کا شکار ہوگیا جس پر حضرت کے دو ہاتھ چلے وہ چار ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ:

بند ۷۹

ضربِ شمشیر سے رن میں کوئی دشمن نہ بچا
کیا غضب منہ کی کڑی تھی کبھی جوشن نہ بچا
تن میں بکتر نہ بچا مغفرِ آہن نہ بچا
ذکرِ مغفر کا بھلا کیا ہے کہ توسن نہ بچا
بڑھ کے توسن سے جو وہ خاک میں در آتی تھی
ہٹ کے دو چار قدم موت بھی تھراتی تھی

رئیسؔ کی قادر الکلامی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ فنونِ جنگ سے وہ واقف تھے، اسلحۂ جنگ اور اُن کی کارکردگی کا انھیں بخوبی علم تھا۔ بیت لاجواب ہے جس میں تخیل کی جولانی بھی ہے اور طبیعت کی روانی بھی، زبان اور اندازِ بیان لائقِ ستائش ہے۔

بند ۸۰

حشر برپا تھا عجب چال تھی آفت اس کی
خون ہوجاتے تھے دل دیکھ کے صورت اس کی
وہ لگاوٹ وہ حرارت وہ شرارت اس کی
وہ چھریرا بدن اور صاف وہ رنگت اُس کی
اس طرح قہر کے فتنے نہ اٹھائے ہوں گے
یہ کرشمے کبھی لیلیٰ نے نہ پائے ہوں گے

اس کی چال نے قیامت کے چلن دکھلائے، لشکریوں کے سر و تن گرم زمین پر لوٹتے نظر آئے، ایسی سفاک تھی کہ دم بھر میں پرے کے پرے صاف کردیے، دشتِ بلاخیز میں تاحدِ نظر خون کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

تیغِ شرر بار چمک میں برش اور صفائی میں بے مثل تھی جو صفیں سامنے تھیں وہ خون میں نہا گئیں، کہیں کمانوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، کہیں تیغیں بیکار تھیں، نہ تو

اسوار باقی رہے نہ پیدل۔

لشکرِ ستم کے رایت خون میں غلطاں نظر آتے، دشتِ کربلا موت کا بازار تھا، ہر طرف اللہ کا غضب محیط و آشکار تھا، روم و شام کے پرے کوفے تک پہنچ گئے تھے، امامِ زمانہ تیغ ید اللہ کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اتنے میں:

بند ۸۸

غل ہوا فوج میں یا سیدِ ابرار اماں
دم لبوں پر ہیں بس اب روکیے تیغ ذو زباں
آئی پہلو سے یہ آواز رسولؐ دو جہاں
واہ کس حسن سے کی جنگ و جدل اے مری جاں
زور حیدرؑ کا ہر اک ضرب میں دکھلایا ہے
روک لو ہاتھ کہ اب عصر کا وقت آیا ہے

یہ سنتے ہی امام علیہ السلام نے تیغ دو دم نیام میں رکھ لی اور لشکریوں کو صدا دی کہ ہم نے ہاتھ روک لیا۔ پہ ظلم و ستم شوق سے قتل کے لیے آئے، وعدۂ طفلی کے ایفا کا وقت آ گیا، تہِ شمشیر ہم کو سجدۂ حق ادا کرنا ہے۔

بین

بین مرثیے کی بنیادی غایت ہے۔ ہر محبِ اہلِ بیت کی تمنا ہوتی ہے کہ غمِ حسینؑ میں آنکھیں اشک بار ہو جائیں مالِ مجلس حاصل ہو جائے۔

امامِ مظلوم نے جب تلوار روک لی تو بھاگے ہوئے دشمن واپس آ گئے۔ تیغ و تبر اور نیزوں سے اُن پر وار کرنے لگے یہاں تک کہ جسم اقدس زخموں سے چور ہو گیا، زرہ کی طرح سینہ چھنا ہوا تھا، غش کی حالت میں امام علیہ السلام زمین پر تشریف لائے، شمر ذی الجوشن بڑھا، بے ادبی کی، حلقِ شاہ پر خنجر رکھا سر و تن میں جدائی ہو گئی مقتل کی زمین متزلزل ہو گئی، آسماں کانپ گیا۔

بند ۱۱۱

خاک اڑانے کا یہ ہنگام ہے اے اہلِ عزا | لوٹنے خیمۂ سرور میں دھنسے ہیں اعدا
شور بیداد ہے کرتے ہیں ستم اہلِ جفا | ہر طرف آگ بھڑکتی ہے قیامت ہے بپا
بچے سہمے ہوئے بادیدۂ نم نکلے ہیں
منھ چھپائے ہوئے بالوں سے حرم نکلے ہیں

”سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا“

یہ سچ ہے کہ رئیسؔ مرحوم نے چند مرثیے لکھے ہیں لیکن وہ فن مرثیہ گوئی سے بخوبی واقف تھے، ان کے مرثیوں کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ خوش بیان بھی تھے اور شیریں زبان بھی۔ ان کا یہ کہنا بھی صداقت پر مبنی ہے کہ:

طرزِ بندش میں کسی غیر کی تقلید نہیں
صاف ہر بند ہے گنجلک نہیں تعقید نہیں

۶۔ ریاضؔ، سیّد ریاض الدین حسن

سیّد ریاض الدین کے مورث سیّد شرف الدین موانہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے عظیم الشان مکان کا نام ”دربار“ تھا۔ ریاضؔ کے والد بزرگوار سیّد جلال الدین حیدر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں میرٹھ میں کوتوال تھے۔ اپنے قرب و جوار کے بڑے نام ور رئیس تھے، متعدد مواضع اُن کی زمیں داری میں تھے۔

۱۸۷۲ء میں ریاض الدین محکمۂ کمسریٹ (سپلائی) میں گماشتے کی حیثیت سے سیتاپور میں مقیم تھے۔ انیسؔ مرحوم سے اُن کو تلمذِ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا شرف حاصل تھا۔ مشہور ہے کہ نوچندی جمعرات کی مجلس پڑھنے کے لیے جناب انیس لکھنؤ سے سیتاپور جب تشریف لے جاتے تھے تو پالکیوں کی ڈاک صاحبِ موصوف کے لیے لگا دی جاتی تھی۔

ریاض الدین کے دوسرے بھائی سیّد تجمل حسین عرصے تک انسپکٹر پولیس رہے۔

بعد ازاں نائب تحصیل دار ہو گئے تھے۔ پنشن لے کر ۱۹۱۱ء تک زندہ رہے۔ رئیس ہونے کی وجہ سے وہ گورنر جنرل اور گورنر کے درباری تھے۔

ریاض کے تیسرے بھائی سید فیاض حسین بھی ۱۸۹۶ء تک پولیس انسپکٹر رہے، پنشن لینے کے بعد وہ آنریری مجسٹریٹ اور اس کے بعد لائف مجسٹریٹ ہوگئے۔ جناب نفیس سے اُن کو مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں شرف تلمذ تھا۔ ۱۹۲۷ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

اُن کے سب سے چھوٹے بھائی سید خورشید حسین میونسپل بورڈ کیرانہ (ضلع مظفرنگر) میں سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ ریاض الدین کے بیٹے ناصر الدین سب انسپکٹر پولیس تھے، چند ریاستوں میں سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی رہے۔

داروغہ سید سلطان[☆۱] حسین صاحب زیدی ناقل ہیں کہ انھوں نے سید ناصرالدین کے پاس ایک مرثیہ دیکھا تھا جس پر انیس مرحوم کی اصلاح تھی اور صاحبِ موصوف نے ایک مصرع پر "ابھی" کے قافیے پر تحریر فرمایا تھا کہ "میر صاحب یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔"

بند ملاحظہ ہو:

شور ہے[☆۲] بازوئے فرزندِ نبیؐ آتا ہے — امتحاں ہوں گے دلیروں کے جری آتا ہے
زخم شمشیر بہیں گے کہ تخی آتا ہے — پیک کہتے ہیں نہیں دیر، ابھی آتا ہے
کھینچ لو میان سے تیغوں کو خبردار رہو
شیر آتا ہے ذرا گھاٹ سے ہشیار رہو

"سادات بارہہ نے تقریباً دو درجن معروف شعرا پیدا کیے ہیں جن میں میر ریاض الدین ریاض سب سے زیادہ اہم ہیں، کیوں کہ وہ براہ راست میر انیس کے

☆۱۔ داروغہ سید سلطان حسین صاحب زیدی اس خاندان کے معمر ترین بزرگ ہیں، صاحبِ موصوف نے مجھ پر شفقت فرما کر سید ریاض الدین مرحوم کے حالات زندگی مرحمت فرمائے اور اپنے بزرگوں کا شجرۂ نسب بھی عطا فرمایا اس کرم فرمائی کے لیے محترم داروغہ صاحب کا شکر گزار ہوں۔

☆۲۔ اس مرثیے کا مطلع ہے، جو ہر تیغ سخن ذہنِ رسا ہے میرا۔ (بند ۱۳)

شاگرد تھے، غدر سے قبل کمسریٹ کے محکمے میں ملازم اور سیتاپور میں متعین تھے، ہر جمعرات کو مجلس کرتے تھے اور عموماً گاہے گاہے میر انیسؔ سے پڑھواتے تھے، غدر کے بعد اپنے وطن واپس پہنچ گئے تھے۔ نہایت زود گو اور قادر الکلام شاعر تھے، تقریباً ڈیڑھ سو مرثیے تصنیف کیے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی، قصبہ موانہ ضلع میرٹھ میں مدفون ہیں۔☆

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین صاحب زیدی نے ریاض الدین مرحوم کے حسب ذیل مراثی کی نشان دہی فرمائی:

۱۔ جس دم لوائے مہرِ منور ہوا عیاں
۲۔ خلد کو فوجِ حسینی کا نشاں جاتا ہے
۳۔ جس وقت صبح غازۂ روئے فلک ہوئی
۴۔ تلمیذِ نغز گوئے عدیم النظیر ہوں
۵۔ مداح کو ثنائے بہشتی کی چاہ ہے
۶۔ جب تُرکِ آسماں نے علم کی حسامِ زر
۷۔ یعقوبِ کربلا کا جو یوسفؑ جدا ہوا
۸۔ عاشور کی سحر ہوئی جب رن میں جلوہ گر
۹۔ جب دشتِ کربلائے معلّیٰ جناں ہوا
۱۰۔ مطلع ہے ایک ذہنِ رسا تیرین کا
۱۱۔ سر کرچکے جو نذر نمازی جہاد میں
۱۲۔ حسنِ رخِ عروسِ سخن آفتاب ہے
۱۳۔ برجِ شرف سے جب شہِ خاور عیاں ہوا
۱۴۔ ہاں اے زبانِ کلک مسیحا کا کام کر
۱۵۔ جب نہر پہ حسینؑ کا ٹھنڈا علم ہوا

☆ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین صاحب زیدی، گرامی نامہ مؤرخہ ۲۵ جون ۱۹۷۴ء

۱۶۔ شفق کشا فلک پہ ہوا جب نشانِ مہر

۱۷۔ جوہر تیغ سخن ذہنِ رسا ہے میرا

۱۸۔ آئینۂ اقرار کو ایفا سے جلا ہے

۱۹۔ کس بہشتی کی رن میں آمد ہے

ریاضؔ مرحوم کے مراثی اب تک غیر مطبوعہ ہیں، اس لیے ان کے چند مرثیوں سے (جو دستیاب ہو سکے ہیں) منتخب بند نقل کیے جاتے ہیں تاکہ قارئین اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں سے واقف ہو سکیں۔ ان کے پہلے مرثیے[☆۱] کا بند یہ ہے:

جوہرِ تیغِ سخن ذہنِ رسا ہے میرا حامی و مرتبہ داں سیفِ خدا ہے میرا
داغ سے پاک مہِ نظمِ ثنا ہے میرا وہ رقم ہے کہ عطارد[☆۲] بھی گدا ہے میرا
خلد ہے جس کا صلہ یہ وہ ثنا خوانی ہے
نظمِ اوّل ہے فصاحت میں یہ لاثانی ہے

انیسؔ جیسے باکمال استاد کی اصلاح نے ریاضؔ کے ذوقِ سخن کو خوب نکھارا۔ چھٹا مصرع اس امر کی گواہی دیتا ہے۔

انیسؔ مرحوم اور ان کے ہم عصر اہلِ خاندان سے ریاضؔ نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں فرمایا ہے۔

بند ۳

ان سے رکھتا ہے عقیدہ کہ جو ہیں نظم کے شاہ دھوم کونین میں ہے جن کے سخن کی واللہ
نکتہ داں فیض رساں شاعرِ باعزت و جاہ نظم پر جن کی فصاحت بھی بلاغت بھی گواہ
تاج ور جن کو فصیحانِ جہاں مانتے ہیں
خاص بھی عام بھی عالم میں انھیں جانتے ہیں

☆۱۔ اس مرثیے میں ۱۱۳ بند ہیں۔
سیّد علی امیر زیدی نے یہ مجھے عنایت فرمایا اس مہربانی کے لیے صاحبِ موصوف کا شکر گزار ہوں۔

☆۲۔ عطارد ع، مذکر دوسرے آسمان پر ایک ستارہ جسے دبیرِ فلک، اور منشی فلک کہتے ہیں، علم و عقل کا اس سے تعلق ہے۔

بند۴

ہے بجا ملکِ سخن کا جو کہوں ان کو رئیسؔ☆[1]

ہیں فصاحت سے بھرے جن کے مضامینِ سلیسؔ☆[2]

نام ہے شہرۂ آفاق تخلص ہے انیسؔ

آپ بھی صاحبِ اخلاق ہیں بیٹا بھی نفیسؔ☆[3]

نظم اک لطف اسی گھر سے سدا پاتی ہے

شاعری ان کی تو پشتوں سے چلی آتی ہے

بند۵

بھائی وہ جن سے ہوا نامِ فصاحت روشن

اُنسؔ☆[4] ہے جن سے بلاغت کو بھی ہنگامِ سخن

مونسِؔ☆[5] شاہِ طلاقت ہیں بصد وجہِ حسنؔ☆[6]

صاحبِ خلقؔ☆[7] رئیس الشعرا مستحسنؔ☆[8]

دل سے مداحِ ولی ابنِ ولی ہیں یہ سب

رونقِ بزمِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں یہ سب

ریاضؔ نے یہ مرثیہ حضرتِ عباسؑ کے حال میں لکھا ہے۔ میدانِ کارزار میں اُن کی آمد سے زلزلہ آگیا۔ ان کی ہیبت سے عطارد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر پڑا۔ عقدِ ثریا کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا، اسدِ چرخ پر لرزے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اللہ رے

☆۱۔ صنعتِ ایہام، میر محمد عسکری رئیسؔ خلف و شاگرد میر ببر علی انیسؔ

☆۲۔ صنعتِ ایہام، میر محمد سلیسؔ، خلف و شاگرد میر ببر علی انیسؔ

☆۳۔ صنعتِ ایہام، میر خورشید علی نفیسؔ، خلف و شاگرد میر ببر علی انیسؔ

☆۴۔ صنعتِ ایہام، میر ببر علی اُنسؔ، خلف و شاگرد میر خلیقؔ

☆۵۔ صنعتِ ایہام، میر نواب علی مونسؔ خلیقؔ کے بیٹے ان کے اور میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔

☆۶۔ صنعتِ ایہام، میر غلام حسن حسنؔ، میر انیسؔ کے دادا مرحوم

☆۷۔ صنعتِ ایہام، خلیقؔ، خلف اکبر میر حسن مرحوم

☆۸۔ صنعتِ ایہام، میر مستحسن خلیقؔ، انیسؔ مرحوم کے پدرِ بزرگوار۔

رعب و داب کیوں نہ ہو "شیرِ خدا" کے شیر جو ہوئے۔

بند ۹

جی چراتا ہے فلک خوف سے اونچا ہوکر   پھول پروین کے گرے پڑتے ہیں کانٹا ہوکر
زہرہ زُہرہ کا بہا جاتا ہے دریا ہوکر   رنگِ مہتاب اڑا ہے پرِ عنقا ہوکر
شورِ آمد خرد و ہوشِ فلک کھوتا ہے
قطب جنبش میں ہے اب دیکھیے کیا ہے

بند ۱۰

گلشنِ عالمِ ایجاد پہ آئی ہے خزاں
دم بخود لہریں ہیں نہروں میں ہے اک خوف عیاں
دلِ لالہ ہے لہو نرگسِ شہلا حیراں
زعفراں زرد ہے نیلا ہے گلِ نافرماں☆۱
پھول مرجھاتے ہیں جانوں کے زبس لالے ہیں
خوف سے ڈالیاں ہر نخل کی تھرڈالے ہیں

بند ۱۱

خشک دہشت سے ہوئے ہیں لبِ دریا یکسر
موجیں ٹکراتی☆۲ ہیں ساحل سے سر اپنا آکر
گرچہ گرداب برابر ہیں بنے شکلِ سپر
دل نہنگوں کے غضب کانپتے ہیں ڈر سے مگر☆۳
عیش و آرام کے دن مچھلیوں کو بھولے ہیں
ہے یہ ہیبت کہ حبابوں کے بھی دم پھولے ہیں

☆۱۔ گلِ نافرماں (ف) اُودے رنگ کا ایک پھول
☆۲۔ ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی (انیس مرحوم کا مصرع ہے)
☆۳۔ تہ میں تھے گو نہنگ مگر کانپتے تھے سب (انیس مرحوم کا مصرع ہے)

مندرجہ بالا تینوں بند نہایت مرصع ہیں۔ حضرت عباسؑ کی آمد سے رن کی جو کیفیت ہوگئی ریاض نے اس کی کامیاب مرقع کشی کی ہے، الفاظ کا انتخاب لاجواب ہے محاورہ بندی اور صنائع بدائع کے استعمال سے شاعر نے رزم گاہ کا ماحول پیدا کردیا، وحشت کے سبب اژدر غار سے باہر نہیں نکلتے، سیمرغ اپنے پر سمیٹے ہوئے گوشے میں بیٹھا ہے، باز چلا رہے ہیں کہ شہبازِ اجل آپہنچا۔ شیر گھبرائے ہوئے ہر طرف نظر آرہے ہیں، حضرت عباسؑ کی شمشیر کے ڈر سے لشکری سپرو آہن میں اپنا منھ چھپائے ہوئے ہیں، ہر فولادی خنجر کا دم بند ہے۔ سرِ رُستم کو دیکھ کر اس پر فریادی کا دھوکا ہوتا ہے، عباسؑ علم دار کی آمد کا غلغلہ ہے اس لیے افواجِ اعدا میں زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں۔

مصوری، بند ۱۵

مورچے بندھتے ہیں لشکر میں صف آرائی ہے
دشت میں ڈھالوں سے گھنگور گھٹا چھائی ہے
تنِ اعدا میں نہ طاقت نہ توانائی ہے
خندقیں کھودی ہیں لڑنے کی قسم کھائی ہے
رنگِ رخ ڈر سے ہے کافور ہر اک ناری کا
مشورہ ہوتا ہے ضیغم کی گرفتاری کا

رزمیہ شاعری میں مجاہدین کی شمشیرِ براں اور اس کے سبک رفتار رہوار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، شاعر کی جولانیٔ طبع کے لیے یہ میدان نہایت وسیع ہے شمس وقمر کی تسخیر کا بھی وہ خواہش مند ہوتا ہے اور تحت الثریٰ کے اسرار سے بھی واقف ہوتا ہے، حضرت عباسؑ جب عازمِ کارزار ہوئے تو اُن کا رہوار بھی بڑی سرعت کے ساتھ روانہ ہوا، یہ کیفیت شاعر کی زبان سے سنیے۔

زبان، بند ۳۴

اسپِ عباسؑ سے حیراں تھے ملک گردوں پر — پر نہ تھے اڑتا تھا شہباز سے بھی تیزیہ پر
علمِ شیر کا پڑتا تھا جو سایہ سر پر — تازیانہ تھا اسے اڑتا تھا ہر جا جم کر

دشتِ جنگاہ کو کوتاہ جو وہ پاتا تھا!
اڑ کے گردوں کی طرف صاف چلا جاتا ہے

تینوں مصرعوں میں شاعر نے "پر" مختلف معنی میں استعمال کیا ہے اور زبان پر اپنی فن کارانہ قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ حضرت عباس (علم دار لشکر) کے علم کا جب پھریرا کھلا تو اس کا سایہ رخش سبک رفتار کے سر پر پڑا اور اس نے تازیانے کا کام انجام دیا، اللہ ری تخیل کی رفعت۔

ریاضؔ خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، انیسؔ مرحوم کی صحبت اور اصلاح نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

تلوار کی تعریف میں چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

بند ۶۸

ناگہاں تیغ چلی اڑنے لگے سر ہر سو   گر کے بہنے لگا دریا کی طرح رن میں لہو
دھڑ سے گرنے لگے مر مر کے ہر اک سمت عدو   فرق بہنے لگے جس طرح حباب لبِ جو
ملک الموت نے گردن لی ہر اک ناری کی
قعرِ دوزخ کی سیہ کاروں نے تیاری کی

بند ۶۹

بادِ صرصر کی طرح تیغ چلی جب سَن سَن   ہوگیا صرفِ خزاں عمرِ عدو کا گلشن
خون پی پی کے ہوا اور ہی اس کا جوبن   ڈس کے لہراتی ہے جس طرح سے کالی ناگن
جان بچنے کی نہیں سب کو گماں ہوتا تھا
سم چھلک آیا ہے جوہر سے عیاں ہوتا تھا

لطفِ زبان انداز بیان، محاوروں کی چاشنی، تخیل کی رعنائی، صنائع و بدائع کی آمیزش قابلِ صد تحسین ہے۔

حضرت عباسؑ علم بردار کی شمشیرِ آب دار نے میدانِ کارزار میں دشمنوں کے

دانت کھٹے کر دیے تھے، خون پی پی کے اس کی زبان اور دراز ہوگئی تھی، وہ اپنے آپ کو اجل کی دم ساز سمجھنے لگی تھی۔

بند ۷۰

تیغِ عباس سے میداں میں کھلے کیا کیا گل
پھول ڈھالوں کے اڑے برچھیوں کے پھل بالکل
نالۂ زاغ کماں تھا نہ فغانِ بلبل
ہوگئے دم میں چراغِ خردِ لشکر گل
ڈھالیں پتوں کی طرح رن میں اڑی پھرتی تھیں
برچھیاں شاخِ بریدہ کی طرح گرتی تھیں

ڈھالوں کی تشبیہ پتوں سے، اور برچھیوں کی تشبیہ شاخِ بریدہ سے کس قدر معنویت سے بھرپور ہے، تیغ کا اشارہ قہر تھا۔ اس کی لگاوٹ بلا تھی، اعدا سے گلے مل کر وہ خوش ہوتی تھی۔

بند ۷۶

کس قدر حسن تھے شمشیرِ دلاور میں بہم — بانکپن، ناز و ادا، جوہرِ ذاتی دم خم
نازک اندام، جلادار مگر برق کا دم — صاعقہ کیش، جفاکار ولے نیک شیم
برق کی طرح ہر اک غول پہ وہ گرتی تھی
اپنے مالک کے مگر گرد سدا پھرتی تھی

خط کشیدہ الفاظ صنعتِ تنسیق الصفات کی عمدہ مثالیں ہیں۔

زبان کے محاسن کے ضمن میں ایک اور بند نقل کیا جاتا ہے۔

بند ۸۲

کانپ جاتے تھے ہر اک آن زمیں کے جو طبق
دلِ قاروں پہ عجب ہوتا تھا صدمے سے قلق

کیا دھمک تھی کہ ہوئی گاوِ زمیں غرقِ عرق
رستم و گیو کے ہوتے تھے جگر قبر میں شق
شعلۂ تیغ جو چنگاریاں برساتے تھے
جن کا گھر قاف تھا وہ جن بھی جلے جاتے تھے

تلمیحات، تشبیہات، لطفِ زبان، زورِ بیان کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ مرثیہ جملہ اصنافِ سخن پر حاوی ہے جس میں غزل کی رمزیت بھی ہے اور رنگِ تغزل کی گل کاریاں بھی۔

ہر صنفِ سخن کے لیے ایک خاص اسلوبِ بیان ہوتا ہے اور اس کی مناسبت سے زبان کی (اسلوب سے) ہم آہنگی بھی۔ غزل کا بھی ایک خاص مزاج ہوتا ہے جس کا بنیادی عنصر محبت ہے، اس کی رسوم و قیود کی پابندی کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔

اس ضمن میں ریاضؔ کے مذکورہ بالا مرثیے سے دو بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں رنگِ تغزل نمایاں ہے۔

بند ۴۳

وصف کاکل میں بڑا پیچ پڑا ہے اس دم	موشگافی کے تردد میں سرِ فکر ہے خم
عقدہ مشکل ہے یہی ذہنِ رسا کی ہے قسم	رات تاریک ہے ہر بار الجھتا ہے قلم
سو طرح عقدہ کشا ذہنِ رسا ہوئے گا
قطع امید ہے عقدہ نہ یہ وا ہوئے گا

بند ۴۴

قدِ پرنور ہے شمشادِ گلستانِ وفا	سرو گل زار ہے اک بندۂ آزاد اس کا
عشقِ شمشاد جو قمری کو کیا حق نے عطا	ہے یہی وجہ کہ اس قد سے مشابہ ہے ذرا
یاد اس قد کی فراموش نہیں ہوتی ہے
شور کوکو سے عیاں ہے کہ سدا روتی ہے

غزل کی ایک آن ہوتی ہے، ایمائیت و اشاریت اس کی شان ہے، محبت اس کی جان ہے، ان پابندیوں اور تغزل کے تقاضوں کو ریاضؔ نے مرثیے میں اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ اس کا وقار مجروح نہیں ہوا، اسے کہتے ہیں فن کارانہ صلاحیت۔

ریاضؔ کے ایک مرثیے☆ کا مطلع ہے "آئینۂ اقرار کو ایفا سے جلا ہے" اس کا موضوع وفا ہے، وفا ایک ایسی صفت ہے جو انسان کے لیے نہایت اہم ہے، ابنائے زمانہ اس سے عاری ہیں، اسی لیے غالبؔ نے یہاں تک کہہ دیا، " ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا"

لیکن اخلاقی اور مذہبی اقدار میں صفتِ وفا کو بہت سراہا گیا ہے۔

وفا سے چمنِ عہد تر و تازہ رہتا ہے، انہارِ صفا سے چمنِ عہد شاداب رہتا ہے، ایفا کی ہوا سے چمنِ عہد کھل جاتا ہے، شاعر کی زبان سے سنیے۔

بند ۴

لازم ہے بشر کے لیے پابندیِ اقرار — سر جائے، رہے وعدہ وفائی سے سروکار
گھر ہو کہ سفرِ دشت ہو یا دامنِ کہسار — ہر وقت سر و دوش پہ ایفا کا رہے بار
بیداری میں، رؤیا میں کبھی چین نہ پائے
جب آنکھ کھلے خواب میں وعدہ نظر آئے

بند ۵

تسلیم ہے یہ سب کو وفا سخت ہے مشکل — روشن ہے کہ تسلیم و رضا سخت ہے مشکل
اس مہر سے حاصل ہو ضیا سخت ہے مشکل — بے شک سفرِ راہِ خدا سخت ہے مشکل
یاں توسنِ ادراک رواں ہوتے ہی پے ہو
شبیرؑ سا سالک ہو تو یہ مرحلہ طے ہو

☆ سیّد علی امیر صاحب زیدی سے یہ مرثیہ بھی دستیاب ہوا، اس نوازش کے لیے صاحب موصوف کا میں شکرگزار ہوں مرثیہ مذکورہ کے دو جزو ہیں پہلے جزو میں سیّد الشہدا کی شہادت کا اور دوسرے میں حرم کی اسیری کا بیان ہے جس کا مطلع ہے "اے سرمۂ غم دیدہ ماتم کو جلا دے" اس مرثیے کے جزو دو میں ۱۳۲ بند ہیں۔

چہرے کے پانچ بند ہیں جن میں ایفائے وعدہ کی اہمیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے، بعد ازاں حسبِ ذیل دو بند میں تعلّی ہے۔

بند ۶

اے ذہنِ رسا تا بہ فلک نظم رسا ہو — ہاں کاکلِ مضموں کا ذرا عقدہ کشا ہو
اے طبع جو وعدہ تھا ترا آج وفا ہو — ہر بند کی بندش ہو جدا، رنگ جدا ہو
اک شورِ درود آج اٹھے چار طرف سے
وہ نظم بیاں کر جو سنی ہو نہ سلف سے

بند ۷

ہے مجمعِ اہلِ خرد، ذہنِ خداداد — وہ بھی ہیں سمجھتے ہیں جو کچھ آپ کو استاد
امداد کا خواہاں نہیں پر چاہتا ہوں داد — انصاف سے بندش کی صفائی پہ کریں صاد
سن لیں کوئی مضمون شنیدہ نہیں کہتا
میں مرثیہ کہتا ہوں قصیدہ نہیں کہتا

امام حسینؑ نے طفلی میں جو وعدہ فرمایا تھا، اس کا ایفا ان پر فرض تھا، اس میں کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ:

بند ۱۲

یوں تو ہوا ہر وعدہ ادا صبر و رضا سے — ہرگز نہ ڈگے پاؤں کبھی راہِ وفا سے
دو عہد مگر سخت ہوئے شاہِ ہدا سے — اک وعدہ تو شیرین سے اور اک عہد خدا سے
پر فضلِ الٰہی سے ادا ہوگئے دونوں
اک فرقِ مبارک سے ادا ہوگئے دونوں

رخصت

جب امام علیہ السلام اہلِ بیتؑ سے رخصت طلب ہوئے تو آپ نے:
"مڑ کر کہا بہنوں سے کہ اب جایئے گھر میں"

میں طفلی کا وعدہ وفا کرنے کے لیے جا رہا ہوں، اس وقت ڈیوڑھی پر اُداسی برس رہی تھی کوئی نہ تھا جو رکابِ توسن تھامتا، اس لیے آپ نے اسپِ باوفا سے دریافت فرمایا:

وہ دوست وہ احباب وہ انصار کہاں ہیں
اے اسپ بتا تیرے جلودار کہاں ہیں

بیت میں غضب کی بے کسی اور بے چارگی ہے، اعزہ اور رفقا کی یادِ امامِ مظلوم کے دل کو کس قدر تڑپا رہی ہے۔

بند ۴۵

بتلا تو پکارے کسے یہ بے کس و ناچار　　جو تھامے رکاب آ کے تری اے مرے رہوار
قاسم ہے نہ اکبر ہے نہ عباسِ علم دار　　سب مر گئے کوئی نہیں اب مونس و غم خوار
وہ کھیت میں لشکر مرا مذبوح پڑا ہے
تنہا پسرِ صاحبِ معراج کھڑا ہے

یہ منظر اس قدر دل خراش و رقت خیز تھا کہ:

"تنہائی پہ شبدیز کی رونے لگا توسن"

لیکن لشکریوں کا دل نہ پسیجا، اللہ ری شقاوتِ قلبی۔

ریاضؔ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اسے پوری توجہ کے ساتھ پیشِ نظر رکھا۔ اسی وجہ سے تسلسل قائم رہا، امامِ عالی مقام عازمِ جنگاہ ہیں، سمندِ صبا دم عجب انداز سے قدم اٹھا رہا ہے، اس کی چال دیکھ کر آہوئے ارم حیرت میں ہیں، اس موقع پر شاعر کے ذہن میں ایک نیا مضمون آیا۔

"ہاں وعدہ وفائی کی یہ تمثیل ہے مجسم"

سلطانِ زمن سالکِ راہِ خدا ہیں، اس پے خالقِ اکبر نے پیکرِ وفا میں جان ڈال دی ہے، اللہ ری تخیل کی رسائی۔

شہدائے کربلا کی وفا ضرب المثل ہوگئی۔

"آقا سے پسِ مرگ بھی اک اک نے وفا کی"

آقا کی شہادت سے قبل وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے، یہ ہے وفا کی معراج، اتمامِ حجت کے بعد امام حسینؑ نے تیغِ علم کی، صاعقۂ شعلہ فگن کی آنچ سے خوف زدہ ہو کر ستم ایجاد جھجکے لشکر میں ہلچل مچ گئی، رن کی زمین ہل گئی اور صفیں درہم برہم ہو گئیں۔

رزمیہ شاعری کی ایک جھلک

بند ۸۲

بجلی کی طرح تیغ گری فوج پہ اک بار　　سر گر گئے دھڑ سے، شجرِ قد ہوئے بے بار
گرنے لگے چھن چھن تبر و خود گراں بار　　دو سمت تنوں اور سروں کے ہوئے انبار
حاصل تھا اثر زہر کا شمشیر کے پھل کو
تھا اس کی معیت میں فقط یار اجل کو

بند ۸۶

مغفر پہ جو پہنچی تو صفائی ہوئی سر کی　　گردن لی اجل نے جو ذرا فرق سے سرکی
تھا شور کہ کس طرح بچے جان بشر کی　　ہے قبضۂ فرزند میں شمشیر پدر کی
تھا گھاٹ نیا باڑھ نیا آمد و شد میں
پایا تھا علیؑ نے یہ صلہ جنگِ احد☆ میں

بند ۹۱

وہ صاعقہ کردار جو آتی تھی چمک کر　　بے زخم لگے گرتے تھے کفار جھجک کر
چلاتی تھی یہ گاو زمیں واں سے سرک کر　　کیا ضرب کڑی ہے کہ مجھے آگیا چکر
آنکھوں میں بہت دیر چکا چوند رہی ہے
یہ کون سی بجلی ہے جو اب کوند رہی ہے

ذوالفقار آتش مزاج بھی تھی اور صاعقہ کردار بھی، سرکش بھی اور زباں دراز بھی، جفا جو بھی اور قضا شیم بھی، لشکریوں کے جامۂ تن کے لیے وہ مقراض بن گئی تھی۔ اس لیے

☆ لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار کے نعرے سے میدانِ جنگ گونج اٹھا تھا۔

ہر طرف خون کے تھالے نظر آتے تھے اور لاشوں کے انبار، پرے کے پرے خالی ہوگئے، میدان صاف ہوگیا، سب مورچے پامال ہوگئے، اس وقت امامِ عالی مقام کو رحم آگیا، شمشیر کو روکا اور اعدا سے فرمایا:

"پھر آؤ کہ میں کرتا ہوں اب وعدہ وفائی"

یہ سنتے ہی شکست خوردہ دشمن پھر صف آرا ہوگئے، امامِ مظلوم پر قریب سے تیغ و تبر کے وار کرنے لگے جو دور تھے، وہ پتھر برسا رہے تھے۔

حضرت زینبؑ نے درِ خیمہ سے دریافت فرمایا کہ آپ نے تلوار کیوں روک لی۔ آپ کو کاہے کی فکر ہے۔

"فرماتے ہیں شہ وعدہ وفائی کی ہے اب فکر"

تاکہ نانا کی امت کو جہنم سے نجات مل جائے۔

دم بھر میں امامِ مظلوم کا جسمِ زار چور چور ہوگیا، زخموں کی تاب نہ لاسکے۔ زینِ فرس سے زمین پر تشریف لائے۔

شہادت

مرثیہ عموماً ہیرو کی شہادت پر ختم ہوتا ہے، اس مرثیے کے ہیرو سیدالشہدا ہیں۔

بند ۱۰۲

اے ماتمیو اشکِ الم رخ پہ بہاؤ — کیا بیٹھے ہو ماتم کے لیے ہاتھ اٹھاؤ
ہاں نالہ و فریاد کا اب شور مچاؤ — لو عصر کا ہنگام ہوا خاک اڑاؤ
ہیں زخم ہزاروں تنِ صد چاک کے اوپر
لو گھوڑے سے شبیرؑ گرے خاک کے اوپر

بند ۱۰۳

لو کھینچ کے خنجر کو چلا شمرِ جفاکار — لو سینۂ نازک پہ رکھا پائے گراں بار
لو بیٹھ گیا چھاتی کے اوپر ستم اطوار — لو چلنے لگا حلق پہ اب خنجرِ خوں خوار

تڑپے شہِ مظلوم غضب ہے نہ کل آئی
لو پیاس کی شدت سے زباں بھی نکل آئی

کس غضب کی مرقع کشی ہے پسرِ احمد مختارؐ کا سرتن سے جدا کردیا گیا، حشر کے آثار نمودار ہوئے، زمین کو تزلزل ہوا۔ سورج کو گہن لگ گیا، سیاہ آندھی چلی، آسمان سے خون برسا، اہلِ حرم اس خونیں منظر کی تاب نہ لا سکے اور خیمے سے کھلے سر نکل پڑے۔

بین

مرثیہ کے قوام میں بین کو ہمیشہ ایک لازمی جزو تسلیم کیا گیا ہے، ریاضؔ نے مرثیے کے اس جزو میں جذبات نگاری کا کمال دکھایا ہے، حضرت زینبؑ اور حضرت شہربانو کے تاثرات کی مرقع کشی کس غضب کی ہے۔

بند ۱۰۶

چلاتی ہے بھائی کی مرے لاش دکھاؤ کس غار میں سر کاٹا ہے سیّد کا بتاؤ
خالق کے لیے رحم نبیؐ زادی پہ کھاؤ سر ننگے ہوں اللہ اُدھر منہ کو پھراؤ
ڈالو نہ نظر خواہرِ سلطانِ زمن پر
پھٹ کر نہ کہیں عرش گرے فرش کہن پر

بند ۱۰۷

جاتی ہے یہ چلاتی ہوئی زینبِؑ مضطر ہم راہ ہیں سب اہلِ حرم کھولے ہوئے سر
گودی میں سکینہ کو لیے بانوئے بے پر کہتی ہوئی جاتی ہے کہ ہے ہے مرے سرور
پردیس میں یوں ساتھ مرا چھٹ گیا آقا
تم قتل ہوئے راج مرا لٹ گیا آقا

خوں چکاں واقعات کے تصور ہی سے کلیجا منہ کو آتا ہے، دل پاش پاش ہو جاتا ہے، رسولؐ کی آل پر یہ مظالم۔ "تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو" ہر مسلمان پر نبیؐ کی آل کا احترام واجب ہوتا ہے، حضرت زینبؑ نے خالق کا واسطہ بھی دیا اور متنبہ بھی فرمایا کہ

اے قومِ جفا شعار سلطانِ زمن کی ہمشیر پر ہرگز نظر نہ پڑنے پائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے مظالم کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑے اور تم سب...

حضرت زینبؑ افتاں و خیزاں اپنے بھائی کی لاش پر پہنچ ہی گئیں۔

بند ۱۱۳

لاشے پہ گری بنتِ علیؑ کھولے ہوئے سر　　کرنے لگے سب اہلِ حرم ماتمِ سرور
اوتادِ زمیں ہل گئے، برپا ہوا محشر　　چلائی یہ سر پیٹ کے ہر بے کس و مضطر
جنت میں زمانے سے ہمارے گئے وارث
ہم لٹ گئے پردیس میں، مارے گئے وارث

اہلِ بیت علیہم السلام کے دل خراش بین سے دشتِ نینوا کا ماحول مزید سوگ وار ہوگیا، اس وقت امامِ مظلوم کے سرِ بریدہ نے صبر کی تلقین فرمائی اور شکرِ خدا ادا کیا۔

بند ۱۱۴

لاشے نے صدا دی کہ بہن صبر کرو صبر　　آساں ہوں مصائب جو ذرا دل پہ کرو جبر
ہم کڑھتے ہیں اس طرح نہ روؤ صفتِ ابر　　کچھ غم نہیں ہم کو جو میسر نہ ہوئی قبر
فردوس میں موجود ہمارے لیے جا ہے
اک وعدہ وفا ہم سے ہوا شکرِ خدا ہے

مرثیے کے اجزائے ترکیبی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ریاضؔ موضوع (وفا) سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ مرثیے میں زبان کے محاسن بھی ہیں اور اسلوبِ بیان کی خوبیاں بھی گہر ہائے بے مثال کی ایک لڑی میں مرثیے کے تمام بند منسلک نظر آتے ہیں۔

ریاضؔ نے حضرت عباسؑ کے حال میں ایک مرثیہ کہا، جس میں ۱۴۰ بند ہیں۔

مرثیہ کا پہلا بند دیکھیے:

پہلا بند

کس بختی کی رن میں آمد ہے　　غرق، حیرت جو لشکرِ بد ہے

شور ہے اس کو جنگ کی کد ہے　　　اب جو سقائے آلِ احمدؐ ہے
صف شکن سوئے نہر آتا ہے
جوش پر بحرِ قہر آتا ہے

اس مرثیے کی نمایاں خصوصیات سلاست، روانی اور محاوروں کا برجستہ استعمال ہے، ایسے اقوال ہیں جو زندگی کے تجربات پر مبنی ہیں۔ اعلیٰ اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہونے کا درس ہے، چند ضرب الامثال اور محاورے نقل کیے جاتے ہیں۔

بند ۲

جان کے باغیوں کو لالے[☆۱] ہیں　　　ڈر نے سینوں میں داغ ڈالے ہیں
نخلِ ماتم کے بھالے والے ہیں　　　سب کماں دار دیکھے بھالے[☆۲] ہیں
صاحبِ سیف دم چراتے[☆۳] ہیں
اہلِ جوشن کڑی[☆۴] اٹھاتے ہیں

بند ۴

باغِ عالم اداس ہے ڈر سے　　　آنکھ نرگس کی لگ[☆۵] گئی ڈر سے
غش جو آیا ہے خوفِ صفدر سے　　　اٹھ نہیں سکتا سبزہ بستر سے
قمریوں کو ترانے بھولے ہیں
سرو کے پاؤں[☆۶] ڈر سے پھولے ہیں

چہرے کے چند بند نقل کیے گئے ہیں جو ہیبت ناک ماحول کی ترجمانی کر رہے ہیں "شیرِ خدا" کے شیر کی آمد ہے اس لیے گبر شعلے کی طرح کانپ رہے ہیں، مجوسیوں کو

☆۱۔ جان کے لالے ہونا/ پڑنا　　جینے کی امید باقی نہ رہنا
☆۲۔ جانے بوجھے
☆۳۔ دم چرانا، پہلو تہی کرنا، کنارہ کشی کرنا
☆۴۔ کڑی اٹھانا، مصیبتیں برداشت کرنا
☆۵۔ آنکھ لگ جانا، محبت ہوجانا، عشق ہوجانا
☆۶۔ پاؤں پھولنا، تھک جانا، عاجز آنا، گھبرا جانا

زندگی جبر ہوگئی ہے جوشن تنگ قبر بن گئے ہیں، گوزن و شیر و پلنگ خوف زدہ ہوکر بھاگ گئے، لشکریوں پر اضطراب کی کیفیت طاری ہے، دشتِ مصاف بھی کانپ رہا ہے، ڈر کی وجہ سے موجِ ساحل کے کنارے ہے، خیمۂ حیات کا بھی اوج مٹ گیا۔

شور ظاہر ہے بحر اور بر سے
نیزوں پانی☆[1] اتر گیا ڈر سے
(دسویں بند کی بیت ہے)

جذبات نگاری

مقامی رنگ کی ایک مثال

جب حضرت عباسؑ کو نہرِ فرات سے پانی لانے کی اجازت مل گئی تو ایک جاسوس نے یزیدی لشکر کو اطلاع دی کہ:

بند ۲۰

پا چکا اذنِ جنگ کا صفدر اہلِ بیتِ رسولؐ ہیں مضطر
تہ و بالا ہے خیمۂ اطہر پیٹتے ہیں صغیر رشکِ قمر
بنتِ شبیرؑ خاک☆[2] اڑاتی ہے
ایک سیدانی نتھ بڑھاتی ہے

یوم عاشور میدانِ جنگ میں جو مجاہد گیا، اس نے جامِ شہادت نوش کیا، اس لیے حضرت عباس کی زوجہ کو یقین تھا کہ ان کے شوہر زندہ واپس نہیں آئیں گے، انھوں نے نتھ بڑھائی کیوں کہ ان کا سہاگ بھی لٹ جائے گا۔

اس قسم کے رسم و رواج نظم کرنے سے مرثیے کے عرب کردار، ہمارے ملکی ماحول سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں، کردار نگاری اور فن کاری کا یہ بھی ثبوت ہے۔

☆۱۔ پانی اتر جانا، دریا کی طغیانی موقوف ہوجانا۔
☆۲۔ خاک اڑانا، غم و الم کی کیفیت کا اظہار کرنا،
میت کا سوگ کرنے کے لیے بھی خاک اڑاتے ہیں۔

آمد

حضرت عباسؑ کی آمد کی خبر سن کر یزیدی فوج گھبرا گئی، نہرِ فرات پر بڑے بڑے سورما متعین کیے گئے لیکن گھاٹ کا روکنا ان کے لیے وبالِ جان ہوگیا، پیدلوں کی قطار بھاگنے پر تیار تھی، سواروں پر شیر کا خوف سوار تھا، بخت نے کالے دن دکھائے تھے، اس لیے ناسیہ زُو سپر اٹھائے تھے۔

تمام لشکرِ زور منتشر تھا، اس تصور سے کہ نہر پر خندق کی لڑائی کا منظر دکھائی دے گا، اسد اللہ کا شیر، لاشوں کا پل بنائے گا اور خون کی ندیاں بہائے گا۔

حضرت عباسؑ کی آمد کا یہ اثر ہوا کہ:

بند ۲۷

آسماں خم پئے سلام ہے آج   ریگِ صحرا فلک مقام ہے آج
ارتفاعِ ضیا تمام ہے آج   ارض بھی عرشِ احتشام ہے آج
آبرو پر[۱] زمین مرتی ہے
گرد گردوں[۲] سے باتیں کرتی ہے

اس بند کا پہلا مصرع حسنِ تعلیل کی عمدہ مثال ہے، آج دشتِ نینوا کی قسمت جاگ گئی، فرشِ کربلا عرش پر سبقت لے گیا۔

رخش کی تعریف

رخش خوش قدم بھی تھا اور خوش لگام بھی۔ تیز رو بھی اور مشک فام بھی، سبک سیر بھی اور گل اندام بھی، شش جہت کا فاصلہ وہ دو گام میں طے کرلیتا۔

بند ۴۴

تن کے بن کی زمیں پہ چلتا تھا   دشتِ کیں تاپ سے دہلتا تھا

۱۔ آبرو پر مرنا، مرمٹنا، عزت و آبرو کے لیے جان دینا۔
۲۔ گردوں سے باتیں کرنا، بلند مرتبہ حاصل کرنا، آسمان تک رسائی ہوجانا۔

رشک سے ماہ[☆۱] ہاتھ ملتا تھا　　　اس کی سرعت پہ مہر[☆۲] جلتا تھا
پہنچا اس شکل سے وہ مقتل میں
جس طرح سے نظر تجنل[☆۳] میں

تلوار

رزمیہ شاعری میں رہوار اور تلوار کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔ تیغ براں رشکِ ہلال بھی تھی اور کوہ شگاف بھی، آبرو کے بحر میں بہتی تھی اور بہشتی کے بر میں رہتی تھی، تیغ بھی نایاب اور دستِ مبارک بھی لاجواب، وہ تیز وطرار بھی تھی اور صاعقہ کردار بھی۔

بند ۸۸

اس کا لوہا[☆۴] گئے تھے مان جو سب　　　ڈر کے کہتا تھا ہر عرب یارب
غرقِ حیرت ہوئے ہیں اہلِ حلب　　　روز تھا شامیوں کی آنکھ میں شب
فوج مصری بھی تلخ کام ہوئی
ترکی ترکوں[☆۵] کی سب تمام ہوئی

وہ شعلہ خو بھی تھی اور بلائے جہاں بھی، آفتِ دہر بھی تھی اور فتنۂ دوراں بھی، کبھی عیاں تھی اور کبھی نہاں، اس کی آب میں رنگِ خودنمائی اس کے خم سے ظاہر تھی اور صفائی۔

وہ آب بھی ہے اور آتش بھی، قہرِ حق بھی اور عتابِ حیدرؑ بھی۔ رن میں ثابت قدم بھی مضطر بھی، منکسر بھی اور کمال خودسر بھی، عدو سے بھی وہ رک کے نہیں ملتی تھی بلکہ اصالت کی وجہ سے وہ جھک کے ملتی تھی، وہ تیز خو بھی تھی اور جفا جو بھی، آن کی آن میں اس نے میدان کو مقتل بنا دیا، بے ایمان فوج نہر سے فرار ہوگئی، تمام نشان سرنگوں ہوگئے

☆۱۔ ہاتھ ملنا، کفِ افسوس ملنا، کنایتاً، رشک وحسد سے، افسوس کرنا۔
☆۲۔ جلنا، رشک کرنا۔
☆۳۔ تجنل (ع) آئینہ
☆۴۔ لوہا ماننا/ منوانا، کسی کی دلیری کا قائل ہونا۔
☆۵۔ ترکی تمام ہونا، ترکی تمام شدن کا ترجمہ ہے، گھمنڈ جاتا رہنا۔

حضرت عباسؑ نے مشکیزہ بھرلیا، انھیں یہی فکر دامن گیر تھی کہ کسی طرح پانی خیمے تک پہنچ جائے یک بیک ظلم کے بانی نہر پر آگئے، فوجِ لعین کی یورش دیکھ کر حضرت عباسؑ حملہ آور ہوئے، ساحل کی زمین خون سے تر ہوگئی، ان کا رخ خیمے کی طرف تھا، برچھیاں تانے ہوئے فوجِ عدو انھیں روک رہی تھی۔

بند ۱۱۸

ناگہاں غل ہوا کہ وائے ستم — لو ہوئے بازوئے ہژبر قلم
وہ چھدی مشک لو جھکا[☆۱] وہ علم — ڈگمگایا وہ زین پر ضیغم
باگ گھوڑے کی ہائے چھوٹ گئی
لو کمر شاہِ دیں کی ٹوٹ گئی

امامِ مظلوم نے اپنے بھائی کے جسم کو زخموں سے چور چور دیکھا تو وہ سر پیٹنے لگے، یک بیک حضرت عباسؑ کے پاؤں تھرائے اور منکا ڈھل گیا، اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا، ہائے زندگی کا چمن لٹ گیا، گور وکفن کی فکر کیسے کی جائے، یہ مجبوریاں ہیں اور وطن دور ہے۔

اس مرثیے[☆۲] کی زبان آسان ہے، ایجاز و اختصار اور سہلِ ممتنع کے بہت سے نادر نمونے ہیں، الفاظ میں خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اسی لیے کلام تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔

ریاضؔ نے ۱۱۶ بند کا ایک مرثیہ[☆۳] اہلِ بیت علیہم السلام کی اسیری کے بارے میں نظم کیا، اس کا پہلا بند پڑھتے ہی امام زین العابدین سیّد الساجدین بیمارِ کربلا کے مصائب کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

ہاں اے زبانِ کلکِ مسیحا کا کام کر — صحت ہو لفظ لفظ میں وہ اہتمام کر

☆۱۔ ایک نسخے میں "گرا" لکھا ہوا ہے۔
☆۲۔ مندرجہ بالا مرثیہ حسن عسکری صاحب ایڈووکیٹ کے بستے سے نقل کیا گیا صاحبِ موصوف کا شکرگزار ہوں۔
☆۳۔ یہ مرثیہ تائید فاطمہ دختر سیّد علی رہبر مرحوم کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے محترمہ کا میں شکرگزار ہوں۔

اے چشم، ماتمِ شہِ عالی مقام کر　　　عاجل شفا حصول ہو وہ انتظام کر

سجادِؑ نام دار کی تقلید چاہیے

اس شب میں خونِ قلب کی...☆ چاہیے

بیمار کربلا کی حالتِ زار قابلِ افسوس ہے تن بدن بخار میں پھک رہا ہے، پنڈلیاں سوجی ہوئی ہیں، رنگ زرد ہے، کس غضب کی مرقع کشی ہے۔

بند ۷

زخمی ہیں ہاتھ کھینچنا دشوار ہے مہار

مڑ مڑ کے فرقِ شاہ کو تکتے ہیں بار بار

ماں بہنیں بے کجاوے کے اونٹوں پہ ہیں سوار

کوڑوں سے پشت نیزوں سے شانے ہیں سب فگار

گیسو بڑھے ہوئے ہیں یہ الجھن وبال ہے

گرتے ہیں جب زمیں سے تو اٹھنا محال ہے

افسوس ہے کہ کسی کو ان کے حال پر ترس نہیں آتا، ضعف و نقاہت کی وجہ سے جب تیورا کر وہ زمین پر گر پڑتے ہیں تو اعدائے دیں زنجیر و طوق کھینچ کر ان کو اٹھاتے ہیں، اس وقت وہ فرماتے ہیں کہ مزید نہ ستاؤ تمام پشت زخمی ہے، اس طرح دُرّے نہ لگاؤ، نہ بیڑیوں کو کھینچو اور نہ غل مچاؤ۔

میں خود چلوں گا طوقِ گلوگیر چھوڑ دو

پاؤں کے زخم آلے ہیں زنجیر چھوڑ دو

سفرِ شام کے دوران جب چھوٹے چھوٹے بچے العطش العطش کی صدائیں بلند کرتے تو مائیں اپنے معصوم بچوں کے چہروں کی طرف یاس بھری نظروں سے دیکھتیں، بچوں کے گورے گورے بدن گرد سے اٹے ہوئے تھے، ان کے سر کھلے ہوئے تھے اور کرتے پھٹے ہوئے۔

☆ لفظ پڑھا نہ جاسکا۔

بند ۱۴

زخمی کسی کے کان ہیں، نیلے کسی کے گال
سہمے ہوئے ہیں ڈر سے طمانچوں کے خورد سال
چہرے ہیں زرد زرد تو ماتھے لہو سے لال
ڈھلتے ہیں اشک بھوک کی شدت سے ہیں نڈھال
چشمے کے پاس ہو کے بھی گر گزرتے ہیں
گرنے کا اشتروں سے وہیں قصد کرتے ہیں

اس دل خراش منظر کے تصور ہی سے جگر کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔ ریاضؔ نے بچوں کی خستہ حالی اور نفسیات کس خوبی سے اجاگر کی ہے۔ اسے انیسؔ مرحوم کا فیض کہنا چاہیے۔

اہلِ بیت کا لٹا ہوا قافلہ جب دیارِ شام کے قریب پہنچا تو یزید نے احکام جاری کیے کہ شام کے کوچہ و بازار آراستہ و پیراستہ کیے جائیں۔ بس پھر کیا تھا، ہر طرف جشن کے سامان ہونے لگے، شہر کے اشجار سرو چراغاں بن گئے، اہلِ شام امام حسینؑ کے دشمن تھے، اس لیے "گھر گھر چراغ جل گئے، قتلِ حسینؑ کے" لیکن غمِ حسینؑ کائنات پر محیط تھا، اس لیے بہار خزاں سے بدل گئی تھی، پھول بھی اس عالم گیر غم میں گریباں چاک تھے۔ دنیا سے حقیقی خوشی معدوم ہو چکی تھی۔

بند ۲۲

ظاہر اثر عزائے شہِ نیک خو کے تھے
اوراق گل فروشوں کے ہم رنگ و بو کے تھے
گویا طبق گلوں کے تھے تھالے لہو کے تھے
پھولوں کے کنٹھے ہار الم کے گلوں کے تھے
بھولے سے گل طبق میں اگر کھل کھلاتے تھے
غنچے چٹک چٹک کے طمانچے لگاتے تھے

اک شور تھا کہ زہراؑ کا باغ لٹ گیا جشن کے سماں میں عزا کی کیفیت تھی، ہر سمت سے نوحہ و ماتم کی صدائیں سنائی دیتیں۔ عزتِ اطہار اور شام کا بازار، اے فلکِ بے مدار تو اس دل سوز اور خوں ریز منظر کی تاب کس طرح لا سکا۔

قصرِ یزید آراستہ کیا گیا، ہر طرف تہنیت کی دھوم تھی، بادہ نوشوں میں دور چل رہا تھا، ساقیِ کوثر کے پسر کو شہید کر کے وہ بے خود تھے، جب دربار میں اہلِ بیت داخل ہوئے تو یزید:

"چلّایا شکر آلِ محمدؐ ہوئے اسیر"

جس کی تلوار کا لوہا تمام دنیا مانے ہوئے تھی، آج اسی کی اولاد دربارِ عام میں اسیر ہو کر آئی ہے۔

اس کے بعد یزید نے عمر بن سعد سے کہا کہ شام کا وقت ہو گیا ہے، اسیرانِ غم کو زنداں میں لے جاؤ، صبح کو پھر جشن کی دھوم دھام ہوگی، ہر سمت اژدہام ہوگا، اس وقت ان اسیروں کو دربار میں سر برہنہ لانا۔

اہلِ حرم کو زنداں روانہ کیا گیا، ان کو وہ مکان دیا گیا جو مدت سے بے چراغ پڑا ہوا تھا، صحن میں مٹی کے ڈھیر تھے، دروازہ بند کر دیا گیا، ظلم کی چوکی کا بندوبست تھا جو لوگ پہرے پر متعین تھے، وہ ظالم، سفاک اور بت پرست واقع ہوئے تھے۔

بند ۶۲

ظلمت محیط، شمع نہ مشعل نہ واں چراغ
روشن تھے صرف رانڈوں کے سینوں☆ میں دل کے داغ
فرصت نہ آہ سے نہ تڑپنے سے تھا فراغ
اس گھر کا چاندنی کو بھی ملتا نہ تھا سراغ

☆ مرزا دبیرؔ مرحوم کی بے مثل بیت بھی مدِ نظر رہے:

تاروں کی روشنی نہ چراغوں کی روشنی
بس ماتمِ حسینؑ کے داغوں کی روشنی

تاریکی لحد قبر کی سب کو دکھاتی تھی
وحشت کے مارے روشنی آنے نہ پاتی تھی

زندانِ شام کی ہول ناک تاریکی اور ویرانی معاذ اللہ... روشنی کا وہاں گزر نہ تھا، وہ قید خانہ تھا یا ظلمت کدہ اور وہ بھی آلِ رسولؐ کے لیے۔

"تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو"

ہند (زوجہ یزید) کو آلِ رسولؐ سے بہت محبت تھی، اس کی خواب گاہ کے قریب جس جگہ اہلِ بیت علیہ السلام کا لٹا ہوا اسباب رکھا گیا تھا، وہاں سے آہ و زاری کی صدائیں بلند ہوئیں جن کو سن کر ہند بے تاب و بے قرار ہوگئی، وہ اس جگہ گئی تو اسے معلوم ہوا کہ ایک تیغ آب دار دھاڑیں مار کر رو رہی ہے، غم سے بلک بلک کر بار بار کہتی ہے کہ جورِ ستم گر سے بنیادِ دہر ہل گئی، افسوس صد افسوس کہ میری آبرو مٹی میں مل گئی۔ غمِ حسینؑ سے ساری فضا سوگوار تھی، ذوالفقار بھی ماتم گسار تھی، امامِ زمانہ کے حکم کی تابع دار تھی اس لیے لاچار تھی، ذوالفقار پر نادِ علی کندہ تھی، یہ دیکھ کر:

بند ا

پھر تیغِ آب دار سے کی اس نے التجا — ہے کیا یہ سانحہ مجھے اے تیغ تو بتا
تو قبضۂ حسینؑ سے کیوں کر ہوئی جدا — جیتے ہیں یا خدیوِ دو عالم نے کی قضا
کیا صدمہ پہنچا ابنِ شہِ ذوالفقار کو
چھوڑا کہاں امامِ فلک اقتدار کو

اے تیغ تو کس جری کے ماتم میں اس قدر ملول ہے، کیا لشکرِ جہول نے حملہ آور ہوکر میرے آقا کو شہید کردیا اور ان کا گھر لوٹ لیا گیا، دخترِ بتولؑ قیدِ شام میں رسن بستہ آئی ہیں، کیا حضرت زینبؑ اپنے بھائی سے بچھڑ گئیں۔

تیغِ آب دار نے جب کوئی جواب نہ دیا، تو وہ دل کباب چلائی کہ تیری فغاں بے سبب نہیں، قرائن سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام کو شہید کردیا گیا، اسی لیے تو رو رہی ہے۔

ہندِ نیک خو شمعوں کی روشنی میں زنداں کی طرف روانہ ہوئی۔ چشم پُرنم، پر رومال اور دل پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ اتنے میں نقیبوں نے اعلان کیا کہ زوجہ امیر کی آمد آمد ہے، کوئی اسیر زور سے نہ بولے اے قیدیو، تمھارے بخت جاگ اٹھے تمھیں فقیر سمجھ کر وہ ترس کھائے گی، اگر اس کی خوشامد کروگے تو زنداں سے رہائی دلوا دے گی۔ یہ سن کر خواہرِ امام بے قرار ہوگئیں اور سر کو جھکا کر بیٹھ گئیں، خرابے میں جب ہندِ نیک نام داخل ہوئی تو دیکھا کہ زمین پر ایک عرش احتشام لیٹا ہوا ہے، بخار کی شدت سے بے ہوش ہے، وہ اس قدر لاغر ہے کہ جس کی انتہا نہیں، رنگ زرد ہے جسم میں خون کا نام نہیں، ہڈیوں کا ایک ڈھانچا ہے۔

بند ۸۲

ہر سانس پر گماں ہے کہ آئے گا اب نہ دم　　　پنجوں سے تابہ ساق ضیا بار ہے ورم
رنجے کی تن میں ضعف ہے کھائے ہوئے قسم　　　گردن ہے کج کھلی ہوئی ہے نصف چشمِ نم
بے کس کے حالِ زار پہ افسوس ہوتا ہے
میت پڑی ہوئی ہے یہ محسوس ہوتا ہے

بیمار کربلا کے ضعف و نقاہت کی کامیاب مرقع کشی ہے، سننے والے پڑھنے والے پر غم و الم کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، محاکات نے قدم قدم پر اسلوب طرازی کا ساتھ دیا ہے، جزئیات کی تصویر کشی کے بعد climax ہے۔

''میت پڑی ہوئی ہے یہ محسوس ہوتا ہے''

اس لاجواب مصرعے کے بعد اس ضمن میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

مکالمہ

یعنی دو افراد کا آپس میں ہم کلام ہونا۔ مکالمہ ناول اور ڈرامے کی جان ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ فطری ہوتا کہ افرادِ مکالمہ کی سیرت پر روشنی پڑ سکے، حفظِ مراتب کا خیال رکھنا ضروری ہے، برمحل مکالمے سے لطفِ سخن دوبالا ہوجاتا ہے۔

اس مرثیے سے چند ایسے بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں ہند اور سید سجادؑ کے سوال و جواب شامل ہیں۔ جب بیمارِ کربلا کو غش سے قدرے افاقہ ہوا تو ہند نے جھک کر سلام کیا اور مزاج پرسی کی۔

بند ۸۶

کی عرض تب یہ ہند نے اے مہرِ مشرقین
ملتی بہت ہے آپ سے کچھ صورتِ حسینؑ
اس انتشار میں مرے دل کو نہیں ہے چین
کہہ دیجیے یہ راست کہ کس کے ہیں نورِ عین
ظاہر تو ہاشمیوں کا سب احتشام ہے
کیا اسمِ پاک والدِ عالی مقام ہے

ہند کے استفسار میں اضطراری کیفیت پائی جاتی ہے۔ ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند کو اہلِ بیتؑ کا ادب کس قدر ملحوظِ خاطر تھا جس کی محبت سے اس کا دل روشن تھا۔

بیمارِ کربلا کا جواب سنیے۔

بند ۸۷

بولے شہیدِ راہِ خدا کا پسر ہوں میں
سلطانِ بے سپاہ کا لختِ جگر ہوں میں
پیاسے کا تین روز کے نورِ نظر ہوں میں
اس کا ہوں لال خون میں سب جس کے تر ہوں میں
جبراً جدا کیا تھا تنِ پاش پاش سے
وقتِ وداع لپٹا تھا بابا کی لاش سے

مکالمے کی ایک خصوصیت ایجاز و اختصار بھی ہے، مندرجہ بالا بند میں دل خراش

سانحہ کی طرف اشارہ ہے، واقعہ نگاری کی یہ عمدہ مثال ہے۔ ''شہیدِ راہِ خدا''، ''سلطانِ بے سپاہ'' سے مفہوم کی بھرپور وضاحت ہوتی ہے۔

بند ۸۸

بولی یہ ہند نام وطن بھی بتایئے ۔۔۔۔ کس شہر میں مکاں ہے مفصل سنایئے
بہرِ خدا نہ فکر میں مجھ کو گھلایئے ۔۔۔۔ گردن اٹھا کے چہرۂ انور دکھایئے
کیا آلِ بوترابؑ کا دشمن فلک ہوا
تقریر سن کے اور سوا مجھ کو شک ہوا

ہندہ نے مزید سوالات کیے، آلِ رسولؐ کے فصیح لہجے سے وہ بخوبی واقف تھی۔ اس لیے بیمار کربلا کے جوابات سے وہ بہت متاثر ہوئی، اس کے دل میں رہ رہ کے شکوک پیدا ہونے لگے کہ خاندانِ رسولؐ کے ساتھ دشمنی تو نہیں کی گئی۔ گلزارِ فاطمہؑ میں کہیں خزاں تو نہیں آ گئی۔

بیمارِ کربلا کا جواب:

بند ۸۹

فرمایا گھر تو لٹ گیا جنگل میں کیا بتائیں ۔۔۔۔ گر اک جگہ رہے ہوں تو یہ حال بھی سنائیں
بھاری ہے طوق گردنِ کم زور کیا اٹھائیں ۔۔۔۔ قابل نہیں دکھانے کے یہ شکل کیا دکھائیں
افسوس اپنے خوں کو نہ صرف...☆ کیا
اس زندگی نے خلق میں بے آبرو کیا

بعد ازاں ہند نے یومِ عاشور کے حالات دریافت کیے، بیمار کربلا نے فرمایا، وہ روز حشر سے کم نہ تھا، شہِ مشرقین کے ساتھ مختصر سی فوج تھی، اس کے مقابلے میں سپاہِ عرب، روم، رے وشام تھی۔ صبحِ عاشور میدانِ کارزار گرم ہوا۔

بند ۹۶

تا ظہر ذبح ہوگیا وہ لشکرِ قلیل ۔۔۔۔ تنہا رہا خدیوِ فلک قدر و بے عدیل

☆ لفظ پڑھا نہیں جاسکا۔

ایسا جری تھا سیکڑوں دشمن کیے قتیل   گھوڑے سے وقتِ عصر گرا وہ شہِ خلیل
آندھی سیاہ خلق میں جس وقت آئی تھی
قاتل نے تیغ اس کے گلے پر پھرائی تھی

جب اس شہِ نیک خو کا لہو زمین پر بہا اس وقت آسمان سے خون برسا، اُن کا سرِ اقدس قبلہ رُو تھا، سجدے کی حالت میں سر و تن میں جدائی ہوئی بعد ازاں ان کی لاش کو گھوڑوں سے پامال کیا گیا، زمینِ کربلا پر اس کا تنِ پاش پاش بے دفن و کفن پڑا ہوا ہے، ہمارا چہرہ بے پناہ مصائب کی غمازی کرتا ہے، محضرِ شہادت میں ہمارا نام نہیں تھا، اس لیے ہم اسیر کیے گئے اور دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اُسی مقتولِ جفا کے اہلِ بیت زندانِ شام میں مقید ہیں۔

مرثیے کے باقی بند میں الم ناک واقعات کا بیان ہے، طوالت کے خوف سے مزید بند نہیں نقل کیے جائیں گے۔ ریاضؔ مرحوم کے چاروں مرثیوں کی امتیازی خصوصیات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، مرثیے غیر مطبوعہ ہیں، اس لیے ہر مرثیے سے نمونے کے طور پر کافی بند بھی پیش کیے گئے ہیں لیکن جب تک ان کے مرثیے شائع نہ ہو جائیں، اس وقت تک ریاضؔ کی مرثیہ گوئی پر سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔

مندرجہ بالا مرثیوں کے منتخب بند پڑھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں تنوع ہے، جوش و ولولہ ہے تخیل کی گل کاریوں اور فکر کی رعنائیوں نے ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دی ہے، اس لیے سامع/ قاری پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

۷۔ زارؔ سیّد آغا علی زوّار

’’سیّد آغا علی زوّار بن حکیم سیّد بندہ احمد زید پوری میر ببر علی انیسؔ کے تلامذہ میں تھے اور اچھے مرثیہ گو اور مرثیہ خوان سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے عشرۂ ثانیہ مقرر کیا تھا، اس میں ہر شب کو مجالس مردانہ و زنانہ ہوتی تھیں، مع اہل و عیال زیارتِ عتباتِ عالیہ سے مشرف ہوئے تھے، ۱۹۱۶ء کے بعد وفات پائی۔‘‘☆

☆ فروغ، سیّد ظہور الحسن (مولف) شجراتِ طیبات، بار اول، امیر المطابع، سیتاپور، ۱۹۱۸ء، ص ۳۸۰ ـ ۳۸۱

زارؔ کے نہ مزید حالات معلوم ہو سکے اور نہ ان کے کلام کا نمونہ مل سکا۔

۸۔ سلیسؔ میر محمد

میر محمد نام سلیسؔ تخلص تھا۔ میر انیسؔ مرحوم کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ یہ میر انیسؔ کی پانچویں اولاد تھے، ان سے پہلے میر نفیسؔ، میر عسکری رئیسؔ اور دو صاحب زادیاں پیدا ہو چکی تھیں، یہ سب فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔[☆۱]

خانوادۂ انیسؔ کے ایک اور فرد کا بیان ہے کہ "یہ بھی بمقام فیض آباد متولد ہوئے اور لکھنؤ میں ۱۹ ربیع الاول ۱۳۰۸ھ کو انتقال کیا۔ آپ اپنے آبائی قبرستان میں باپ کے قریب دفن ہوئے۔"[☆۲]

اس بیان سے اُن کی وفات کی تاریخ کا علم تو ہو گیا مگر تاریخ یا سنہ ولادت نہ معلوم ہو سکا۔ لیکن اس فقرے سے کہ فیض آباد میں متولد ہوئے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۵۸ھ[☆۳] سے قبل ہوئی۔ میر انیسؔ نے لکھنؤ میں مستقل سکونت ۱۲۵۸ھ میں اختیار کی، کیوں کہ امجد علی شاہ کا عہدِ حکومت اسی سنہ سے شروع ہوتا ہے اور میر مہدی حسن احسنؔ نے واقعاتِ انیسؔ میں لکھا ہے کہ میر انیسؔ نے زمانہ امجد علی شاہ میں لکھنؤ کی سکونت اختیار کی، میر خلیقؔ نے ۱۲۶۰ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی، لہٰذا میر انیس یقیناً ۱۲۵۸ھ میں لکھنؤ آ چکے تھے، اس لیے میر سلیسؔ کی پیدائش ۱۲۵۸ھ سے پیش تر ہوئی۔ ان کے سنہ ولادت کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ میر انیسؔ کے سب سے بڑے صاحب زادے میر نفیسؔ تھے جو ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے، اُن کے بعد تین اولادیں ہوئیں، پانچویں میر سلیسؔ کا سنہ (ولادت) تقریباً ۱۲۴۵ھ ہونا چاہیے اور وہ اپنے والد اور دادا کے ہم راہ ۱۲۔۱۳ سال کی عمر میں لکھنؤ آئے ہوں گے، اس اعتبار سے ان کی عمر ۶۳ سال ہونا چاہیے۔

☆۱۔ سید یوسف حسین صاحب زیدی (خلف علی محمد عارف مرحوم) گرامی نامہ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۶ء

☆۲۔ سید محمد عباس صاحب، پندرہ روزہ انیس لاہور، یکم تا ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء، جلد ۳، شمارہ ۷

☆۳۔ ۱۲۴۱ھ باقیاتِ انیس، جلد اوّل، ص ۱۵۶

میر سلیسؔ کے متعلق بھی یقین کے ساتھ یہی کہا جاسکتا ہے کہ جو تعلیم میر انیسؔ نے خود پائی تھی، وہی ان کو دی۔ چناں چہ انھوں نے بھی شاعری اور مرثیہ گوئی میں اپنی عمر بسر کی۔ ان کے کلام کی مقدار[☆۱] اپنے والد، چچا اور بڑے بھائی کے مقابلے میں بہت کم ہے جو کچھ کہا ہے، اس سے ان کی خوش فکری اور ذوق کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، زبان میں شیرینی و لطافت اور محاورات کی چاشنی کا کلام میں ہونا تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیوں کہ زبان اُن کے گھر کی تھی لیکن دیگر محاسنِ فکری بھی اپنے بزرگوں کی طرح ان کے کلام میں موجود ہیں، یہی سبب ہے کہ بعض لوگوں کو اُن کے کلام پر میر انیسؔ کے کلام کا گمان ہوا اور انھوں نے کچھ مرثیے میر انیسؔ کی جلدوں میں شائع کردیے۔

مثال کے طور پر یہی مرثیہ:

”رن میں جس دم حرِ ذیشاں نے شہادت پائی“

میر سلیسؔ کا ہے، ہمارے پاس اس کا قلمی نسخہ ہے جس میں مقطع حسبِ ذیل ہے:

بسکہ لاشوں کے اٹھانے میں قیامت ہے سلیسؔ
قلب صد پارہ ہے کیا سخت مصیبت ہے سلیسؔ
تجھ پہ شہ کی نظرِ لطف و عنایت ہے سلیسؔ
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست ہے سلیسؔ
سب یہ رنگینیاں خونِ دلِ بے تاب کی ہیں
جتنی بیتیں ہیں وہ لڑیاں دُرِ نایاب کی ہیں[☆۲]

☆۱۔ تقریباً نصف درجن مرثیے ان کے (سلیسؔ کے) ملتے ہیں جن میں سے بعض کے مطلع یہ ہیں، (۱) بلبل ہوں بوستانِ رسالت مآب کا یا بلبل ہوں بوستانِ رسالت پناہ کا (۲) طغرا نویس منقبتِ آلِ پاک ہوں (۳) ہاں اے زباں طریق فصاحت دکھا مجھے (۴) وہ گل ہوں کہ جس پاس خزاں آ نہیں سکتی، شاد عظیم آبادی، پیمبرانِ سخن، نوشتہ ڈاکٹر سید صفدر حسین صاحب زیدی، فٹ نوٹ، ۷۷

☆۲۔ سید یوسف حسین صاحب زیدی، گرامی نامہ مورخہ ۱۳؍ مارچ ۱۹۷۶ء

نوٹ: محترمی یوسف حسین صاحب کا میں شکرگزار ہوں کہ انھوں نے سلیسؔ مرحوم کے حالات تحریر فرمائے اور قلمی نسخے کے مطالعے کے بعد اس کی وضاحت فرمادی کہ مرثیہ مذکورہ سلیسؔ مرحوم کا ہے جو کسی غلط فہمی کے سبب مراثی انیسؔ کی جلد چہارم مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور میں شامل کیا گیا ہے (ص ۷۹ تا ۸۷) مقطع غائب ہے۔ (ق۔ ر۔ ح جعفری)

سلیسؔ مرحوم نے بھی بکثرت غزلیں کہیں جو شاعروں کے گل دستوں میں ملیں گی، بہت سے مرثیے اور سلام نظم کیے جو لوگوں کے پاس محفوظ ہیں، سلیسؔ کا انداز خوانندگی میر انیسؔ سے بہت مشابہ تھا۔☆۱

سلیسؔ نے حضرت عون و محمد کے حال میں ۱۳۹ بند کا ایک مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے:

"رن میں جس دم حرِ ذیشاں نے شہادت پائی"

دوسرے مرثیے کا مطلع ہے:

طغرا نویس منقبت آلِ پاک ہوں

(حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بارے میں)

سلیسؔ کے اُن مرثیوں کی نمایاں خصوصیت زورِ سخن ہے۔ ان میں بہت سے اقوال اور بہت سی ضرب الامثال ہیں جن میں زندگی کے تجربوں کے نچوڑ ہیں، اخلاقی درس ہیں، فلسفیانہ مضامین ہیں۔ جذبات نگاری، ایجاز و اختصار اور سہل ممتنع کے عمدہ نمونے ہیں، محاورہ بندی ہے، زبان کی چاشنی ہے، ایک ایک مصرعے یا شعر میں ایسے ایسے مضامین نظم کیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر دل و دماغ پر ایک خاص قسم کا تاثر قائم ہوتا ہے جس کی تشریح سے الفاظ قاصر ہیں "مشتے نمونہ از خروارے" اقوال، ضرب الامثال۔

کبھی اس طرح نہ مہرِ فلک آرا چمکا☆۲

جس طرح حرِ دلاور کا ستارہ چمکا (پہلے بند کی بیت)

حضرت حر کے مقدر کے ستارے کی چمک دمک کے مقابلے میں مہرِ فلک کی ضیا ماند پڑ گئی۔

(انکسار کی تلقین) "خاکساری ہو تو سر عرش سے جا ملتا ہے" (بند نمبر ۲)

(دنیائیدوں کی حقیقت) "مالِ دنیا سے ملا بھی تو کفن ملتا ہے" (بند ۴)

☆۱۔ سید محمد عباس، پندرہ روزہ انیس، یکم تا ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء

☆۲۔ مطلع: رن میں جس دم حرِ ذیشاں نے شہادت پائی

(دوراندیشی کا تقاضا) "چاہیے جانبِ انجام نظر دانا کو" (بند ۵)

(صنعت تضاد کی مثال) "نار سے نور☆ ہوا عزت و توقیر ملی" (بند ۱۰)

مرتبہ شناسی کا صلہ

(صنعتِ تضاد کی مثال صبحِ بادشہِ کون و مکاں میں پہنچا بیت نمبر ۱۰

اور مرتبہ شناسی کا صلہ) پاؤں دوزخ سے ہٹاتے ہی جناں میں پہنچا

(تضاد سہل ممتنع) بگڑی بن جاتی ہے جب فضلِ خدا ہوتا ہے (بند ۱۱)

زبان " " " وہم میں بھی جو نہ آتا تھا وہ پایہ پایا (بند ۱۲)

(طرزِ ادا کی خوبی مسکرا دینے نے حوروں کے بھی دل مل ڈالے (بیت بند ۱۴)

اور تشبیہ کی معنی آفرینی) ڈالیاں پھولوں کی تھیں چہروں پہ آنچل ڈالے

(حضرت زینبؑ کا ارشاد کام آجائے جو اولاد وہی کام کی ہے (بند ۴۲

اولاد کی صحیح تعریف)

(حضرت عون و محمد کی ان میں جوہر اسد اللہ کی شمشیر کے ہیں (بیت بند ۴۲)

شجاعت کے بارے میں بھول کر منھ پہ نہ جانا یہ پسر شیر کے ہیں

محاورہ بندی)

اڑ کے جاتے ہیں جدھر صید کی بو ہوتی ہے

شیر کے بچوں میں بھی شیر کی خو ہوتی ہے (بیت بند ۴۳)

، (نادر تشبیہ) . بن گئے اڑ کے پری زادوں کے سائے گھوڑے (بند ۵۳)

(سبک رفتاریِ رخش) لاکھ بن بن کے چلے کبک تو کیا چلتی ہے

(حسین تشبیہ) گھوڑے چلتے ہیں کہ گلشن میں ہوا چلتی ہے (بیت بند ۵۵) .

(رخش کی نازک مزاجی) اور بگڑے جاتے ہیں ہوا جسم کو گر لگتی ہے

آنکھوں کی تعریف) محاورہ بندی ایسی آنکھیں ہوں تو پریوں کی نظر لگتی ہے (بیت بند ۶۰)

(صنعتِ تلمیح یاد ہے دن پہ جبریل کے کٹ جانے کا

زورِ بیان آج پھر خوف ہے گیتی کے الٹ جانے کا (بیت بند ۶۷)

☆ انیس مرحوم کا مصرع طوعِ خاطر ہے، نار سے نور کی جانب اسے لائی، تقدیرِ مطلع، بخدا فارس میدانِ تہور تھا حر

(محاورہ) کس کا منہ تھا کوئی آجائے جو منہ پر ان کے (بند ۶۸)

(اچھوتی تشبیہ) یوں سواروں کو اٹھا کر یہ پٹک دیتے ہیں

جس طرح گرد کو دامن سے جھٹک دیتے ہیں (بیت بند ۷۰)

(زورِ بیان اور تلمیح) دشتِ پر ہول نہ بے وجہ لرز جاتا تھا (بیت بند ۷۴)

پیکرِ گاوِ زمیں خوف سے تھراتا تھا

(انقلابِ زمانہ کی روداد) پستی گرش نے زمانے کی دکھائی کیسی (بند ۷۹)

(استعارہ) غل تھا خوں اڑنے سے گردوں پہ شفق پھولے گی

(زبان کی سلاست وروانی) جو جیے گا یہ لڑائی نہ اسے بھولے گی (بیت بند ۸۹)

(محاورہ) شیر ان آنکھوں سے آنکھوں کو چرا جاتے ہیں (بند ۹۵)

(محاورہ) (قدرت کا گر خدا چاہے تو یہ جنگ بھی سر ہوتی ہے

اٹل اور بنیادی قانون) زیست جب تک ہے تو خود موت سپر ہوتی ہے (بیت بند ۹۶)

(تشبیہِ تام کی مثال) ابر ڈھالوں کے وہ کالے وہ چمک دھاروں کی

بجلیاں آنکھوں میں پھرنے لگیں تلواروں کی (بیت بند ۱۰۰)

محاورہ کون لڑنے کو بڑھے "جنگ سے جی چھوڑے ہیں" (بند ۱۰۸)

صنعتِ تلمیح شور ہے خیبریوں میں کہ علی لڑتے ہیں (بند ۱۱۴)

جذبات نگاری کہتے تھے آنکھ جھپک کر ابھی کھل جائے گی

۔ ۔ ۔ منھ اِدھر کرلو تو اماں ہمیں نیند آئے گی (بیت بند ۱۳۶)

۔ ۔ ۔ ہائے صدمہ ہے یہ اولاد کے مر جانے کا

محاورہ خوف ہے منھ سے کلیجے کے نکل آنے کا (بیت بند ۱۳۷)

محاسنِ کلام تجھ پہ شہ کی نظرِ لطف عنایت ہے سلیس

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست ہے سلیس بند ۱۳۹

سلیس مرحوم کے ایک مرثیے کا مطلع ہے:

طغرا نویسِ منقبتِ آلِ پاک ہوں

اس مرثیے میں ۱۳۰ بند ہیں اور سلطان بحروبر کی شہادت کو نظم کیا گیا ہے۔

کچھ مصرعے اور اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں زورِ بیان کے علاوہ اندازِ بیان کی خوبی، منظر طرازی، جذبات نگاری، صنائع وبدائع، زبان کی چاشنی، تخیل کی رعنائی اور رزمیہ شاعری کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔

تشبیہ	مانندِ خامہ و زباں سینہ چاک ہوں	(بند ۱)
صنعتِ ایہام	عاجز نواز دادِ سخن بے حساب دیں	
	تازہ ہو باغِ نظم جو اشکوں سے آب دیں	(بیت بند ۳)
صنعتِ تضاد	ادنیٰ کو دیں شرف تو وہ عالی جناب ہو	
	ذرّے پہ گر یہ مہر کریں آفتاب ہو	(بیت بند ۴)
(امامِ مظلوم کی	نہ غیر نہ عزیز شہِ مشرقین تھے	بیت بند ۵
بے کسی کے مرقع کشی)	وقتِ نمازِ عصر اکیلے حسین تھے	
درد و غم کی داستان	پھولا ہوا رسولؐ کا گلشن اجڑ گیا	(بند ۷)
مکمل مرثیہ ہے	برباد کارخانۂ شاہانہ ہوگیا	
	حیدرؑ کا گھر بسا ہوا ویرانہ ہوگیا	(بیت بند ۱۵)
صنعتِ تضاد اور طرزِ ادا	یہ شیب ہے کہ زور پہ ہے عالمِ شباب	(بند ۴۷)
نادر تشبیہ اور معجز بیانی	تکتے ہیں چلیوں کو جو طالب ہیں دید کے	
	طاقِ حرم پہ رکھے ہیں دو نگ حدید کے	(بیت بند ۵۳)
صنعتِ تلمیح	توڑیں ابھی جو ہو کوئی خیبر سا در	
اور رجز	چاہیں تو آسماں کو الٹ دیں زمین پر	(بند ۵۷)
امامِ عالی مقام کا مرتبہ	قدسی نہ کیوں ادب سے جھکائیں سرِ نیاز	
	کعبہ ہے ان کے طوف سے دنیا میں سرفراز	(بند ۵۸)
میدانِ کارزار	ٹاپوں سے مرکبوں کے تزلزل میں ہے وہ بن	
کی کیفیت	باجے عرب کے بجتے ہیں جب بولتا ہے رن	(بند ۶۴)

استعارہ
اونچا ہوا جو ہاتھ ضیا دور تک گئی
ارض و سما کے بیچ میں بجلی چمک گئی (بیت بند ۷۱)
کالی گھٹا میں کوند گئی برق ذوالفقار
سر صورتِ تگرگ برستے تھے بار بار (بند ۷۳)

پہلے مصرع میں برقِ ذوالفقار کے لیے
کوندنا کہا ہے تشبیہ ہے
دوسرے مصرعے میں

محاورے کی چاشنی اور	دیکھے عدم کی راہ جو آنکھ اس سے چار ہو	(بند ۷۵)
طرزِ بیان کی خوبی تشبیہ کی	سر تن سے یوں جدا کیا اس تیرہ بخت کا	
معنی آفرینی اور دل آویزی	جیسے ہو اے اڑتا ہے پتا درخت کا	(بیت بند ۷۶)
افواجِ اعدا میں انتشار	افتاد یہ نئی ہوئی ہر نابکار پر	
کی کیفیت کی	اسوار تھے زمیں پہ فرس تھے سوار پر	(بیت بند ۸۲)
کامیاب مرقع کشی	نعروں سے ہل رہی تھی زمیں رزم گاہ کی	(۸۳)
تشبیہِ تام کی ایک مثال	ڈھالیں اٹھی ہوئی تھیں کہ آندھی سیاہ تھی	(بند ۹۷)
زورِ بیان اور حسنِ تعلیل	موقع کہیں جہاں میں نہ پایا جو آڑ کا	
کی عمدہ مثال	منھ پر زمیں نے رکھ لیا دامن پہاڑ کا	(بیت بند ۱۱۷)

مندرجہ بالا مصرع اور ابیات پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ سلیس کے کلام میں جوش و خروش ہے، تشبیہات میں جدت اور ندرت ہے، مصرعوں کی رعنائی، تخیل کی بلند پروازی انداز بیان کی خوبی اور زبان کی دل کشی "دامنِ دل می کشد..." سلیس نے تحقیقِ الفاظ پر خاص طور سے توجہ کی اور مرثیے کے شاعرانہ انداز اور اخلاقی شاعری کو ترقی دی۔

مرثیہ کا اخلاقی پہلو

مرثیہ اور اخلاقیات (Ethics) میں فرق ہے لیکن نظم کی اس صنف میں

اخلاقیات کے پہلو اجاگر کیے گئے ہیں تا کہ سامعین/ قارئین اپنی اور اپنے معاشرے کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ اردو کے مرثیے میں مذہب نے اخلاقیات کا ذخیرہ اتنا زیادہ جمع کر دیا کہ ہماری اخلاقی شاعری کی سطح ہمیشہ سے زیادہ بلند نظر آنے لگی۔ قدم قدم پر راست بازی خوفِ خدا، عبادت گزاری، مردانگی، انسانی ہمدردی، بہادری، قول و فعل سے برابر سامنے آتی رہتی ہیں۔"[☆۱]

اشخاص کے اخلاق کو سنوارنے میں کسی صنفِ ادب کو اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی مرثیے کو ہوئی۔ مرثیوں کے موضوعات اتنے بلند ہیں کہ اُن میں پست قسم کے مضامین کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

اس ضمن میں سلیسؔ مرحوم کے مرثیے[☆۲] کے چند بند دیکھیے۔

پند و نصیحت، بند ۳

وہی عاقل ہے جو عقبیٰ کا نہ جادہ چھوڑے　　مال مصرف میں کفن سے نہ زیادہ چھوڑے
نفسِ امارۂ بدخو کا ارادہ چھوڑے　　ورقِ نیکی اعمال نہ سادہ چھوڑے
کھالے کچھ گور کے پھر منھ کا نوالہ ہوگا
قبر میں فوج نہ ہوگی نہ رسالہ ہوگا

سلیسؔ کو بات کہنے کا سلیقہ اور نصیحت کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ اس سرائے فانی سے آدمی خالی ہاتھ جاتا ہے، عقبیٰ میں نہ تو دنیاوی تزک و احتشام کام آئے گا اور نہ طبل و علم۔ اس لیے انسان کو اپنے ساتھ اعمالِ خیر کا توشہ لے جانا چاہیے تا کہ وہاں سرخ رُو ہو۔

حضرت زینبؑ نے اپنے دونوں صاحب زادوں (عون و محمد) سے فرمایا کہ تم نے اب تک امامِ عالی مقام سے اذنِ جہاد کیوں نہ طلب کیا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سعادت میں تم سب سے پیچھے رہ جاؤ۔

☆۱۔ سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مذہب اور شاعری، ص ۲
☆۲۔ مطلع: رن میں جس دم جگر زینبؑ نے شہادت پائی

"ہائے تشویش بزرگوں کے مجھے نام کی ہے"

یہ سن کر:

بند ۲۴

ماں کے پاس آ کے یہ کہنے لگے وہ گل اندام　　ابھی روتے ہیں برادر کے قیسوں کو امام
جب مناسب ہو تو کرتے ہیں بزرگوں سے کلام　　آپ گھبرائیں نہ، لیتے ہیں رضا رن کی غلام
ساتھ والوں کے سوئے خلد پرے جاتے ہیں
کیا ہم ایسے ہیں کہ مرنے سے ڈرے جاتے ہیں

تیسرا مصرع اخلاقی درس کا بھرپور نمونہ ہے، دونوں صاحب زادے اپنی والدہ ماجدہ سے عرض کرتے ہیں کہ آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں، بھلا موت سے ہم کیسے خوف زدہ ہوسکتے ہیں، کیا ہم اپنے آبا و اجداد کے کارہائے نمایاں سے واقف نہیں، ہماری رگوں میں بھی تو انھیں شجاعانِ عرب کا خون گردش کر رہا ہے، ہمارے دلوں میں جذبۂ شہادت کروٹیں لے رہا ہے موقع ملتے پر امامِ عالی مقام سے جنگ کی اجازت ضرور حاصل کرلیں گے، آپ مطمئن رہیں۔

ہماری نظر میں لشکرِ اعدا کی کیا حقیقت اور اس کے سپہ سالار کی کیا بساط، جگرداری میں ہم سے بہتر کون ہوسکتا ہے، لاکھ سر ہوں تو آقا کے قدموں پر نثار کردیں، ان کا حکم ملتے ہی اعدا کی صفوں کو ہم نیست و نابود کردیں گے۔

اس ضمن میں مرثیے سے ایک بند نقل کیا جاتا ہے جس میں حضرت عون و محمد کی جرأت و ہمت کا تذکرہ ہے۔

شجاعت، بند ۲۷

فوج کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں اس کو　　نہ رکے ہاتھ ہزیمت جو نہ دے لیں اس کو
کوفہ و شام کے طالب ہوں تو لے لیں اس کو　　کوہ بھی سامنے آجائے تو ریلیں اس کو
اپنے زوروں کو شجاعانِ عرب مانتے ہیں
ہم بھی حیدرؑ کے نواسے ہیں یہ سب جانتے ہیں

مندرجہ بالا بند میں عزم و استقلال کا بیان ہے، لطفِ زبان ہے۔

رجز کے تیور دیکھیے ''ہم بھی میدر کے نواسے ہیں'' یہی فخر ہمارے لیے کافی ہے اور دشمن کے لیے پیامِ اجل ہے۔

کربلا آزمائش کا معیار ہے
حشر تک کے لیے فیصلہ ہوگیا (ماہرالقادری)

معرکۂ کربلا ایک نظریاتی جنگ تھی، ایک طرف امامِ عالی مقام دوسری طرف یزیدِ نافرجام، ایک طرف حق پرستی دوسری جانب باطل پرستی کا جذبہ، حسینی لشکر کے مجاہدین اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نمونہ پیش کر رہے تھے، وہ شجاعت بہادری ایثار اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہے تھے، یزیدی لشکر جاہ پرستی، مادہ پرستی، دغا بازی، مکر و زور اور ظلم و ستم کا دل دادہ تھا۔

امامِ عالی مقام جب آخری رخصت کے لیے خیمے میں تشریف لے گئے، تو اہلِ بیت علیہم السلام کو صبر کی یوں تلقین فرمائی۔

صبر کی تلقین بند ۱۸

رہتا نہیں جہاں☆[۱] میں یکساں کسی کا حال — شادی کبھی بشر کے لیے ہے کبھی ملال
خورشید کو عروج☆[۲] کبھی ہے کبھی زوال — تنہا ہے بادشاہ کبھی وقتِ انتقال
کرتے تھے جو گدا کو غنی ایک آن میں
مرکر انھیں کفن نہ ملا اس جہان میں☆[۳]

مندرجہ بالا بند سہلِ ممتنع کا عمدہ نمونہ ہے، آسان الفاظ میں تاثیر کی روح پھونکی گئی ہے، الفاظ میں جادو ہے، انقلابِ زمانہ کی داستان مضمر ہے۔

حضرت زینبؑ جب بہت بے قرار ہوئیں تو امامِ عالی مقام نے اُن سے فرمایا:

''اماں کا صبر و شکر نہیں یاد کیا تمھیں''

☆۔ دنیا میں کسی کی بھی یکساں نہیں گزری، انیسؔ مرحوم
☆۔ روزِ مہر بھی دیکھا تو دو پہر دیکھا، انیسؔ مرحوم
☆۔ طغرا نویسِ منقبتِ آلِ پاک ہوں، انیسؔ مرحوم

جذباتی اور نفسیاتی اپیل ہے۔

امامِ حسینؑ تین دن کی بھوک پیاس میں افواجِ دشمن سے نبرد آزما ہوئے، ایک صف الٹ کر دوسری صف کی طرف بڑھے، لشکریوں کے قدم اکھڑ گئے، نمورداروں کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی، رزم گاہ کی یہ کیفیت ہوگئی کہ آوازِ دف و چنگ بند ہوگئی، اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا۔

کھانے کی کچھ ہوس ہے نہ طالب ہیں آب کے
جو یا فقط جہاں میں ہیں کارِ ثواب کے

امامِ عالی مقام بزم میں محمدؐ کی شان اور رزم میں حیدرؑ کی آن بان ہے، انسانیت کا پیکرِ کامل۔ اسلام کا دھڑکتا ہوا دل، دینِ حق کی بہار، رضائے الٰہی کے شہ سوار تھے۔

ایک مشہور پہلوان ان کے مقابلے میں آیا، شقی نے ان کی طرف تین بھال کا تیر پھینکنا چاہا، اتنے میں ذوالفقار چمکی۔

"چلہ کٹا، کمان کھلی، تیر اڑ گیا"

امامِ حسینؑ نے اس سے فرمایا:

"تیغا اٹھا کے جنگ کی حسرت نکال لے"

اس وقت، بند ۱۰۴

بولا بہ عجز شاہ سے وہ خانماں خراب　　اے سبطِ مصطفیٰؐ جگر و جانِ بوتراب
ہے آتشِ عطش سے کلیجہ مرا کباب　　تھم جائیں گر حضور تو پی لوں میں جامِ آب

ہٹنا جدل سے گو کہ شجاعوں کا ننگ ہے
پر کیا کروں کہ دھوپ میں حضرت سے جنگ ہے

دشمن زیر ہو چکا ہے پیاس کے مارے وہ بے تاب ہے رحمۃ للعالمین کے نواسے نے مہلت دی اور کہا:

"ہاں جھک کے پی لے آب کہ راحت جگر کو ہو"

یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے کہ:

بلندیوں کو نہ تیری سمجھ سکی دنیا
ثبات و عزم کے اے آسمان کیا کہنا (زائر سیتاپوری مرحوم)

مرضی مولا از ہمہ اولیٰ:

انسان کی خواہشات کا منتہیٰ قربِ باری تعالیٰ کا حصول ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ حق شناس ہو، اس کا ہر قول و فعل رضائے الٰہی کے مطابق ہو۔

دشتِ نینوا میں فرزندِ رسولؐ سے معرکہ آرائی کی تیاریاں ہیں۔ لشکرِ اعدا میں دہل بجا، شور دار و گیر ہوا، دشمنِ دیں آمادۂ پیکار ہوئے، حضرتِ فاطمہ زہراؑ کے چاند پر فوجوں کی گھٹا چھا گئی۔ اس وقت امامِ عالی مقام نے فرمایا، میں علیؑ کا فرزند ہوں، میں سیفِ خدا ہوں، کائنات میرے قبضے میں ہے، ظفر میری جلو میں ہے، میں اسلام کی حیات ہوں اور نانا کی امت کے لیے سرمایۂ نجات ہوں، اس لیے:

ہے آرزو کہ اجرِ شہادت حصول ہو
کٹ جائے سر کہیں تو فراغت حصول ہو

تاریخِ عالم ایسے بلند کردار کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے گی۔

کردار نگاری

کردار نگاری بھی ایک فن ہے جس سے ہر نثر نگار یا شاعر بخوبی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا، نثر ہو یا نظم ہر قصہ یا واقعہ کرداروں کے ذریعے منظرِ عام پر آتا ہے اس لیے مرثیہ نگار کو کرداروں کی تخلیق میں وہ آزادی نہیں ہے جو ناول نویس یا ڈراما نگار کو ہوتی ہے۔ کیوں کہ واقعاتِ کربلا کے مآخذ مقاتل، تاریخ اور سیرت کی مستند کتابیں ہیں۔

واقعۂ کربلا عجیب و غریب نوعیت کا حامل ہے، معرکۂ حق و باطل جس میں ایک طرف سرورِ کائنات کے نواسے امام حسینؑ حضور کے خواب کی تعبیر، قرآنِ مجید کی تفسیر اسلام کی بقا اور حفاظت کے لیے بہتر مجاہدین کی معیت میں جہاد کے لیے کمربستہ ہیں حسینی سپاہ میں اٹھارہ کا تعلق خاندانِ بنی ہاشم سے تھا باقی امامِ عالی مقام کے انصار تھے،

مذہب پر جان و مال قربان کردینے کا جذبہ ان سب میں مشترک تھا، دوسری جانب کثیر یزیدی لشکر دنیاوی جاہ و جلال کے پرستار، حبِ دنیا کے نشے سے سرشار، مذہب کے اصولوں سے برسرِپیکار رسولِ اکرمؐ کے نواسے اور اُن کے رفقا کو تہِ تیغ کرنے کے لیے تیار تھا، کردار نگاری کا مقصد یہ ہے کہ کرداروں کی ایسی خصوصیات بیان کی جائیں جن کی مدد سے اُن کی شخصیت کا تعین ہوسکے۔ اس لیے مرثیہ نگار کو کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کے عمل اور ردِ عمل کو نہایت سلیقے سے پیش کرنا چاہیے، ان کے لب و لہجے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

کرداروں کے سلسلے میں ایک اور بات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کئی نقادوں نے کہا ہے کہ مرثیے میں جو واقعہ ہے وہ سرزمینِ عرب سے تعلق رکھتا ہے جو کردار ہیں وہ عرب ہیں لیکن میر انیسؔ (اور دوسرے مرثیہ نگاروں) نے انھیں ہندوستانی لباس میں پیش کیا ہے، یہ بات ایک غیر حقیقی فضا پیدا کرتی ہے اور مقتضائے حال کے خلاف ہے۔"☆

اس ضمن میں یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ مرثیہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے جس کی ایجاد کا سہرا برصغیر ہند کے شعرا کے سر ہے، مرثیوں میں اردو کا رنگ اور اردو کا مزاج نمایاں ہے۔

مرثیے کا پس منظر عرب تھا، کردار اُسی ملک کی فضاؤں میں سانس لیتے تھے لیکن مرثیہ نگاروں نے تصرف کرکے مرثیے کو اردو کا پس منظر اور ماحول عطا کیا۔ عرب کے کرداروں کو ہمارے معاشرے کے کرداروں سے ہم آہنگ کردیا تاکہ یگانگت کا عنصر اور تاثیر پیدا ہوجائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بنیادی تصرف تھا لیکن اس پر اعتراض کرنا ذوقِ سلیم کو منھ چڑانا ہے۔

کردار نگاری میں حفظِ مراتب اور فرقِ جذبات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہر کردار کے مزاج اور اس کی اُفتادِ طبع کو صحیح طریقے سے پیش کرنا جوئے شیر لانا ہے۔

☆ مراثیِ انیس (مرتبہ نائب نقوی)، (مقدمہ) پروفیسر سید احتشام حسین، جلد اول، مطبع علمی پرنٹنگ ورکس۔ لاہور، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۳

اس مضمون کے آخر میں اُن کرداروں پر اجمالی طور سے روشنی ڈالی جائے گی جن کا تذکرہ سلیسؔ مرحوم کے اس مرثیے میں ہے جس میں حضرت عون و محمد کی شہادت کا بیان ہے، اُن کی والدہ معظمہ کی سیرت کی بھی جھلکیاں ہیں۔

حضرت عون و محمد

جب حضرت مسلم کے یتیموں کی لاشیں خیمے میں لائی گئیں تو حضرت زینبؑ اپنے دونوں خورد سال فرزندوں سے یوں مخاطب ہوئیں۔

بند ۲۳

قفلِ مطلب کی ہے مفتاح☆ زباں کی تیزی　　وقت پر چاہیے بلبل کی طرح گل ریزی
طبع رنگیں ہو تو مشکل نہیں رنگ آمیزی　　بات میں لطف ہو تقریر میں مطلب خیزی
شرم کس بات کی مطلب کے ادا کرنے میں
زندگی موت ہے گر دیر ہوئی مرنے میں

الفاظ کا تلازمہ، ان کی دل کشی اور مصرعوں کی سجاوٹ جاذبِ فکر و نظر ہے۔

حضرت عون و محمد کی عمر نو دس برس کی ہوگی، ذرا ان دونوں کا جواب سنیے۔

بند ۲۸

شہ سے ضد کر کے اگر اذنِ وغا لیتے ہم　　عہدہ شیرِ خدا بھی بخدا لیتے ہم
مشک ہوتی تو ابھی نہر کو جا لیتے ہم　　علمِ فوج بھی ملتا تو اٹھا لیتے
شام تک فتح کے نقاروں کا غل کر دیتے
توڑ کر کوفے کا در نہر پہ پل کر دیتے

ضد کا لفظ غمازی کرتا ہے کہ حضرت عون و محمد کم سن ہونے کے باوجود اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ماموں جان کو ان سے کتنی محبت ہے، ان کے دلوں میں یہ خیال بھی رہ رہ کے آتا کہ حضرت علیؑ کے نواسے اور حضرت جعفر طیار کے پوتے ہونے کی وجہ

☆ مطلع: رن میں جس دم خبر ذیشان نے شہادت پائی

سے وہ علمِ فوج کے حق دار ہیں۔

جب لشکرِ اعدا سے مبارز طلبی ہوئی، اس وقت۔

بند ۳۱

ہاتھ جوڑے گئے حضرت کے قریں وہ دلبر
شاہ نے چھاتی سے لپٹا لیے اُن دونوں کے سر
عرض کی اے شہِ ذی جاہ سلیماں افسر
آرزو ہے کہ ہم اب صدقے ہوں ان قدموں پر
ہم کو جب تک کہ سرافرازی کا خلعت نہ ملے
قاسمؑ و اکبرؑ و عباسؑ کو رخصت نہ ملے

حضرت عون و محمد اپنے ماموں جان کے پاس اذنِ وغا لینے گئے تو ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے گئے، امامِ عالی مقام کو ''شہِ ذی جاہ'' اور ''سلیماں افسر'' کہہ کر خطاب کیا۔ اُن کی عظمت و جلالت کے پیشِ نظر اذنِ جنگ کو ''سرافرازی کا خلعت'' کہا، الفاظ میں معنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اجازت ملتے ہی دونوں بھائی خیمے میں رخصت کے لیے گئے۔

سج گئے جسم پہ زیور کی طرح جب ہتھیار　　　کر کے تسلیم چلے خیمے سے وہ گل رخسار

دشمنوں کی صفوں پر حملہ آور ہوئے، تیغ اسد اللہ کی تیزی اور صفائی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔

بند ۶۶

پڑ گئی فوج میں ہلچل جدھر آئے دونوں　　　کٹ گیا نیزوں کا جنگل جدھر آئے دونوں
پھٹ گئے ڈھالوں کے بادل جدھر آئے دونوں　　　بھر گئے خون سے جل تھل جدھر آئے دونوں
بجلیاں کوند رہی تھیں سپہِ دشمن میں
سر برستے تھے کہ ساون کی جھڑی تھی رن میں

مندرجہ بالا بند میں میدانِ کارزار کی ایک جھلک نمایاں ہے۔ لشکریوں کے انتشار کی طرف اشارہ ہے، عمدہ تشبیہیں ہیں، زبان اور محاورے کی چاشنی ہے، چھٹے مصرعے میں مقامی رنگ نے کس قدر لطف پیدا کر دیا ہے۔

سلیسؔ نے حضرت عون و محمد کی تیغوں اور ان کے ہاتھوں کی صفائی کا تذکرہ کیا ہے تاکہ اُن کی شجاعت کو اجاگر کیا جا سکے۔

حضرت علی اکبرؑ اپنی پھوپھی حضرت زینبؑ کے پاس گئے اور عون و محمد کی یادگار جنگ کی تعریف فرمائی... اتنے میں طبلِ ظفر بجا۔

حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ مقتل سے عون و محمد کی لاشوں کو گود میں لیے ہوئے خیمے میں داخل ہوئے، امامِ حسینؑ بھی سر جھکائے ہوئے ان کے ساتھ تھے۔

اس وقت:

بند ۱۲۸

پوچھا بانو نے کہ مرتے ہوئے کی تھی کوئی بات — رو کے فرمانے لگے شاہِ رفیع الدرجات
ماں کے عاشق تھے یہ دونوں پسرِ نیک صفات — نزع میں بھی یہی کہتے تھے تڑپ کر ہیہات
تیر پہلو سے، کلیجوں سے سنانیں نکلیں!
ہائے اماں کی نہ آغوش میں جانیں نکلیں!

حضرت عون و محمد کو اپنی والدۂ ماجدہ سے والہانہ محبت تھی، کم سنی کا تقاضا بھی تھا اور ان کی تمنا بھی کہ ماں کی آغوش میں اُن کا دم نکلے، افسوس ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور خیمۂ اقدس پہنچنے ہی سے پہلے دونوں نے دم توڑ دیا۔

انیسؔ مرحوم نے حضرت عون و محمد کے حال میں بہت سے مرثیے لکھے جن میں سیرت نگاری اور کردار نگاری کا حق انھوں نے ادا کر دیا۔ ان کے فرزند اور شاگرد سلیسؔ نے بھی مذکورہ بالا مرثیے میں حضرت عون و محمد کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔

دونوں اسد اللہ کی بیٹی کی آغوش کے پروردہ تھے، آبا و اجداد کے کارنامے اُن

کے دلوں پر نقش تھے، امامِ عالی مقام سے اذنِ جنگ حاصل کرنے کے بعد اُنھوں نے شجاعت اور بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔

اس ضمن میں شاعرِ اہلِ بیت کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

جہادِ عون و محمد خدا کی قدرت تھا   یہ شیرِ حضرتِ زینبؑ کا ہے اثر دیکھو

(زائر سیتاپوری مرحوم)

حضرت زینب کی سیرت کی چند جھلکیاں

حفظِ مراتب

جو فرد ماتم اور سوگواری کا مرقع ہو جس کے قلب و روح کو حزن و ملال نے بری طرح مجروح کردیا ہو، اس سے حفظِ مراتب کی کیا امید کی جاسکتی ہے لیکن حضرتِ زینبؑ نے گفتگو کے ہر پہلو میں اس کا خیال رکھا۔ امامِ حسینؑ ان کے بڑے بھائی ہیں، دونوں کی محبت ضرب المثل ہے۔ اس کے باوجود حضرتِ زینبؑ نے اپنے بھائی کو آقا کہہ کر مخاطب کیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ:

"باپ ان دونوں کا ہے کون غلام آپ کا ہے"

جب عون و محمد کو رن میں جانے کی اجازت مل گئی تو اس وقت۔

بند ۳۶

ماں نے لے جاکے جو پوشاک انھیں پہنائی   شان بھائی کی لگا دیکھنے مڑ کر بھائی
فقط چھوٹے سے جو ہتھیاروں کی کشتی لائی   واہ رے صبر کہ خود ماں نے کمر بندھوائی
گھر لٹے اور لبوں پر نہ صدا آہ کی ہو!
یہ اسی سے ہو جو بیٹی اسد اللہ کی ہو!

ایسے جاں گداز موقعے پر بھی حضرت زینبؑ کے ہاتھ سے صبر کا دامن نہ چھوٹنے پایا۔ کردار کی یہ بلندی اللہ اکبر۔

دینِ حق پر وقت پڑا ہے، اُس کی بقا کے لیے اپنے لاڈلے بچوں کو قربانی کے

لیے پیش کر دیا۔ لشکرِ اعدا میں طبلِ ظفر بجا، حضرت علی اکبرؑ بھی رزم گاہ کی طرف روانہ ہوئے، ایک کا لاشہ حضرت عباسؑ کی گود میں تھا اور دوسرے کا لاشہ حضرت علی اکبرؑ خیمے میں لائے تو وہاں ایک کہرام برپا ہوگیا۔

اس وقت بند ۱۲۵

کہا زینبؑ نے جو سب اٹھ کے گلے پیٹنے سر　　ابھی ہے ہے نہ کرو صاحبو ٹھہرو دم بھر
شادیاں ہوچکیں پروان چڑھے میرے پسر　　کوئی دیکھو تو محافے دلہنوں کے ہیں کدھر کے
دولھا والوں کی صدا زیرِ قنات آتی ہے
کیسے لاشے، مرے بچوں کی برات آتی ہے

مندرجہ بالا بند میں دردرسیدہ ماں کا بیان کس قدر رقت انگیز ہے، صبر وضبط کی انتہا ہے۔

ماں کے خواب کی تعبیر

"شادیاں ہوچکیں پروان چڑھے میرے پسر"

لفظوں میں جادو ہے ایسے ہی مقامات پر شاعری اعجاز کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ امامِ عالی مقام کی موجودگی میں حضرت زینبؑ اپنے بچوں سے یوں مخاطب ہوئیں۔

بند ۱۳۶

بارک اللہ لڑے خوب عجب کام کیے　　واہ ان چھوٹی سی عمروں میں بڑے نام کیے
طاقتیں گھٹ گئیں فاقے سحر و شام کیے　　بخششِ امتِ عاصی کے سرانجام کیے
نیک بیٹے ہوں تو نام اب و جد کرتے ہیں
ہاں بہادر یونہی آقا کی مدد کرتے ہیں

حضرت زینبؑ ایثار و قربانی، صبر و تحمل کا مرقع تھیں، مشقت و جفاکشی، درد و غم، رنج و محن، اشارہ بنی ہاشم کے دل پر داغ، خیامِ اہلِ بیت کا نذرِ آتش کیا جانا پھر کربلا سے دمشق۔

حدیثِ عشق دو لفظ است کربلا و دمشق　　　یکے حسینؑ رقم کرد و دیگرے زینبؑ

اہلِ بیت کے لٹے ہوئے قافلے کی جس طرح ضرورت زینبؑ نے قیادت فرمائی، وہ آپ اپنی نظیر ہے، دربار یزید میں اُن کے فصیح و بلیغ خطبے عربی ادب کے شاہ کار ہیں، زندانِ شام سے رہائی کے بعد، شہدائے کربلا کی تدفین کے بعد مدینہ واپسی۔ یہ ایسے روح فرسا واقعات ہیں جن کے تصور ہی سے دل تڑپ اٹھتا ہے اور کلیجے کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔

حضرت زینبؑ کا بھرپور کردار اُن مرثیوں میں ملے گا جو بعد شہادتِ امام حسینؑ کے واقعات، سفرِ کوفہ و شام وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

امامِ حسینؑ کی شہادت کے بعد جس طرح حضرت زینبؑ نے مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، یہ اسد اللہ کی بیٹی ہی سے ممکن تھا، سخت امتحانات میں بھی وہ اپنے بھائی کے مشن کی تکمیل میں ثابت قدم رہیں۔ ایسے عظیم کردار کی مثال تاریخِ عالم اور دنیائے شاعری ہرگز نہ پیش کر سکے گی۔

۹۔ شریف

سیّد شریف حسین خلف الصدق عالی جناب ارسطو جاہ۔

ارسطو جاہ سیّد رجب علی خاں جگراؤں (ضلع لدھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ دور دور تک ان کے علم و فضل کا شہرہ تھا، خداوند تعالی نے ان کو دو فرزند عطا فرمائے تھے، سیّد شریف حسن اور سیّد شریف حسین۔ دونوں بھائیوں نے اپنے خاندان کی علمی اور ادبی روایات کو چار چاند لگائے۔

بڑے بھائی کی تعلیم و تربیت ان کے والد ماجد کی نگرانی میں ہوئی اور وہ جواد العلما کے لقب سے مشہور ہوئے۔ سیّد شریف حسین لکھنؤ چلے گئے، دینی علوم سے استفادہ کیا، بعد ازاں وہ عراق تشریف لے گئے جہاں سے اُنھوں نے مجتہدی کا اجازہ حاصل کیا۔ وہ اعلیٰ پائے کے واعظ و خطیب گزرے ہیں اور شریف العلما کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

انیسؔ مرحوم سے اُن کو تلمذ تھا، اپنے ایک گرامی نامے میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا:

"عرض ایں است کہ من شاگرد شدم جناب میر صاحب، چند رباعی تعلیم کردند و حالا مرثیہ شروع خواہد شد، مقصود ازیں شرف نام است۔"[1]

شریف العلما کو شیخ جعفری شوستری جناب فردوس مآب اور انیسؔ کی شاگردی پر ناز تھا، میر انیسؔ سے مرثیہ تحت اللفظ پڑھنا بھی سیکھا تھا اور مشورۂ سخن بھی کرتے تھے۔[2]

عزیزؔ لکھنوی نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے کہ شریف العلما انیسؔ مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔

تجھ کو خود فخر تھا اس پر کہ ہوں شاگردِ انیسؔ
تجھ پہ کیوں کر نہ کرے ناز زبانِ پنجاب[3]

شریف العلما مرحوم کے بہت کم حالات دستیاب ہو سکے، اس لیے نالۂ عزیز[4] سے ایک بند نقل کیا جاتا ہے تاکہ ان کے علم و فضل کا قدرے اندازہ لگایا جاسکے۔

مرکزِ دائرۂ فضلِ خبیر علام — جس نے کی نصرتِ اسلام میں عمر اپنی تمام
موجۂ قلزمِ اخبار در بحرِ سیر — ماہرِ علمِ رجال و سبق آموز کلام
تھی مصائب پہ مقاتل پہ نظر ایسی بسیط — دل تھا آئینۂ حالاتِ شہید اسلام
فیضِ علامۂ شیخ نجفی[5] طاب ثراہ — ان کی گفتار سے پیدا تھا دمِ ذکر امام
اثرِ قوت روحانی فردوس مآب — ان کی رگ رگ میں رہا خون کے مانند دوام

☆۱۔ سید آغا حسین ارسطو جاہی، میر انیس کا سفرِ دکن (حیدرآباد کی علمی تاریخ کا ایک نادر ورق)، مورخہ ۳۰ محرم ۱۲۸۸ھ مطابق ۳ راپریل ۱۸۷۰ء، یادگار مجلہ بسلسلہ صد سالہ برسی، ناشر دبستانِ انیسؔ، راول پنڈی، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۹

☆۲۔ حیدر سید ظہیر الدین، اعزاز نفس، بار اوّل، مطبوعہ منظور پریس، لاہور، پبلشرز، سنگِ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، جنوری ۱۹۷۵ء، ص ۴

☆۳۔ عزیزؔ مولوی مرزا محمد ہادی لکھنوی، نالۂ عزیز، نور المطابع تھوی ٹول، لکھنؤ، ص ۶

☆۴۔ حوالہ بالا، بند چہارم، ص ۷

☆۵۔ علامہ شیخ جعفر نجفی مصنف خصائص حسینیہ و فوائد المشاہد وغیرہ۔

وہ کیے مجمعِ بحرین☆ سے موتی پیدا | جن سے پھیلی ہے ضیا دین کی مابینِ انام
سعیِ وافر سے زمانے میں کیا نشرِ علوم | جن کے محتاج تھے ہم کام دیے وہ انجام
یاد رکھنا کہ یہ افراد نہیں ہیں مردہ | دیکھنا پیکرِ تصنیف میں تا روزِ قیام

عرصۂ حشر میں سرگرمِ سخن آئیں گے
حلۂ نور کیے زیبِ بدن آئیں گے

شریف العلما ساری زندگی دینِ اسلام کی تبلیغ کرتے رہے، مطبع مجمع البحرین سے بہت سی کتابیں شائع کرائیں اور تقسیم کیں۔

۲۷ رذی قعد ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء کو انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اپنے خالقِ حقیق کے پاس پہنچ گئے۔ شریف منزل (جگراؤں) ہی میں صفِ ماتم نہیں بچھی بلکہ دوسرے شہروں میں بہت سے سوگواروں نے مرحوم کی یاد منانے کے لیے مجلسیں منعقد کیں۔ لکھنؤ میں مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے ناصر الملۃ والدین ابوالفضل، مولانا سید ناصر حسین صاحب نے اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں مجلس کا انتظام فرمایا، شہر کے علما و روسا اس مجلس میں کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

عزیز لکھنوی نے اس مجلس میں حسبِ ذیل قطعہ پڑھا تھا۔

آہ صد آہ شریف العلما | جوہرِ آئینۂ صدق و وفا
گوہرِ قلزمِ ذخارِ شرف | دُرّۃ التاج سرِ مجد و عُلا
بست و ہفتم زمہِ ذی قعدہ | رَخت بر بست ازیں دارِ فنا
نعمتے بود ز انعامِ کریم | آیتے بود وز آیاتِ خدا
گوہرے بود ز گنجینۂ فضل | جوہرے بود ز اسرارِ ہدا
مشعلے بود براوِ ظلمت | جلوۂ بود بطورِ فقہا
کوکبے بود بہ چرخِ رفعت | نیرے بود ز انوارِ سما

☆ شریف العلما اور ان کے برادرِ گرامی جواد العلما نے مذہبی کتابوں کی اشاعت کے لیے لدھیانہ میں ایک مطبع قائم کیا تھا جس کا نام مجمع البحرین تھا۔

آہ ماتم و عزائے مرحوم — آہ ماتم و غم، درد فزا

زد رقم مصرعِ تاریخ عزیز — "بہ جناں است شریف العلما"[☆1]

۱۳۲۹ ہجری

شریف العلما ایک جید عالم تھے۔ انھوں نے مذہبی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، سلام اور مرثیے بھی کہے جو انقلابِ زمانہ کی نذر ہوگئے، انھوں نے حضرت عباسؑ کے حال میں ایک مرثیہ کہا اور میر انیسؔ کو دکھایا، مرثیہ تو محفوظ نہیں رہا، ایک بند یادگار ہے۔[☆2]

ہرگز نہ فراموش کرے گا یہ زمانہ — پانی کے لیے نہر پہ عباسؑ کا جانا

پر یاد میں بھائی کی نہ پیاس اپنی بجھانا — اور چار ہزار اہلِ ستم کو وہ بھگانا

ہر حال میں اقبال و ظفر ساتھ ہے اُن کے

بے دست ہیں، میدان مگر ہاتھ ہے اُن کے

شریف العلما کو تاریخ گوئی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، انھوں نے اپنے والد ارسطو جاہ کی تاریخِ وفات کس خوبی سے نکالی:

فسبحان الذی اسریٰ بعیدہ

۱۲۸۷ ہجری

۱۰۔ ضیاؔ[☆3] سیّد باقر حسن

مولوی باقر حسن لکھنوی نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اٹھارہ یا انیس برس تک رائے بریلی میں وکالت کی۔ بعد ازاں حیدرآباد چلے گئے، وہاں بھی اسی پیشے سے وابستہ رہے۔

☆۱۔ تاریخِ عزیز، ص ۳

☆۲۔ حیدر، سیّد ضمیر الدین، آبروئے وفا، بار اوّل، مطبوعہ پنجاب آرٹس پریس، لاہور، پبلشرز سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۷

☆۳۔ ضیا، سیّد باقر حسن (معتمد مجلسِ عالیہ عدالت) مثنوی ضیائے دکن مع حصہ دوم، طبع ثانی، مطبع برہانیہ، بلدہ حیدرآباد دکن (۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء) ص ۲۔۳

منشی مظفر علی اسیر اور میر ببر علی انیس کے تلامذہ میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔
۱۸۹۱ء میں ضیا نے مثنوی ضیائے دکن لکھی جس میں حیدرآباد کے لنگر کا بیان ہے، ہر سال ۵ر محرم کو یہ جلوس نہایت شان و شوکت اور دھوم دھام سے نکلتا تھا۔ مثنوی کے منظوم دیباچے سے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے شاعر کے حالات اور واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ دیباچہ تحفہ کے قابل نہیں — بہرحال ہے ہدیۂ ناظرین
توجہ ہے دل سے کریں سب خیال — بتاتا ہوں میں مختصر اپنا حال
میں ہوں اک نمک خوار شاہ دکن — تخلص ضیا نام باقر حسن
جواں جب میں تھا دل مرا زندہ تھا — میں گویا چراغ فرو زندہ تھا
مجھے صحبتِ نیک کا عشق تھا — اسی فصل میں شوق تھا نظم کا
تھے استاد میرے انیس و اسیر — کہ تھا مثل جن کا نہ کوئی نظیر
میں اک تربیت یافتہ ان کا ہوں — عنایت جو تھی مجھ پہ وہ کیا کہوں
انھیں سے کوئی دس برس تک رہا — تلمذ کا اور شغل اصلاح کا
یہ سب اس زمانے کی ہے گفتگو — کہ تھا لکھنؤ جب کبھی لکھنؤ

۱۸۵۶ء میں شاہی بساط الٹ گئی، واجد علی شاہ مٹیا برج (کلکتہ) بھیج دیے گئے، لکھنؤ پر فرنگیوں کا عمل دخل ہوگیا۔
ضیا نے ایک مثنوی سکھوں کی بغاوت کے بارے میں لکھی تھی جس کا سنِ تصنیف ۱۳۰۳ھ بتایا جاتا ہے۔

۱۱۔ فارغ، کی رزمیہ شاعری

حکیم سیّد طاہر علی ایک ذی علم بزرگ تھے جن کے اسلاف 'قم' سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ کچھ عرصے وہ قصبہ زید پور (ضلع بارہ بنکی) میں قیام پذیر رہے، بعد ازاں اُنھوں نے سیتاپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔
خداوند تعالیٰ نے ۱۵ر رمضان المبارک ۱۲۶۰ھ (مطابق ۲۷ر جنوری ۱۸۴۳ء)

حکیم صاحب کو ایک فرزند عطا فرمایا، سید محمد افضل نام رکھا گیا۔ ابتدائی تعلیم نو سال کی عمر تک سیتاپور میں ہوئی پھر وہ اپنے نانا مولوی فضل امام کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔

وہاں کا ادبی ماحول محمد افضل کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا، ایک طرف آتش اور ناسخ کے معرکے عروج پر تھے، دوسری طرف میر انیس اور مرزا دبیر آسمانِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک دمک دکھا رہے تھے۔ محمد افضل میر صاحب کی مجلسوں میں شریک ہوئے اور ان کے فن کے نہایت گرویدہ ہوگئے، میر صاحب کا ایک مرثیہ انھوں نے بمشکل حاصل کیا۔ جس کا مطلع ہے:

"جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا"

اس مرثیے نے محمد افضل کے ذوقِ شعری کو ابھارا اور نکھارا۔

۱۸۵۷ء میں جب لکھنؤ جنگِ آزادی کی لپیٹ میں آگیا تو محمد افضل سیتاپور واپس آگئے۔ تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ انھوں نے مشقِ سخن بھی جاری رکھی، اپنے والدِ ماجد سے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں، اس زمانے میں وہ غزلیں کہا کرتے تھے، فضل تخلص کرتے تھے، غزل گوئی میں اچھی خاصی شہرت حاصل کرلی تھی لیکن حکیم صاحب ان کی غزل گوئی کو پسند نہ کرتے تھے، ایک دن افضل نے حکیم صاحب سے کہا، "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں غزل گوئی ترک کردوں تو مجھے انیس کا شاگرد کرادیجیے۔"☆

حکیم صاحب نے اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کیا لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ موقع و محل کے منتظر تھے۔

۱۸۶۰ء میں محمد افضل اپنے والدِ ماجد کے ہم راہ لکھنؤ گئے اور ان سے اپنی خواہش کا پھر اظہار کیا۔ حکیم صاحب کے میر انیس سے دیرینہ تعلقات تھے، وہ انھیں میر صاحب کے دولت کدے پر لے گئے اور ان سے اس ضمن میں گفتگو کی، میر صاحب نے افضل کو گلے لگالیا اور فرمایا:

"یہ میرا بچہ ہے۔ مجھے جو کچھ آتا ہے ان شاء اللہ اسے بہ دل و جان بتاؤں گا،

☆ [illegible] دہلی، سنہ ۱۹۰۳ء، ص ۳۰

آپ مطمئن رہیے۔"☆۱

۱۲۸۱ھ میں جب افضل کو انیسؔ کی شاگردی کا فخر نصیب ہوا تو اُنھوں نے فارغ☆۲ تخلص اختیار کیا۔ وہ ہر روز میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے فنِ مرثیہ خوانی سیکھتے۔ چھ ماہ کی مسلسل مشق کے بعد میر صاحب کے طرز پر ایک مرثیہ سیکھا اور ان سے اجازت لے کر سیتاپور گئے، میر صاحب کا سکھایا ہوا مرثیہ ایک مجلس میں پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔

میر صاحب کے ارشاد کے مطابق فارغ نے مرثیہ گوئی بھی شروع کردی، اپنے والد صاحب کے پاس بلہرہ چلے گئے اور ایک☆۳ مرثیہ کہنا شروع کیا جس کا پہلا بند حسبِ ذیل ہے:

میں بلبلِ حدیقۂ نظمِ انیسؔ ہوں　　پروانۂ سراجِ کلامِ نفیسؔ ہوں
خلاقِ صد نکاتِ دقیق و سلیس ہوں　　اقلیمِ تاج دارِ سخن کا رئیس ہوں
حاسد مقر ہوا سخنِ لاجواب کا
آندھی بجھا سکی نہ چراغ آفتاب کا

مرثیہ کہتے وقت فارغؔ کی جو کیفیت ہوتی تھی، حسبِ ذیل رباعی اس کی ترجمان ہے۔

حالت یہ دمِ فکرِ سخن طاری ہے　　غفلت ہے نہ فارغ کو نہ ہشیاری ہے
آنکھیں وا ہیں بسانِ چشمِ تصویر　　بیداری ہے خواب، خواب بیداری ہے

۱۸۷۲ء میں فارغؔ نے پہلا مرثیہ مکمل کرلیا اور میرؔ صاحب کی خدمت میں بلہرہ سے بغرضِ اصلاح روانہ کیا۔ میر صاحب نے تحریر فرمایا کہ اُن کی موجودگی میں اصلاح دی جائے گی۔ تعمیلِ ارشاد کے لیے فارغؔ لکھنؤ پہنچے۔ میر صاحب نے مرثیے پر

☆۱۔ نہال حسین، حوالۂ بالا، ص ۴۲

☆۲۔ فارغؔ سے تاریخ نکلتی ہے، ۱۲۸۱ھ (مطابق ۱۸۶۴ء)

☆۳۔ فارغؔ، سید محمد افضل سیتاپوری، پہلا مرثیہ، بار اوّل، مطبوعہ امیر المطابع، سیتاپور، ۱۹۱۵ء، ص ۲

اصلاح فرمائی۔ آخری بند میں فارغؔ نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

مضموں بہت نفیس ہیں بندش سلیس ہے
حقا کہ سب یہ فیضِ کلام انیسؔ ہے

فارغؔ کے پہلے مرثیے پر میر صاحب کی اصلاح میں نے خود دیکھی ہے۔ آٹھ آٹھ، دس دس بند کے بعد میر صاحب نے سرخ روشنائی سے کہیں کوئی لفظ کاٹ کر بدل دیا تھا یا بہت سے بہت کوئی مصرع تبدیل کر دیا تھا۔ اس اصلاح کے بہت سے نمونے حیاتِ فارغؔ میں، میں نے درج کر دیے تھے لیکن افسوس ہے کہ حیاتِ فارغ اور اصلاحی مرثیے کا مسودہ اب دونوں مفقود ہو چکے ہیں۔ اس اصلاح کے متعلق میرے ذہن میں جو تاثرات باقی ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ انیسؔ نے ایک باشعور استاد کی طرح خود فارغؔ کے رنگ میں ان کو اصلاح دی تھی، اپنا رنگ فارغؔ پر عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔[☆۱]

فارغؔ نے دوسرا مرثیہ کہنا شروع کیا تھا کہ میر صاحب اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ فارغؔ پر ان کی موت کا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے دوسرے مرثیے[☆۲] میں میر صاحب مرحوم کے کمالات کا اعتراف کیا اور اس کا ثواب اُن کی روح کو بخشا۔

بند ۵۲۱

حضرت کے فیضِ عام سے قطرے گہر بنے
پرتو سے ایک لطف کے شمس و قمر بنے
بگڑا مرا بھی کام ہر اک سر بہ سر بنے
ہر بیت پر بہشتِ معلّٰی میں گھر بنے
ہے مدحِ رزم آپ سے، راس الرئیس کی
اس کا ثواب نذر ہے روحِ انیسؔ کی

اگلے بند میں فارغؔ نے اپنے رنج وغم کا اظہار اس طرح کیا۔

☆۱۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، فردوسِ ہند، مطبوعہ قادری پریس محمد علی روڈ، بمبئی، ناشر کتاب کدہ، ۱۳۰ داکلیٹو روڈ، بمبئی نمبر۶، ۱۹۵۸ء، ص ۲۹۔۳۰

☆۲۔ مطلع یہ ہے: "دیکھ اے مہِ فلک مرے اوجِ کمال کو"

بند ۵۲۲

وہ جب سے اٹھ گئے دلِ فارغؔ اداس ہے
ہر دم ہجومِ درد و غم و رنج و یاس ہے
بس اب کوئی شفیق نہ استاد پاس ہے
لیکن جب آپ کی ہے مدد کیا ہراس ہے
لاکھوں ہی سے لڑے شہِ عالی مقام بھی
یہ معترض ہیں کیا نہ دبے گا غلام بھی

راجا محمد کاظم حسین خاں بہادر والیِ بلہرہ کے ہاں فارغؔ ملازم تھے، اس لیے اُن کا قیام زیادہ تر ریاست بلہرہ میں رہتا۔ ملازمت کے فرائض کی انجام دہی بھی کرتے اور مشقِ سخن بھی۔

ان کا آخری مرثیہ ''علم دارِ کربلا'' ہے، اس کے بارے میں ''حالِ فارغؔ'' میں اُنھوں نے یوں تحریر فرمایا:

''۲۳ر محرم ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء تک اس مرثیے کے ۸۲۷ بند کہے۔ چوں کہ برابر دماغی قوت سے کام لینا پڑا، لہٰذا دفعتاً مجھ کو دردِ سر عارض ہوگیا ہے جس سے مرثیہ کہنا چھوٹ گیا ہے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ دردِ سر ہر وقت رہتا ہے، روشنی نہایت ناگوار ہے، دن بھر دروازے بند کیے اندھیرے میں پڑا رہتا ہوں، بعد غروبِ آفتاب شب کو کسی قدر تسکین ہوتی ہے، دردِ سر کی مصیبت روز بہ روز بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری مصیبت یہ نازل ہوئی ہے کہ میرے بائیں کان کے اندر قرحہ پیدا ہوگیا ہے جس کی تکلیف جداگانہ ہے، دیکھنا چاہیے کہ خداوندِ عالم کو میرے حق میں کیا منظور ہے۔''[☆۱]

بیماری کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۹ر صفر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۷ر جون ۱۹۰۰ء مرض سرسام دماغی سے فارغؔ کا انتقال ہوگیا اور بلہرہ میں دفن ہوئے۔

مرحوم کے چھوٹے بھائی نے قطعۂ تاریخ[☆۲] لکھا جس کے ہر مصرع سے تاریخ وفات عیسوی، فصلی سمت اور ہجری کے حساب سے نکلتی ہے۔

☆۱۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، حالِ فارغؔ، بحوالہ فردوسِ بند ص ۳۶۔۳۷

☆۲۔ فروغؔ، سید ظہور الحسن (مولف) ثمراتِ طیبات، بار اوّل، مطبوعہ امیر المطابع، سیتاپور، ۱۹۱۸ء ص ۸۶۸

وائے دردا فارغ رنگیں بیاں	از جہاں رفتہ اجل را جاں سپرد
۱۹۰۰ء	۱۳۰۷ فصلی
اے فروغ ایں دور گردوں ہم بہ بیں	مدح خوانِ جانِ زہرا حیف مُرد
۱۹۵۷ء ست	۱۳۱۸ ہجری

کوکبِ فارغ☆ میں چھ مرثیے، گیارہ سلام اور بائیس رباعیاں ہیں۔

مطلع	موضوع	تعداد بند	سنہ تصنیف
۱۔ میں بلبلِ حدیقۂ نظمِ انیس ہوں	حضرت علی اکبرؑ	۳۸۸	۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء
۲۔ دیکھ اے سپہرِ فلک مرے اوجِ کمال کو	حضرت امام حسینؑ	۶۶۹	۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء
۳۔ بخدا مظہرِ اسرارِ خدا ہیں احمدؐ	حضرت علی اکبرؑ	۲۵۳	۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء
۴۔ میں اور معنی ہوں خداوندِ سخن ہوں	حضرت عبداللہ بن حسنؑ	۳۹۴	۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء
۵۔ ریاضِ دہر ہرا کن کے فیضِ عام سے ہے	ہجرتِ رسولِ خداؐ	۱۰۷	۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء
۶۔ شوکت نمائے فوجِ سخن ہے علم مرا	حضرت عباسؑ	۸۲۷ (نامکمل)	۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء

میر انیس نے مرثیے کے تمام اسرار و رموز سے فارغ کو روشناس کروایا تھا۔ قابل استاد کی صحبت، اپنی طبع کی صلاحیت کی وجہ سے فارغ ایک کامیاب مرثیہ گو اور مرثیہ خواں گزرے ہیں۔ ان کے مرثیوں کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی "شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی رزمیہ شاعری ہے جس میں انیس کی شائستگی،

☆ فارغ سیتاپوری، کوکبِ فارغ، بار اوّل، امیر المطابع، سیتاپور، ناشر سید محمد حیدر ندیم، ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۵ء

فردوسی کا ہمسر، تلسی داس کا خلوصِ فکر اور ہومر کا آہنگ بیک وقت موجود ہیں۔"☆۱

رزمیہ شاعری

رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم (Epic Poem) کہتے ہیں، شاعری کے انواع میں سے بہترین نوع ہے۔ یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اسکا کارنامۂ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے۔ مہا بھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں، وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے۔☆۲

جب تک کسی شاعر کے دل میں ولولہ اور جوش نہ ہو، وہ فاقہ کرنے کو، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر نہ سمجھتا ہو، ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح نہ دیتا ہو، اس وقت تک وہ رزم گوئی میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔☆۳

ایپک کی خصوصیات کا ماحصل یہ ہے:

۱۔ ایک نظم ہو جس میں کہانی موجود ہو۔

۲۔ یہ کہانی ایسی ہو جس کا مواد انسانی تجربے سے بڑا قریبی تعلق رکھتا ہو۔

۳۔ اس کہانی میں جو عمل موجود ہو، وہ مہتم بالشان ہو، واحد ہو اور مکمل ہو۔

۴۔ شاعر مواد زندگی سے اخذ کرے اور اس سلسلے میں اپنے تصورِ حیات، اپنے عقیدے یعنی اپنی ذاتی اقدار مطلق سے کام لے۔

۵۔ اس کی زبان سلیس بھی ہو اور پر شکوہ بھی۔☆۴

موضوع

رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں۔

واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا ہو۔

☆۱۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، فردوسیِ ہند، ص ۱۰۹

☆۲۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اول، مطبوعہ رشید آرٹ پریس۔ لاہور، ناشر ملک نذیر احمد، ص ۱۲۰

☆۳۔ مسعود حسن رضوی، پروفیسر، روحِ انیس، مطبوعہ انڈین پریس، الٰہ آباد لمیٹڈ، ۱۹۲۷ء، ص ۲۷۔ ۲۸

☆۴۔ سجاد رضوی، پروفیسر، مرثیہ اور ایپک، سہ ماہی صحیفہ، لاہور، شمارہ نمبر ۵، بابت جون ۱۹۵۸ء، ص ۲۶

لڑائی کے ہنگامے کا بیان اس زور شور سے اور پُر رعب طریقے سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں، سالارِ فوج اور مشہور بہادروں کی لڑائی کے بیان میں تمام داؤ پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں۔☆

مرثیے کے موضوع کی اہمیت میں کسے کلام ہوسکتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی مدینۂ منورہ سے روانگی، مکۂ معظمہ میں مختصر قیام کے بعد کربلائے معلیٰ میں ورود، یومِ عاشور ۶۱ھ حق و باطل کا معرکہ ہوا بظاہر باطل کی فتح لیکن دراصل یہ حق کی فتح تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کا دل کش اور صداقت پر مبنی شعر ملحوظِ خاطر رہے۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے　　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

معرکۂ کربلا نے دنیا میں انقلاب بھی پیدا کردیا اور اسلام کی بنیادیں بھی استوار کردیں۔ خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ کی مقبول رباعی آج بھی شیدایانِ اسلام سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہے۔

شاہ ہست حسین بادشاہ ہست حسینؑ　　　دین ہست حسین دیں پناہ ہست حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید　　　حقا کہ بنائے لاالہ ہست حسینؑ

اس ضمن میں علامہ اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرمایا:

زندہ حق از قوتِ شبیری است　　　باطل آخر داغِ حسرت میری است

یزید کی بیعت سے انکار کر کے، امامِ عالی مقام نے راہِ خالق میں اپنا گھر بار لٹا کر، بڑی سے بڑی قربانی دے کر، ظلم و استبداد کی بنیادیں ہلا دیں، یہ ان کے حسنِ عمل ہی کا کرشمہ ہے کہ دنیا میں اسلام باقی رہ گیا۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است　　　پس بنائے لا الہ گردیدہ است

(اقبال)

واقعۂ کربلا کا مہتم بالشان ہونا بھی مسلّم ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے امام حسینؑ کے کارناموں کو سراہا ہے۔

☆ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اوّل، ص ۱۴۰

ایپک (Epic)☆۱

جتنی ایپک نظمیں ہیں اور جس قوم سے متعلق ہوں، وہ بالعموم وہاں کے دیوتاؤں یا بلند مرتبت قومی سورماؤں کے کارنامے (Deeds of Heroes) ہیں اور ان سب میں مافوق الفطرت اور حیرت انگیز عناصر بھی کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ نیز ان افسانوں یا اساطیر کو مذہبی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔☆۲

رزمیہ شاعری کے ایسے بھی نمونے ہیں جو ہومر کی تقلید سے مستغنی ہیں، مثلاً مہابھارت اور رامائن جن کا سنہ تصنیف تقریباً پانچ سو سال قبل مسیح ہے اور فردوسی کا شاہنامہ جو ۴۰۰ھ مطابق ۱۰۰۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔

اردو زبان میں ایسے مرثیے ہیں جن میں رزمیہ شاعری کا عنصر نمایاں ہے۔ ایپک شاعری کی چند خصوصیات اور بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ اس میں ڈرامائی انداز بہت ضروری ہے۔ ایپک ڈراما نہیں ہے لیکن اسے ڈرامائی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے تاکہ دیگر اصناف شاعری کے مقابلے میں وہ زیادہ موثر، دل کش اور دل آویز ثابت ہو۔

مؤرخ حقائق کی روشنی میں واقعات کو بیان کرتا ہے اور اُن کی تفصیلات کا جائزہ بھی لیتا ہے لیکن رزمیہ شاعر ایسی باتیں نظم کرتا ہے جن کے واقع ہونے کا امکان پایا جاتا ہے۔

☆۱۔ پہلی ایپک ہومر کی ایلیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssy) ہیں۔ جن کا سنہ تصنیف تقریباً سات سو سال قبل مسیح ہے۔ ہومر کی تقلید میں رزمیہ شاعری کا رواج ہوا اور دوسری زبانوں میں بھی ایپک لکھی گئی مثلاً
لاطینی زبان میں ورجل کی (Aeneid) تیس سال قبل مسیح لکھی گئی۔
انگریزی زبان میں (Beowulf) چھٹی یا ساتویں صدی میں لکھی گئی۔
فرانسیسی زبان میں Chanson of Rolland گیارہویں صدی کے آخر میں لکھی گئی۔
اطالوی زبان میں تاسو کی تصنیف Jerusalem Delivered ہے۔
۱۵۷۲ء میں پرتگالی زبان میں The Lucidas لکھی گئی۔

☆۲۔ اثر لکھنوی، مرزا جعفر علی خاں، انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات کا جواب، طبع اوّل، مطبوعہ ادبی پریس، لکھنؤ، ناشر دانش محل لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۱ء، ص ۳۰

یہ بھی ضروری ہے کہ ایپک کو پڑھ کر سالمیت کا احساس ہو یعنی اس کا آغاز ہو، ارتقا ہو اور اختتام بھی۔ ایپک میں مختلف واقعات نظم کیے جاتے ہیں لیکن اُن میں تسلسل اور ہم آہنگی لازمی ہے۔ ایپک کو سبق آموز بھی ہونا چاہیے اور نیک اعمال کی تلقین بھی کرے تاکہ اس پر دوام کی مہر ثبت ہو سکے۔

مرثیے کے تعمیری دور میں میر ضمیر نے رزمیہ شاعری کی ابتدا کی۔ میر انیس نے اس صنف کو عروج پر پہنچایا۔ فارغ نے میر صاحب سے استفادہ کیا تھا۔ رزمیہ شاعری ان کے مرثیوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

فکر انگیزی

رزمیہ شاعری جوش و ولولہ خیز ہوتی ہے اور فکر انگیز بھی۔

۲ محرم الحرام ۶۱ھ کو یزیدی فوج کا ہراول دستہ نہایت آن بان سے کربلا میں داخل ہوا۔ فارغ نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دشتِ کربلا میں دف و چنگ کی صدائیں رہواروں کے قدم قدم پر صیحے اور ان کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

ناگاہ☆ آئی دور کے باجوں کی کچھ صدا　　پیدا ہوئی جیاہی لشکر بھی جا بجا
تھرایا بار فوج سے صحرائے کربلا　　گیتی کا زلزلہ ہوا محسوس زیرپا
ظلمت سیہ نشانوں کی آگے بڑھی ہوئی
اک رات تھی کہ آئی تھی دن پر چڑھی ہوئی

رفقائے شاہ کو جب معلوم ہوا کہ یہ لشکرِ شام کے نشان ہیں تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہم ہیں امام علیہ السلام کے غلام، بھلا اس لشکر کی ہماری نگاہ میں کیا بساط، جب حضرت عباسؑ نے جوشِ شجاعت کے سخن سنے تو ان کو مرحبا کہا اور فرمایا:

اس طرح خاک میں صفِ افواج شر ملے　　پیچھے جو رہ گئے ہوں نہ اُن کو خبر ملے

اعزہ اور انصار اپنی شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھانے کے لیے بے قرار

☆ فارغ سیتاپوری، چھٹا مرثیہ، بند ۸۸، ص ۲۳

ہو گئے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے تیار:

یہ ذکر تھا کہ بھر گیا میداں سپاہ سے ☆[1] — صحرا تمام ہو گیا پنہاں نگاہ سے
نعرے کیے جو بڑھ کے شریروں نے راہ سے — بھاگا لرز کے امن مقامِ پناہ سے

دوڑے فرس کہ آ گئی آفت جہان پر
اڑ کر چلا زمیں کا طبق آسمان پر ☆[2]

چوتھے مصرعے کا بیت سے ربط کس قدر معنی خیز ہے، بیت بھی لاجواب ہے اور الفاظ کا انتخاب بھی۔

رزمیہ شاعری میں اعتقادات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

امام حسینؑ کربلائے معلّٰی پہنچ گئے، نہر فرات کے قریب خیامِ اہلِ بیت کے نصب کیے جانے کا انتظام ہو رہا تھا، اس کی عکاسی فارغؔ نے اپنے خصوصی انداز میں کی ہے:

پہنچی مقام پر جو سواری حضور کی — نوبت بجی سلامیِ شاہِ غیور کی
مشتاق تھی جو یمنِ قدم کے ظہور کی — پاس آ گئی سمٹ کے زمیں دور دور کی

دامن بڑھا دیا تو گلِ مدعا ملے
نزدیک تھا کہ اٹھ کے رکابوں سے جا ملے ☆[3]

طرزِ بیان میں کس قدر دل کشی ہے، زمین کا سمٹ کر پاس آ جانا بظاہر مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب دماغ میں یہ خیال ہو کہ حضورِ اکرمؐ کے نواسے، حضرت علیؑ کے نورِ نظر، بی بی فاطمہؓ کے لختِ جگر، دینِ حق کی تبلیغ اور بقا کے لیے دشتِ نینوا میں تشریف

☆۱۔ فارغؔ، حوالۂ بالا، بند ۹۳، ص ۲۵

☆۲۔ اس ضمن میں فردوسی کا حسبِ ذیل شعر ملحوظِ خاطر رہے۔

زبس گردِ میداں کہ پر شد ز دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

معرکۂ کارزار گرم ہے گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدانِ جنگ میں اس قدر غبار اڑا کہ زمین کا ایک طبقہ آسمان تک پہنچ گیا۔ زمین کے سات طبقے اور آسمان کے سات طبقے ہوتے ہیں، اب آسمان کے آٹھ طبقے ہو گئے اور زمین کے چھ طبقے ہو گئے اور زمین کے چھ طبقے رہ گئے۔

☆۳۔ فارغؔ حوالۂ بالا، بند ۴۷، ص ۱۳

لائے ہیں تو یہ مبالغہ آرائی نہ رہے گی۔

یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ امامِ مبین☆[1] خشک و تر کا مالک ہوتا ہے، تمام کائنات اس کے زیرِ نگیں ہوتی ہے۔

جذبات نگاری

رزمیہ شاعری میں جذبات نگاری کے بھی عمدہ نمونے ہوتے ہیں۔ کربلائے معلی پہنچتے ہی بی بی سکینہ پر شدتِ پیاس سے غشی کی کیفیت طاری ہوگئی، حضرت عباسؑ اپنی لاڈلی بھتیجی کے لیے پانی لائے اور فرمایا:

"لو جامِ آب کہہ دو کہ عباسؑ لائے ہیں"

اس کے بعد فارغؔ کی زبان سے سنئے:

عمو☆[2] کا نام سن کے وہ چونکی تو دی صدا — جلدی اٹھاؤ مجھ کو کدھر ہیں مرے چچا
پردے میں گھٹ گئی ہوں میں باہر کی دو ہوا — کیوں میری پیاری کہہ کے بلاتے نہیں یہ کیا
کڑھتی ہوں کب تلک نہ گلے سے لگائیں گے
پانی پیوں گی جب مجھے عمو پلائیں گے

(محمل کے) پردے میں گھٹ گئی ہوں، اس لیے باہر ن کھلی ہوئی ہوا ملے تو جان میں جان آئے۔ چچا جان سے شکوہ ہے کہ میری پیاری کہہ کے کیوں نہیں بلاتے، میں ہوں تو پیاسی لیکن اپنے عمو جان ہی کے ہاتھ سے پانی پیوں گی۔ بھتیجی کی ضد اپنے چچا سے کس قدر فطری ہے۔

امام عالی مقام جب کربلائے معلّٰی پہنچے تو آپ کی ہمشیرہ حضرت زینبؑ نے یہ تجویز پیش کی کہ کچھ دنوں یہیں قیام کیا جائے کیوں کہ سفر میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، پانی کا بھی خاطر خواہ انتظام ضروری ہے، اس کے لیے ایسے شخص کو مہتمم آپ مقرر کیا جائے جو معتبر ہو اور تلوار کا دھنی ہو۔

☆۱۔ وکل شیٍٔ احصیناہ فی امام مبین۔ (سورۂ یٰسین) پارہ ۲۲۔۲۳

☆۲۔ فارغؔ، حوالۂ بالا، بند ۶۵، ص ۱۸

امام حسینؑ پر ان باتوں کا جو اثر ہوا، فارغؔ نے اسے یوں ادا کیا۔

سن کر[۱] بہن کی باتوں کو تا دیر روئے شاہ
فرمایا دشمنوں نے نکالا وطن سے آہ
گھر میں خدا کے بھی نہ مسافر کو دی پناہ
منظور ہے انھیں کہ ہوں بچے مرے تباہ
دنیا پھری ہوئی ہے نہ کب تک بکا کروں
زینبؑ تمھیں بتاؤ کدھر جاؤں، کیا کروں!

فارغؔ نے مندرجہ بالا بند میں تاریخی واقعات کو نظم کرکے اپنی فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ ''دنیا پھری ہوئی ہے'' اس مختصر سے جملے میں انقلابِ زمانہ کی روداد مضمر ہے۔ ہر جگہ اعدائے دین میرے خون کے پیاسے ہیں، اس دشتِ نینوا کے چاروں طرف ناکابندی ہے، اس لیے یہاں سے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ''کیا کروں'' میں بے کسی و بے بسی کی داستان ہے۔

طوالت کے خوف سے جذبات نگاری کے مزید نمونے نہیں پیش کیے جائیں گے۔ ''مجموعی طور پر ایک مضبوط ساخت کی ایک ایسی بیانیہ نظم ہے جس میں واقعات اور عظیم کرداروں کا بیان ہو جس کا اسلوبِ بیان موضوع کی عظمت کے مناسب ہو اور جس میں مقصد کی بلندی، عمل، کردار اور واقعات کی رہینِ منت ہو۔''[۲]

کردار نگاری

رزمیہ شاعری میں کردار عظیم، عہد آفریں اور مثالی ہونے چاہئیں۔ امام حسینؑ کا مختصر لشکر بہتر مجاہدین پر مشتمل تھا جس میں حضرت حبیب جیسے مسن بھی تھے اور حضرت علی اصغر جیسے کم سن بھی، اٹھارہ بنی ہاشم کا ایک گل دستہ تھا، باقی انصار امام علیہ السلام تھے۔ حسینی فوج کے ہر ایک ہیرو کا کردار قابلِ فخر بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔

شبِ عاشور امام عالی مقام نے اپنے رفقا اور اعزہ کی گردنوں سے اپنی بیعت اٹھالی اور فرمایا جس شخص کا جہاں جی چاہے چلا جائے۔ یہ سن کر بزرگ صحابی

[۱]۔ فارغؔ، حوالۂ بالا، بند ۳۷، ص ۲۰
[۲]۔ پروفیسر ڈکسن، English Epic and Heroic Poetry، ص ۲۴

حضرت مسلم بن عوسجہ نے اپنے جذبات کا یوں اظہار فرمایا۔

یا سرورِ زماں[☆1] قسمِ ربِ انس و جاں
چھوڑوں گا میں نہ آپ کو جب تک ہے تن میں جاں
جو ولولے ہیں کیوں ابھی منھ سے کریں بیاں
وقت ان کا معرکہ میں ہے کل وقتِ امتحاں
کانپے گا رن مچیں گی وہ دھومیں ستیز کی
برسوں ہوا سے آئے گی بو تیغِ تیز کی

مختلف اسلحہ جنگ اپنے جسم پر سجا کر اعدائے دیں سے اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک تمام حربے بیکار نہ ہو جائیں۔

حضرت حبیب ابنِ مظاہر کے کردار کی ایک جھلک دیکھیے:

بولے حبیب بڑھ[☆2] کے کہ یا شاہِ نامدار — خادم بھی یوں ہی مر کے جیے گر ہزار بار
واللہ پھر بھی آپ کے قدموں پہ ہوں نثار — کہتے ہیں جو وہ کر کے دکھا دیں یہ خاکسار
دس پر نہ بند ہوں گے نہ سو کی قطار پر
بھاری ہے ایک ایک کا مردہ ہزار پر

انصارانِ امام حسینؑ نہایت بلند کردار کے مالک تھے، تعریف و توصیف سے مستغنی۔

جھرمٹ[☆3] مصاحبوں کا جو سرور کے ساتھ ہے
مجمع صحابیوں کا پیمبرؐ کے ساتھ ہے
ایک ایک باخدا ہے جو لشکر کے ساتھ تھے
امت نبیؐ کی شافعِ محشر کے ساتھ ہے
قدسی اِدھر اُدھر ہیں شہِ مشرقین کے!
ہیں سب کے ہاتھ دامنِ زیں پر حسینؑ کے!

☆1۔ دوسرا مرثیہ، بند ۸۱، ص ۴۲
☆2۔ تاریخ حوالۂ بالا، بند ۸۶، ص ۴۳
☆3۔ تاریخ، چھٹا مرثیہ، بند ۳۳، ص ۱۴

کائنات میں ایسے رفقا بھلا کس کو نصیب ہوئے جن میں سے ہر ایک باخدا ہو۔ بندے کی معراج ہے باخدا ہونا، یہ ہے انسان کے کردار کی رفعت اور بلندی، عظیم کرداروں کے چند اور نمونے:

حضرت عباس امامِ عالی مقام کے وفادار بھائی، سپاہِ حسینی کے علم دار اور شجاعت کا پیکر تھے۔ ان کی دعا تھی کہ ولائے آلِ محمدؐ میں ثابت قدم رہیں۔ جسم سے سر جدا ہونے کے بعد بھی رخ شاہِ امم کی طرف رہے۔

لُٹ☆ جائیں گھر تباہ ہوں، برباد ہوں عیال
آنکھوں سے دیکھیں مٹتے ہوئے سب متاع و مال
تیغوں سے پرزے پرزے ہوں لاشے ہوں پائمال
چھوٹے مگر نہ دامنِ سلطانِ خوش خصال
مر کر بھی ابنِ شاہِ ولایت کے ساتھ ہوں
اٹھیں جو حشر میں بھی تو حضرت کے ساتھ ہوں

حضرت عباس اشجعِ عرب تھے، امامِ عالی مقام سے ان کو بے حد محبت تھی اور عقیدت بھی، بھائی ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو امام کا غلام کہا کرتے تھے۔

حضرت امام حسینؑ کو حضرت عباسؑ سے بڑی ڈھارس تھی جب اُنھوں نے بھی جامِ شہادت نوش فرمایا تو امام علیہ السلام نے فرمایا قد انکسرت ظہری، عباس تمھارے مرنے سے میری کمر ٹوٹ گئی۔

علم دارِ لشکر کی شہادت کے بعد حضرت علی اکبرؑ عازمِ رزم گاہ ہوئے لیکن اُن کو اذنِ وغا نہیں ملی۔ امامِ عالی مقام بنفسِ نفیس میدانِ کارزار میں جانے کے لیے تیار ہوئے۔

اُس وقت حضرت علی اکبرؑ نے فرمایا کہ اے شاہِ نام دار! پہلے مجھے خدا کی راہ میں نثار کر دیجیے، حضرت کے دشتِ کارزار کی طرف روانہ ہوتے ہی یہ خاکسار زمین

☆ قارئیں حوالہ بالا، بند ۱۶، ص ۱۷

پر تڑپ تڑپ کر مرجائے گا۔ پہلے اپنے غلام کا سر کاٹ ڈالیے، اس کے بعد آپ عازمِ جنگ ہوں۔

کیوں کر حضور☆ ہوں گے ابھی عازمِ وغا — مولا نکل نہ جائے گا دم اس غلام کا
بیٹا جو ایسے وقت میں کردے نہ سر فدا — دشمن وہ باپ کا ہے نہ بخشے اسے خدا
میں اور مدد کروں نہ امام غیور کی
حاشا نہ ہو سکے گا دوہائی حضور کی

آسان الفاظ میں کوٹ کوٹ کر خلوص بھرا ہوا ہے، آڑے وقت میں امام علیہ السلام پر جان قربان کرنا ہی تو عین ایمان ہے، بھلا اس سعادت سے حضرت علی اکبر کیسے محروم رہ سکتے تھے، فرض اور محبت کا بھی تو کچھ تقاضا ہوا کرتا ہے۔ عظیم کرداروں کی چند جھلکیاں پیش کی گئیں۔

مرثیہ کا مہتم بالشان ہیرو وہ ہے جس کی عظمت کو صرف مسلمانانِ عالم ہی نے تسلیم نہیں کیا بلکہ دوسرے مذاہب کے افراد بھی اس کے گرویدہ ہیں اور اس کی قربانیوں کے معترف ہیں۔

''دنیا کا کوئی شہید یا شہدا کا سلسلہ حضرت امام حسینؑ کی عظمت اور ان کے حسنِ عمل کا مدِمقابل نہیں ہوسکتا۔'' (مہاراجا سر کرشن پرشاد)

خداوند تعالیٰ پر یقین کامل

''سانحہ کربلا سے ہم کو بہترین درس یہ ملتا ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے رفقا کو اللہ تعالیٰ پر یقین تھا، انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ معرکۂ حق و باطل میں لشکر کی کثرت کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ امام حسین کو قلیل لشکر کی معیت میں جو فتح ہوئی، اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔'' (کارلائل)

''شہادتِ کربلا کا واقعہ انسانی تاریخ کے واقعات میں ناقابلِ فراموش ہے اور کائناتِ عالم کے کروڑوں افراد کی زندگی پر خوش گوار اثرات مرتب کرے گا۔'' (ڈاکٹر راجندر پرشاد)

☆ فارغ، پہلا مرثیہ، بند ۹۲، ص ۲۲

امام حسین عدل کے علم بردار تھے

''امام حسین اور ہر بہادر شہید کے کارنامے سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ عدل، رحم اور محبت کے ابدی اصول اٹل اور ناقابلِ تسخیر ہوا کرتے ہیں، برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور (دلیر) افراد کی قربانیاں پیش کرنے سے اصولوں کا پرچم ہمیشہ بلند رہے گا۔'' (سر فریڈرک جیمس)

''تاریخ کے اہم واقعات میں سے سانحۂ کربلا کے عظیم اور اَن مٹ نقوش ہیں جو صفحۂ ہستی پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔'' (پنڈت جواہر لال نہرو)

میرے ہیرو امام حسینؑ

امام حسینؑ اگر یزید کی بیعت کر لیتے تو وہ (دنیاوی) خطروں سے محفوظ رہ سکتے تھے لیکن ایک مصلح کی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر انھوں نے یزید کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ہر قسم کی پریشانی اور ہر طرح کے رنج و آلام برداشت کرنے کے لیے تیار تھے تاکہ دینِ اسلام صحیح طریقے سے پیش کیا جاسکے، دشتِ کربلا کی وہ حرارت اور تپتے ہوئے صحرائے عرب کی شدید گرمی سے ان کے عزائم میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔'' (واشنگٹن اِرونگ)

''اگر امام حسینؑ دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے معرکہ آرا ہوتے تو مخدراتِ عصمت اور بچوں کو اپنے ساتھ لے کر (کربلائے معلّٰی کیوں جاتے) اس لیے یہی قرینِ قیاس ہے کہ اُنھوں نے تمام قربانیاں اسلام کی بقا کے لیے پیش کیں۔'' (چارلس ڈکنس)

جوشؔ کی زندۂ جاوید رباعی کی صداقت اظہر من الشمس ہے۔

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ — چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو — ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

امامِ عالی مقام کے عہد آفریں کردار کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

۲رمحرم ۶۱ھ کو جب امام حسین علیہ السلام اپنے اعزہ و انصار سمیت واردِ کربلا

ہوئے تو آپ نے فرمایا، یہ کربلا ہے، ہر سعید کی جگہ رب مجید کی محبت کا معیار۔

جویا☆ اسی کے ہم بھی تھے آج آئے ہیں ادھر

انجام جو ہو اس کی توجہ پہ ہے نظر

ہر گام پر ہیں راہِ محبت میں سو خطر

ہوتی ہے دیکھیں اپنی مہم کس طرح سے سر

عاشق وہی ہے جو تہِ خنجر گلو رکھے

ہو وقتِ امتحاں تو خدا آبرو رکھے

پانچویں مصرع میں عشقِ الٰہی کی کتنی صحیح تعریف ہے۔ ایسے عاشق کی زندگی کا مطمحِ نظر بس یہی ہوتا رضا بقضائہٖ وتسلیما لامرہٖ۔

امام علیہ السلام کے کردار کی متضاد خصوصیات فارغؔ نے حسبِ ذیل بیت میں کس خوبی سے نظم کی ہیں۔

دعویٰ جلال کا ہے کہ بیٹے علیؑ کے ہیں

رحمت پکارتی ہے نواسے نبیؐ کے ہیں

جب ذوالفقارِ علیؑ نیام سے نکلی تو سپاہِ روم و رے، کوفہ و شام کا صفایا ہوگیا، رن بولنے لگا۔ دوہائی کی آوازیں بلند ہوئیں، نانا کی امت پر رحم آگیا، ہاتھ روک لیا۔ نبی کے نواسے ہیں، اس لیے "ہنگامِ ذبح لب نہ ہلیں گے بجز دعا۔"

دنیائے شاعری کیا ایسے عظیم کردار پیش کرسکتی ہے۔

سراپا

مرثیے کے تعمیری دور میں سراپا کو مرثیہ کے قوام میں شامل کرلیا گیا۔ اس لیے رزمیہ شاعری میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔

شاعر ہیرو کے جسمانی اعضا کی تعریف پرشکوہ الفاظ میں کرتا ہے، نادر تشبیہات کا سہارا لیتا ہے، سراپے کے بیان کرنے میں فرقِ مراتب کا لحاظ بہت ضروری ہے۔

☆ فارغؔ، چھٹا مرثیہ، بند ۵۵، ص ۱۵

حضرت حبیب ابنِ مظاہر امام علیہ السلام کے ایک سن رسیدہ رفیق تھے، شوقِ شہادت سے سرشار وہ دشمن سے جنگ کے لیے تیار ہیں۔

ہاتھوں[☆1] سے یوں چڑھائے وہ ابروئے بے مثال
پٹی جبیں پہ کھینچ کے باندھی بصد جلال
پلکیں اٹھیں ابل پڑیں آنکھیں وہ لال لال
تیوری چڑھی لرزنے لگا عرصۂ قتال
خطِ نظر کھنچی ہوئی شمشیر بن گیا
چہرہ خدا کے قہر کی تصویر بن گیا

تشبیہات کی ندرت محاکات کی دل آویزی اور تخیل کی رنگ آمیزی قابلِ صد ستائش ہے۔ بیت بار بار پڑھیے تصویر کے نقوش ابھرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ''چہرہ خدا کے قہر کی تصویر بن گیا'' غضب کی مرقع کشی ہے، فارغ کی فن کاری کی داد دیجیے۔

فارغ نے حضرت علی اکبر کا سراپا کئی مرثیوں میں نظم کیا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔

وہ سبک[☆2] خیزی رہوار وہ اسوار کی شان — رخ پہ لہرانے میں وہ کاکلِ طرار کی شان
ضو وہ پیشانی کی وہ روئے ضیا بار کی شان — ساری شانوں سے جدا حیدر کرار کی شان

مل ہیں ابرو پہ تو گیسو ہیں معنبر دونوں
ایک پیکر میں ہیں یا احمدؐ و حیدرؑ دونوں

چھٹا مصرع کس قدر جامع ہے۔ حضرت علی اکبرؑ شبیہ پیمبرؐ بھی تھے اور حضرت علی کی شجاعت کے ورثہ دار بھی۔ مصرع بلاغت کی روح ہے اور فصاحت کی جان ہے۔ اس مفہوم کو شاید ہی کسی شاعر نے اس طرح ادا کیا ہو۔

حضرت علی اکبرؑ کے رخِ تاباں کے لیے فارغ کہاں کہاں سے تشبیہیں لائے ہیں، تخیل اور تصور کی رسائی، اللہ اکبر۔

☆۱۔ فارغ، دوسرا مرثیہ، بند ۱۲۷، ص۷۰

☆۲۔ فارغ، تیسرا مرثیہ، بند ۸۲، ص۴۴

پر تو رخ☆[۱] کو جو کہتے ہیں سحر کا جلوہ | شاید آنکھوں میں نہ ہو ان کی نظر کا جلوہ
ان پہ روشن ہے یہ جلوہ ہے بشر کا جلوہ | جلوۂ طور ہے اس رشکِ قمر کا جلوہ

چاندنی لے کے عجب نور کا روپ آئی ہے
دھوپ پر دھوپ ہے یا چھاؤں پہ دھوپ آئی ہے

فارغ نے جولانیِ طبع کے جوہر دکھائے، نادر تشبیہات سے کلام میں لطف پیدا کردیا۔ چوتھے مصرعے کے بعد بظاہر مضمون میں کسی اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی لیکن شاعر نے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

چھٹا مصرع سحر حلال ہے جس میں معنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

''دھوپ پر دھوپ ہے یا چھاؤں پہ دھوپ آئی ہے''

فوجِ مخالف کا ایک پہلوان بکر بن غانم حضرت علی اکبرؑ سے معرکہ آرا ہوا فارغ نے اُس کو وہ پیکر عفریت کی ظاہری صورت کے ساتھ ساتھ اُس کی طینت کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔

سب کے آگے ہے☆[۲] نئی شکل کا اک دیو مہیب
کوہ تن رخش کی بھی صورت و ہیئت ہے عجیب
تند و پرشور شرارت میں شیاطیں کا ادیب
موت بھی آئے تو ڈرتی ہوئی سرکش کے قریب

مڑ کے تکتا ہے تو سب فوجِ لعیں دبتی ہے
تن کا لنگر ہے کہ سائے سے زمیں دبتی ہے

طول☆[۳] قامت کو نہ دیکھے سے رہے تاب شکیب
پاؤں ٹک جائیں زمیں پر جو نہ روکے ہو رکیب

☆۱۔ فارغ، تیسرا مرثیہ، بند ۹۵، ص ۲۵
☆۲۔ فارغ، تیسرا مرثیہ، بند ۱۵۷، ص ۴۱
☆۳۔ فارغ، تیسرا مرثیہ، بند ۱۵۸، ص ۴۱

وہ فرس اور وہ تن ظالم پر مکر و فریب
قد بڑھائے ہوئے بیٹھا ہے شجر پر آسیب
لاکھ اڑے گرد قدم خاک نہ سر تک پہنچے
اٹھ کے پہنچے جو بگولا تو کمر تک پہنچے

فارغؔ نے مہیب دیو کی قامت کی مناسبت سے ایسی صفات اور تشبیہات استعمال کی ہیں جن سے اس بدہیئت پہلوان کی صورت کا ہیولیٰ اور اس کی نفسیاتی کیفیات کا مرقع سامعین اور قارئین کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دراصل یہی فن کی معراج ہے۔

قد بڑھائے ہوئے بیٹھا ہے شجر پر آسیب، اس مصرعے کی بلاغت کا کیا کہنا، مشہور ہے کہ پرانے درختوں پر آسیب ہوتا ہے لیکن قد بڑھائے ہوئے کے ٹکڑے نے معنویت میں کس قدر اضافہ کر دیا۔ یہ اربابِ نکتہ داں کے لیے محلِ فکر و نظر ہے۔

رجز

سرزمینِ عرب میں شعرا نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ امن کے زمانے میں وہ اپنے قبیلے والوں کے کارناموں کا تذکرہ فخریہ انداز میں کرتے، جنگ کے دوران وہ افرادِ قوم کی غیرت کو للکارتے اور اُن کے جذبات کو ابھارتے، عزم و ہمت اور جوش و شجاعت کے نغمے بکھیرتے۔

تعمیری دور میں مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں رجز کا بھی شمار ہونے لگا۔

فارغؔ کی رزمیہ شاعری سے رجز کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔

اسد اللہ کے لال حضرت عباسؑ کا رجز☆ سنیے جس سے میدانِ جنگ کانپ کانپ اٹھا۔

ہم شیرِ بیشۂ اسد قلعہ گیر ہیں ۔ ہم سرفروشِ راہِ خدائے قدیر ہیں
ہم جاں نثارِ خسروِ گردوں سریر ہیں ہم ورثہ دارِ زورِ جنابِ امیر ہیں

☆ فارغؔ، چھٹا مرثیہ، بند ۱۱۷، ص ۳۱

ہم ہیں کہ چلنے دیں نہ کسی پر دغا کا زور
ہم میں علی کا زور علی میں خدا کا زور

وہ زور جس سے ساکنِ خیبر ہلاک ہوگئے تھے، اب تک درِ خیبر کھلا ہوا ہے اور جہاں میں اس کی دھاک بندھی ہوئی ہے، شاہِ دوجہاں کے جاں نثار کم سہی اور افواجِ دشمن لاتعداد لیکن ایسی چیونٹیوں کی قطار بھلا کس شمار میں، شیرانِ روزگار تو ان کو پاؤں سے روند ڈالیں گے، اگر فوج نہر پر آجائے تو اسے ڈبو کر ہلاک کردیں کیوں کہ ہم میں اسد اللہ کا زور ہے۔

حضرت علی اکبرؑ کا رجز بھی دشمنوں کے کلیجے ہلا دیتا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ تمھاری فوج کی ہماری نظر میں کیا بساط خدائے بزرگ و برتر نے ہم کو وہ طاقت بخشی ہے کہ:

فوج کیا دہر[☆۱] کو ہم زیر و زبر کر ڈالیں   خاک ہوجل کے نظر قہر کی جس پر ڈالیں
یوں قدم گاڑ کے لڑنے کی بِنا کر ڈالیں   چھاتیاں ٹیک دیں کہسار وہ لنگر ڈالیں
سب تزلزل سے ہوں خشکی کے مکیں پانی پر
ڈگمگانے لگے کشتیِ زمیں پانی پر

کیا عجب ہے کہ زمانہ تہ و بالا ہوجائے کیوں کہ ہمارے بازوؤں میں شیرِ خدا کی طاقت ہے۔

نعرہ[☆۲] یہ تھا کہ ضیغمِ دشت و وغا ہیں ہم   فرزندِ ارجمندِ شہِ کربلا ہیں ہم
سیرت میں شیرِ خالقِ ارض و سما ہیں ہم   صورت جو دیکھیے تو رسولِؐ خدا ہیں ہم
جلوے ہیں ہم میں نورِ خداوند پاک کے!
تم سب میں جان کیا ہے کہ پتلے ہو خاک کے

تمھاری کیا مجال جو ہم سے مقابلہ کرسکو۔

☆۱۔ فارغ، تیسرا مرثیہ، بند ۱۱۵، ص ۳۰
☆۲۔ فارغ، پہلا مرثیہ، بند ۲۰۰، ص ۵۱

شاہِ کربلا کا بھی رجز سن لیجیے، اعدا سے وہ یوں مخاطب ہوئے:

کیوں کچھ سنا ہے زورِ ولایت مآب کا
فوجوں[☆۱] کے دل میں معرکۂ خیبر کے باب کا
جھٹکیں پکڑ کے سر جو کرن کی طناب کا
ٹوٹے زمیں پہ گر کے کلس آفتاب کا
اٹھیں بروج یوں فلک نہ رواق پر
حالت تھی کنگروں کی جو کسریٰ کے طاق پر

رجز میں جوش و خروش ہے، ہمہمہ ہے طاقت کے مظاہرے کا بیان ہے، افکار کی دل آویزی ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ حکمِ الٰہی سے ہم خشک و تر کے مالک ہیں، اس لیے:

قدرت[☆۲] وہ ہے جو حکم وقوع محال دیں   پانی سے آگ، آگ سے پانی نکال دیں
قوت دکھائیں گر تو پہاڑوں کو ٹال دیں   رن تھرتھرائے ہاتھ جو قبضے پہ ڈال دیں
نعروں سے قصرِ چرخ بریں کانپنے لگے
گاڑیں جہاں یہ پاؤں زمیں کانپنے لگے

نہ ہماری تیغ سے زیادہ کوئی آب دار تیغ کائنات میں ہے، نہ ہم سا کوئی صف شکن اور شہ سوار ہے اگر ہم:

دوڑا کے رخش باگ جو پنجہ سے چھوڑ دیں
یہ صف تو کیا ہے سدِّ سکندر کو توڑ دیں

اللہ رے زورِ بیان! فارغ کے مختلف مرثیوں میں امام حسینؑ ان کے عزیزوں کے علاوہ ان کے رفیقوں کے رجز بھی لائقِ تحسین ہیں لیکن طوالت کے اندیشے سے اس ضمن میں مزید بند نہیں پیش کیے لائیں گے، بہرحال فارغ کا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ رزمیہ شاعری کے ہر موضوع پر "دریا بہا دیے سخنِ آب دار کے۔"

☆۱۔ فارغ، دوسرا مرثیہ، بند ۳۹۱، ص ۱۳۴

☆۲۔ فارغ، حوالۂ بالا، بند ۳۹۳، ص ۱۳۵

رزمیہ شاعری میں ہیرو کے رہوار کی تعریف کی جاتی ہے، اس کی تیز رفتاری کہیں چیتے کی جست، کہیں آہو کا رم۔

رخش کی تعریف

حضرت علی اکبر کے اسپ سبک رفتار کے بارے میں فارغ کے تخیل کی بلند پروازی ملاحظہ ہو۔ ہٹ ہٹ کے روم و چین کی حدیں مل گئیں اور کھنچ کھنچ کے زمین کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔

زور[☆1] اس رخش سے آندھی کا بھی کب چلتا ہے
گرد پاتی نہیں کچھ چال عجب چلتا ہے
ساتھ پہنچے نہ تصور بھی غضب چلتا ہے
چال کا حال ہے یہ حال سے جب چلتا ہے
دم میں آئندہ زمانے کی خبر لاتا ہے
پھر پلٹتا ہے تو ماضی سے گزر جاتا ہے

آندھی رخش کا کیا مقابلہ کرے گی، اس کی گرد تک بھی رسائی ناممکن ہے اور تو اور تصور بھی رہوار کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔

باگ[☆2] روکے جو نہ اسوار وہ چلنے پائے
جا کے مغرب سے پھرے دن بھی نہ ڈھلنے پائے
گھیر لے گر تو عدو خاک سنبھلنے پائے
وقت جو ہو وہ نہ کاوے سے نکلنے پائے
اس جگہ عالمِ تصویر کا ہنگام رہے
صبح ہو صبح رہے شام جو ہو شام رہے

زمان و مکان کا جو تصور فارغ نے مندرجہ بالا بند میں پیش کیا ہے، اس سے

☆1۔ فارغ، تیسرا مرثیہ، بند ۱۳۲، ص ۳۷

☆2۔ فارغ، حوالہ بالا، بند ۱۳۳، ص ۳۷

ان کی پروازِ تخیل کے ارفع و اعلیٰ ہونے کا اندازہ ہوتا ہے، مشرق سے مغرب تک کا فاصلہ آن کی آن میں رہوار کے لیے طے کرنا بہت آسان ہے، وقت کو کاوے میں مقید کردیا ہے۔

بیت لاجواب ہے رخش محوِ پرواز ہے، یہاں عالمِ تصویر کا ہنگام ہے۔ رخش کیا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، اس کی رگ رگ میں برق کی سرعت بھری ہوئی ہے، اس کے جسم میں جو خون گردش کرتا ہے، وہ اس کے لیے لطفِ نظر ہے اور اس کے دل کو راکب کے ارادے کی خبر دیتا ہے۔ یہ ہے اعجازِ شاعری۔

امام عالی مقام کے رخش کی تعریف☆ میں ایک بند دیکھ لیجیے۔

کیا شانِ اشہب شہِ عالی وقار ہے رن میں ظہورِ قدرتِ پروردگار ہے
سرعت یہ ہے کہ برق بھی جس پر نثار ہے راکب وہ ہے جو دوشِ نبیؐ کا سوار ہے
غل تھا کہ پھاندتے فلکِ مہ رواق کو
دیکھا ہے اس فرس کو سنا ہے براق کو

حضور سرورِ کائنات کو معراج ہوئی تھی، سدرۃ المنتہیٰ سے ہوتے ہوئے وہ عرشِ معلّٰی تک پہنچے۔ مشہور ہے کہ آپ تیز رفتار براق پر تشریف لے گئے تھے۔ دوشِ نبیؐ کے سوار کے مرتبے کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔

تلوار کی تعریف

تلوار کی تعریف بھی رزم نگاری کا ایک اہم موضوع ہے۔ مرثیہ گو شعرا نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے اچھوتی تشبیہیں استعمال کی ہیں اور نادر ترکیبیں وضع کی ہیں، فارغؔ کا اشہبِ قلم اپنی جولانیٔ فکر سے ایسے ایسے مضامین تلاش کرتا ہے کہ وہم و تصور کے پر بھی جلنے لگتے ہیں، حضرت علی اکبرؑ کی شمشیرِ آب دار نیام سے باہر نکلی تو کائنات میں تزلزل پیدا ہوگیا۔ قہرِ الٰہی سے خوف زدہ ہوکر پہاڑ خاک کے تودے میں دھنس گئے، تیغ کے ڈر سے ہوائے تند نے بھی راہِ فرار اختیار کی، بدنظروں کی پلک بھی نہ

☆ فارغؔ، پہلا مرثیہ، بند ۱۳، ص ۵

جھپک گئی اور اُن کی یہ کیفیت ہوئی کہ:

جس پر پڑی[☆۱] جگہ سے نہ پھر وہ جواں اٹھا چاروں طرف سے غلغلۂ الاماں اٹھا
آفت بھی یہ صاعقہ گر کر کہاں اٹھا مل کر غبار زرد میں کالا دھواں اٹھا
کیا کیا گھمنڈ تھا انھیں ڈھالوں کی آڑ پر
بجلی نے گر کے آگ لگا دی پہاڑ پر

ڈھالوں کو پہاڑ کہا ہے، ایسا ہی استعارہ شاعری کی جان کہا جاتا ہے۔ تیغ کی بجلی گری، اس نے دشمنوں کو ہلاک کر ڈالا، جو موذی قطار باندھے ہوئے بڑھے تھے، اُن کو ڈسنے کے لیے ناگن ان کی طرف لپک رہی تھی۔ تیغ کی رفتار دیکھنے کے لیے اجل موجود تھی، عالمِ اضطراب میں لشکریوں کا شور۔

اجل کی ہمت افزائی کہ اے تیغ کوئی دشمنِ دین زندہ نہ رہنے پائے۔ ایسا معلوم ہو کہ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ امامِ عالی مقام کے دستِ مبارک میں ذوالفقار تھی اُس کی بھلا کیا تعریف کی جاسکتی ہے۔

پنجہ[☆۲] وہ مہر دیں کا وہ اوج ہلالِ تیغ اک قدرتِ خدا تھا کہ جاہ و جلالِ تیغ
جائیں نہ چھوڑتا تھا دم بے زوالِ تیغ بھاگے تو ساتھ ساتھ تھا سر میں خیالِ تیغ
پلٹے تو آ کے منھ پہ تھے ذوالفقار کے
عقل اُن کی کٹ گئی تھی تصور سے دھار کے

مندرجہ بالا بند کے مصرعے کس قدر مربوط ہیں، اعدائے دیں تیغ سے ڈر کر بھاگے لیکن ان پر ایک قسم کی دہشت طاری تھی، ان کے لیے جائے مفر کہاں، ذوالفقار کی مقناطیسی کشش سے وہ کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔

عقل کٹ جانا محاورہ ہے لیکن دشمنوں کی عقل شمشیر براں کے تصور کی دھار سے کٹ گئی تھی۔ صنعتِ مراعاۃ النظیر نے مصرع کو مزید معنویت بخشی۔

☆۱۔ فارغ، حوالۂ بالا، بند ۲۱۲، ص ۵۴
☆۲۔ فارغ، دوسرا مرثیہ، بند ۵۲۶، ص ۱۳۳

ایک مرثیے میں ذوالفقار نے امامِ حسینؑ سے یوں شکایت کی۔

زہرا کا باغ[☆۱] کاٹ کے باغی ہوں باغ باغ
یا شاہ جوہروں سے زیادہ ہیں دل میں داغ
سوکھے نہ ہوں گے خوں سے بھرے تھے جو دشت و راغ
اب تو سہی جو شام کو کردوں نہ بے چراغ
گو آج موردِ غم و رنجِ کثیر ہوں
آقا میں ذوالفقارِ جنابِ امیرؑ ہوں

محاسنِ زبان، صنائع بدائع کی رعنائی اور تشبیہات کی معنی آفرینی قابلِ داد ہے، فارغؔ نے ذوالفقار جنابِ امیرؑ کی اہمیت بھی جتادی اور اسے نیام میں رکھنے سے دشمنوں کی ہمت بڑھ گئی تھی، اس کی طرف بھی اشارہ کردیا۔

رزمیہ مناظر

فارغؔ نے اپنے مرثیوں میں جنگ اور جنگ کے متعلقات کے جو خاکے پیش کیے ہیں وہ تمام تر انھیں کی اختراع ہیں جن پر اُس عہد کے اودھ میں فنِ سپہ گری اور فنِ جنگ کے متعلق جو روایات اور معلومات موجود تھیں ان کا رنگ پوری طرح چڑھا ہوا ہے۔ کربلا کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ان میں عربوں کی بعض جنگی خصوصیات بھی شامل کرلی گئی ہیں لیکن فارغ کا بنیادی تصور اودھ کا رزمیہ انداز ہے جس کے وہ خود ماہر تھے۔"[☆۲]

صبحِ عاشور پسرِ سعد نے اپنے ہاتھ میں علمِ لشکر لیا۔ اس کے پھریرے کا کھلنا تھا کہ فوجیں میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوگئیں... اس کے بعد:

کڑکا[☆۳] ہوا انھیں پھریرے سرے یک بیک
تیغوں کی بجلیاں بھی دکھانے لگیں چمک

☆۱۔ فارغؔ، دوسرا مرثیہ، بند ۱۵۳، ص ۱۳۰
☆۲۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، فردوسی ہند، ص ۱۲۲
☆۳۔ فارغؔ، دوسرا مرثیہ، بند ۱۶۰، ص ۴۱

باجوں میں شام وروم کے تاشوں کی وہ کڑک   قرنا کا غل، دہل کی گرج، طبل کی کمک
پہنچی تھی بانگِ دف بھی بلندیِ مہر پر
اتنی صدائیں دیتی تھیں ڈنکا سپہر پر

مندرجہ بالا بند پڑھنے کے بعد میدانِ جنگ کا منظر آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگتا ہے۔ افواجِ روم وشام کے باجوں میں تاشوں کی وہ کڑک، قرنا کا غل، دہل کی گرج اور طلب کی کمک سنائی دینے لگتی ہے، ایسی ہی مرقع کشی کو شاعری کا اعجاز کہنا حق بجانب ہوگا۔

حضرتِ حُر حسینی سپاہ کے شہیدِ اوّل تھے۔ سب سے پہلے اُن کے معرکہ کارزار کی ایک جھلک دیکھیے۔

پہلے سنو☆ ہراولِ فوج خدا کی جنگ   جرأت بڑھا رہی ہے حرِ باوفا کی جنگ
پڑھتا ہوں معرکے میں ہزبرِ وغا کی جنگ   آفت کا رن ہے حشر کا میداں بلا کی جنگ
جھپٹا جو ناریوں پہ جری تیغ تول کے
مالک سرک گیا درِ دوزخ کو کھول کے

چوتھے مصرعے میں فارغؔ نے نہایت اختصار سے جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے۔ مختلف رزمیہ مناظر کی تصویر کشی ہے 'حشر کا میدان'، کس قدر بلیغ فقرہ ہے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے۔ کیا آفتاب سوا نیزے پر آگیا ہے کہ گرمی کی شدت سے نہرِ فرات میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اعدائے دیں کے لیے دوزخ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، جو رن میں بھاگ گیا موت اس کے سر سے ٹل گئی، جو بھاگنے میں گر پڑا وہ وہیں دب کر کچل گیا، جس نے حرِ دلاور کی شمشیر سے آنکھ ملائی، اس کا دم نکل گیا۔

میدانِ کارزار کی کیفیت

علم دارِ لشکر کی آمد سے افواجِ اعدا میں ہلچل مچ گئی، صفیں درہم برہم ہونے لگیں، کوئی اِدھر چھپنے لگا کوئی اُدھر دوڑا، کوئی نام ور نشان چھک کے غائب ہوگیا، کوئی

☆ فارغؔ، دوسرا مرثیہ، بند ۳۱۶، ص ۸۰

بھنکیت تیغ و سپر پھینک کے بھاگا، اسد اللہ کے لال کا یہ جلال کہ بغیر لڑے ہوئے لشکر کو ہراس ہے۔ علم دار نے میدان کا رخ کیا۔

اللہ☆[۱] رے نہیب سپاہِ ظفر قریں | میداں سے دور ہٹ گئے دب دب کے اہلِ کیں
عباسؑ نے غضب میں جو گاڑا نشانِ دیں | یا بوتراب کہہ کے لرزنے لگی زمیں

کانپے اِدھر دھمک سے قدم ہر پلید کے
رایت تمام ہل گئے فوجِ یزید کے

کربلا میں خیبر کی یاد تازہ ہوگئی۔ حضرت علیؑ نے خیبر میں ایک پتھر پر علم نصب کیا تھا جس کی وجہ سے قلعہ خیبر متزلزل ہوگیا تھا، کربلائے معلّٰی میں وہی نشان حضرت عباسؑ نے نصب کیا جس سے ارضِ کربلا لرز گئی۔

جاتا☆[۲] ہے بادِ پا جو سمٹ کر اِدھر اُدھر | قہرِ خدا کی چلتی ہے صرصر اِدھر اُدھر
الٹا ہوا ہے فوج کا دفتر اِدھر اُدھر | اوپر تلے صفیں ہیں برابر اِدھر اُدھر

یوں تھے پرے پروں پہ سپاہِ خراب کے
جیسے ورق ہوا میں مجلد کتاب کے

مجلد کتاب سے منظم افواج کی تشبیہ معنویت سے بھرپور ہے اس بند میں صفوں کی ابتری اور انتشار لشکر کی واضح تصویر کشی ہے۔

شیرِ خدا کے شیر کے حملے کا یہ اثر ہوا کہ:

سینوں☆[۳] میں سب کے دل دمِ جنگ و جدل ہلے
گر گر پڑے جگہ سے جو اہلِ دغل ہلے
اللہ ری ضرب رن میں شجر بر محل ہلے
بجلی گری دہل گیا میداں جبل ہلے

☆۱۔ فارغ، چھٹا مرثیہ، بند ۵۳۱، ص ۱۳۲
☆۲۔ فارغ، دوسرا مرثیہ، بند ۳۲۲، ص ۸۲
☆۳۔ فارغ، دوسرا مرثیہ، بند ۳۲۳، ص ۸۲

دیکھے گئے نہ وار جو اس شیر مرد کے
گیتی نے منھ چھپا لیا دامن میں گرد کے

حضرت عباسؑ کے حملوں کی کون تاب لاسکتا تھا۔ "رن میں شجر بر محل بلے" بعد ازاں تیغ تیز کی بجلی گرتے ہی میدانِ کارزار دہل گیا، پہاڑ بھی متزلزل ہوگئے، خوف زدہ ہوکر گیتی نے بھی گرد کے دامن میں اپنا منھ چھپالیا۔

میدانِ جنگ میں ہر طرف جوانان یل تن کے لاشوں کے انبار تھے، آثار حشر نمودار تھے، دریا کے پاس آگ کا دریا موج زن تھا۔

حضرت عباسؑ کے حملوں کے اثرات کی کس قدر کامیاب مرقع کشی ہے۔

حضرت علی اکبرؑ جب میدانِ جنگ میں پہنچے تو بڑے بڑے نامی پہلوانوں کے زہرے آب ہوگئے، رزم گاہ کی کیفیت فارغؔ سے سنیے۔

ناگہ[☆۱] دہل بجا پئے بدخصال میں — شیروں کے دل دہل گئے دشتِ قتال میں
پیدا ہوا غضب کا تزلزل جبال میں — گردوں سمٹ کے چھپ گیا بادل کی ڈھال میں
طبقہ زمیں کا شور سے باجوں کے پھٹ گیا
آیا یہ زلزلہ کہ زمانہ الٹ گیا

چوتھے مصرعے کی بلاغت کی داد دیجیے۔ اللہ ری فارغؔ کی فکر انگیزی، جدت پسندی، طبع کی رسائی اور طرز نگارش کی خوبی۔ یہ ہے اعجاز شاعری "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔"

جب حضرت علی اکبرؑ فوج اعدا پر حملہ آور ہوئے، اس وقت پہلی صف پر سواروں کا دل تھرا کے گرا جو پرِ دغل گرا وہ ٹاپوں کے نیچے آگیا، غضب گیرو دار تھی، صبح حشر نمودار تھی۔

چمکا[☆۲] جو ہاتھ اٹھا کے کوئی خانماں خراب — شپ سے پڑی بغل کے تلے تیغ لاجواب
یوں چار آئینے میں در آئی بہ آب و تاب — جس طرح ڈوب جاتا ہے لوہامیان آب

☆۱۔ فارغؔ، پہلا مرثیہ، بند ۱۸۷، ص ۴۸
☆۲۔ فارغؔ، حوالۂ بالا، بند ۲۱۶، ص ۵۵

تڑپی تو خود سر کی طرف برمحل گئی
گویا ہوا حباب میں بھر کر نکل گئی

مندرجہ بالا بند پڑھ کر اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ فارغؔ فنونِ جنگ سے بخوبی واقف تھے "شب سے بڑی بغل کے تلے تیغِ لاجواب" میدانِ جنگ کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ تشبیہ کی معنی آفرینی بھی ہے اور اندازِ بیان کی رعنائی بھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فارغؔ کے رزمیہ تصورات اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

سید الشہدا کی جنگ کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے اتمام حجت کے بعد:

تیغِ دو سر☆ پہ ہاتھ جو ڈالا امام نے کھنچتے ہی الحذر کی صدا دی نیام نے
اونچا کیا جو ہاتھ خدیوِ انام نے سر گز اور سر کو بڑھایا حسام نے
وار ایک سن سے کرکے جو لاکھوں پہ جا پڑے
اس صف کے سر اڑے ہوئے اُس صف پہ جا پڑے

امام علیہ السلام کے ایک ہی حملے کے بعد لاشے گرم زمین پر پھڑکے، لہو اڑا، فرسِ تند خو بھی لشکر کو پھاڑ کر، مثلِ خبر، چار سو اڑا، اس لیے غل پڑ گیا کہ گھوڑے بھگا ئیو، اسد جنگ جو اڑا اپنی ٹاپوں سے وہ بابِ فتح و ظفر کھولنے لگا، دوسری ہی ضرب تھی کہ رن بولنے لگا۔

تیغ دو پیکر سن سن چل رہی تھی، رزم گاہ میں ہر طرف بسمل پھڑک رہے تھے۔ یہ دہشت ناک سماں دیکھ کر بڑے بڑے جیالے پہلوانوں نے خوف زدہ ہوکر میدان سے منھ موڑ لیا، جو شیر لشکر شکن بنتے تھے، ان کے نشے ہرن ہوگئے، جن سورماؤں کے پاؤں میں لنگر باندھے گئے تھے انھوں نے بھی راہِ فرار اختیار کی، معرکۂ کارزار خوف و دہشت کا شکار ہوگیا۔

اللہ رے نعرۂ اسدِ شیرِ کردگار بنچوبۂ فلک کی چھت اٹھتی تھی بار بار

☆ فارغؔ، دوسرا مرثیہ، بند ۵۱، ص ۱۳۱

آفت[☆1] تھا بار ضرب گراں بار ذوالفقار　　اشجار کانپتے تھے دہلتے تھے کوہسار
ہلتا تھا بے ستوں تو لرزتا تھا قاف بھی
کروٹ بدل رہی تھی زمینِ مصاف بھی

"بدار و بگیر" کے وہ غلغلے رواقِ سپہر اثیر کے وہ زلزلے بادشاہ و سلیماں سریر کے وہ حملے، بھاگتی ہوئی فوج کثیر کے وہ ریلے، نتیجہ یہ ہوا کہ سوار و سمند میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا، زمین اس قدر کانپی کہ پست و بلند میں بھی کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔

مختلف معرکوں کے جو مناظر پیش کیے ہیں، ان سے فارغؔ کی طبیعت کی روانی بلکہ الہامی کیفیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے طویل مرثیے لکھے لیکن تسلسل قائم رکھا۔ فارغؔ کی رزمیہ شاعری کے جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی شاعری میں جدت و ندرت ہے، اصطلاحات جنگ سے وہ بطریقِ احسن واقف تھے اس لیے رزمیہ مناظر کی مرقع کشی لائقِ صد تحسین و آفرین ہے۔

الفاظ کا صحیح انتخاب کرنے میں ان کو یدِطولیٰ حاصل تھا، ان کے قبضے میں الفاظ کا ایک بحرِ ذخار تھا، الفاظ کے برمحل استعمال سے فارغؔ کے انداز بیان میں رعنائی اور دل کشی پیدا ہوگئی اور معرکہ کارزار کے بیان میں گھن گرج۔

فارغؔ نے رزمیہ شاعری کے مختلف پہلوؤں پر طبع آزمائی کی۔ ان کی فکر انگیزی خیالات کی رعنائی، مضامین کی جدت اور زبان پر قدرت ہونے کی وجہ سے ان کی رزمیہ شاعری کا شمار اردو ادب کے شہ پاروں میں کیا جائے گا۔ ان کے مراثی ہمارے ادب کے بیش بہا خزانے ہیں۔

۱۱۔ لطیفؔ، سیّد محمد حسین

[☆2]"اردو کی زینت جیسی انیسؔ کی زبان سے ہوئی احاطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے، بالفعل اتفاقات سے سیّد محمد حسین صاحب لطیفؔ از ارشد تلامذۂ انیسؔ صاحب گنج میں

☆۱۔ فارغؔ، دوسرا مرثیہ، بند ۵۴۷، ص ۱۳۸

☆۲۔ مولوی سیّد خیرات احمد صاحب وکیل عدالت دیوانی ضلع گیا، مضمون مطبوعہ معاصر حصہ ۳، مرتبہ عبدالمنان بیدلؔ، دائرۂ ادب پٹنہ، مطبع آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ، ۳۰؍ دسمبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۱-۱۰۲

وارد ہوئے۔ ایک مجلس میں اپنا کلام کچھ ایسا پڑھا کہ سبحان اللہ۔ یہاں تک کہ بعضوں نے کچھ ایسے الفاظ فرمائے جس کی میر صاحب کو خبر ہوئی۔ اس لیے انھوں نے دو چار روز میں گویا فی البدیہہ ایک مرثیہ ۱۸۰ (بند) کا تصنیف فرما کر پڑھا اور بعدہ غریب خانہ پر تشریف لائے اور مجھ سے مصر ہوئے کہ کوئی روایت ایسی نئی کہ جس کو کبھی تو نے منظوم نہ سنی ہو، نشان دے کہ میں نظم کروں۔ ہر چند میں نے انکار کیا لیکن موصوف نے نہ مانا۔ بدرجہ مجبوری میں نے خلاصۃ المصائب کی روایت شصت و پنجم جس میں مضامین بستہ کی گنجائش نہیں تھی عرض کی، موصوف نے چار دن کے عرصے میں میرے غریب خانے پر گویا میرے سامنے پوری روایت کو نظم فرمایا، دو چار روز میں موصوف الیہ عظیم آباد تشریف لے جائیں گے، شائقین کلام سن لیں۔“

لطیفؔ کے نہ مزید حالات مل سکے، نہ کہیں سے ان کا کلام دستیاب ہوسکا۔

۱۳۔ محسنؔ، سیّد محمد محسن ذوالقدر

جون پور کے ایک معزز خاندان سے آپ کا تعلق تھا، مشرقی و مغربی علوم پر آپ کو دست گاہ حاصل تھی، فارسی میں آغا محمد شوستری ایرانی کے شاگرد تھے۔ ملا محتشمؔ کے ہفت بند کاشی پر آپ کی تضمین لاجواب ہے۔

محسنؔ صاحب نہایت متدین اور قابل ڈپٹی کلکٹر تھے، گورنمنٹ نے ان کو ذوالقدر کا خطاب دیا تھا۔

وہ ارشد تلامذۂ انیسؔ میں سے تھے۔ مونسؔ اور نفیسؔ سے بھی اُنھوں نے اصلاح لی تھی لیکن آپ رنگِ انیسؔ کی تاسّی کرتے تھے۔

اس ضمن میں ”سرفراز“ لکھنؤ سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

”چہلم کے زمانے کی مجلسیں اس خاندان میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ امامیہ مشرب صوفیہ مسلک گھرانہ مخدوم کے وقت سے صلح کل رفتار پر چلا آرہا ہے۔ خاں بہادر ذوالقدر حضرت سیّد محمد محسن صاحب مغفور (ڈپٹی کلکٹر) میر انیسؔ مرحوم کے

شاگردِ رشید اور مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے لیے بہت ممتاز ہوئے۔"☆۱

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"سید محمد محسن صاحب ذوالقدر ثانی ہمارے جون پور کے ایک ذی علم بلند پایہ خوش گو مرثیہ خواں اور مرثیہ گو تھے، ان کو میر انیس اور میر مونس سے تلمذ تھا، نکاتِ فن میر انیس مرحوم سے انھوں نے سیکھے تھے... انیس مرحوم کے مرثیوں کے نکات اور منظومات سے وہ جس قدر واقف اور باخبر تھے، کم کوئی رہا ہوگا... ذوالقدر صاحب بہادر ہر سال ایک بڑی مجلس جون پور میں محلہ پان دریبہ میں خاص اپنے دولت کدے پر منعقد کرتے تھے جس میں اپنا نوتصنیف مرثیہ خود پڑھتے تھے، لباس اور وضع قطع اور سارا انداز وہی خاندانِ انیس کا سا تھا... اس سالانہ مجلس میں دور دور سے مہمان آتے تھے اور باکمال شعرا جمع ہوکر دادِ سخن دیتے تھے۔ دو چار دن کے لیے اہلِ کمال کی صحبت سے جون پور لکھنؤ کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔"☆۲

ذوالقدر مرحوم کے بارے میں حسبِ ذیل بیان بھی قابلِ قدر ہے۔

"میرے جدِ اعلیٰ جناب سید محمد محسن صاحب طاب ثراہ (محسن جون پوری) کو فنِ مرثیہ گوئی اور طرزِ خواندگی میں میر انیس، میر انس اور میر مونس تینوں حضرات سے براہِ راست شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اسی لیے موصوف کو تقریباً بیس سال تک میر انیس کی صحبت سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔

اپنے ابتدائی عہد میں وہ فنِ خواندگی سیکھنے کے سلسلے سے میر انیس کی پیش خوانی میں انھیں کے مرثیے پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے شاعر اپنا کلام خود پڑھنے کے بعد جب دوسروں کو دیتا ہے تو وہ نظرِ ثانی اور ترمیم و تنسیخ کے تمام مراحل طے کرچکا ہوتا ہے، ایسے کلام کی صحت و سند میں کیا شبہ ہوسکتا ہے جو خود مصنف کلام کی موجودگی میں مجمعِ عام میں

☆۱۔ سید علی ضامن ترمذی مرحوم، (مضمون) شمالی ہند میں عزاداری کا قدیم مرکز جون پور، سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء) ص ۱۹

☆۲۔ شیخ ممتاز حسین جون پوری، پرانے زمانے کی چند تاریخی مجلسیں "روشنی" لکھنؤ، ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء، ص ۶۱۔۶۲

پڑھا جائے۔☆

نمونۂ کلام، رباعی:

گزرے گی یہیں حیاتِ فانی میری
حائر میں ہے موتِ زندگانی میری
آخر کام آئی ناتوانی میری
محسن در شہ پہ بیٹھ کر میں نہ اٹھا

امام حسینؑ رخصت کے بعد خیمے سے برآمد ہوئے، اس وقت:

مرثیہ کے چند بند

اک غل ہوا کہ لوسنِ فرخندہ کام لاؤ
شبدیزِ خاص بادشہِ خاص و عام لاؤ
رشکِ براق سرعت گردوں لجام لاؤ
اسپ قمر رکاب و مجرہ لگام لاؤ
ہے انتظار اشہب رفرف مثال کا
لاؤ سمند فارسِ دُلدل کے لال کا

آیا فرس تو زین پہ یوں شاہِ دیں چڑھے
خاتم پہ جس فروغ سے نامی نگیں چڑھے
گھوڑوں پہ ناصرانِ امامِ مبیں چڑھے
غل تھا کہ رن پہ سرورِ گردوں نشیں چڑھے
روشن ہے جس سے خلق وہ شمعِ ہدایہ ہے
وقتِ طلوعِ نیرِ دینِ خدایہ ہے

اللہ رے اوجِ لشکرِ شاہِ فلک مقام
عباسؑ کی وہ شان علم کا وہ احتشام
سردارِ میمنہ تھا زہیرِ خجستہ کام
تھا میسرہ حبیب مظاہر کے پاے نام
حضرت تھے قلبِ فوج سعادت نہاد میں
ایمان جس طرح دلِ پاک اعتقاد میں

"سرفراز" محرم نمبر ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء

۱۴۔ مونس، میر نواب

"صدرِ محفل رونقِ مجلس میر نواب تخلص مونس خلف (میر، مستحسن خلیق قابل ولیق

☆ شبیب علی حسین، شاہکار وحید، بار اول، مطبوعہ اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ناشر کبرستان دربیہ، جون پور، فروری ۱۹۶۶ء، ص ۳

مرثیہ گو اور غزل سرا ذاتِ پاک اس کی حاصلِ دین و دنیا شاگرد والد بزرگوار[☆۱] دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی مونسؔ کو میر مستحسن خلیقؔ کا شاگرد لکھا ہے۔

''مونسؔ میر نواب خلف الرشید اور شاگرد میر مستحسن خلیقؔ مرثیہ گو۔''[☆۲]

''مونسؔ تخلص میر نواب مرثیہ گو برادر خورد میر انیسؔ مرثیہ گو خلف و شاگرد میر مستحسن خلیقؔ بیش تر مرثیے لکھتے تھے۔''[☆۳]

میر نواب مونسؔ مرحوم خلیقؔ کے تیسرے بیٹے تھے اور سخن گوئی میں اُنھوں نے اپنے والد ہی سے اصلاح لی تھی۔ مرثیہ بھی خوب لکھتے تھے اور تغزل میں بھی اپنے معاصرین میں کسی سے کم نہ تھے۔ ان کے شاگردوں میں متعدد صاحبِ دیوان شعرا گزرے ہیں، مونسؔ کی[☆۴] شادی بنارس میں میر نادر علی کے خاندان میں ہوئی تھی جن کی یادگار بنارس کے محلہ مہماناں میں ایک مسجد ابھی تک ہے۔ اسی خاندان کے ایک فرد میر ریاض علی ریاضؔ کی ہمشیرہ کا عقد میر مونسؔ کے ساتھ ہوا تھا اور اس جہت سے وہ بنارس آیا جایا کرتے تھے۔[☆۵]

اکثر تذکرہ نگاروں نے مونسؔ کو اپنے والدِ ماجد میر مستحسن خلیقؔ کا شاگرد لکھا ہے لیکن شادؔ مرحوم نے تحریر فرمایا کہ ''میر مونسؔ کی طبیعت میں زود گوئی، پُرگوئی و خوش گوئی بے حد تھی، البتہ ان دو تین بے اصلاحی مرثیوں کی اصلاح یوں دیکھی ہے کہ رخصت و بین وغیرہ میں بیس بیس بند میر انیسؔ نے کاٹ دیئے ہیں اور ان کے عوض دو ہی بند کہہ کر ربط دے دیا ہے۔ چھ چھ سات سات بند بے اصلاح چھوڑ دیئے ہیں کسی پر صاد بنادیا۔ کسی نظری کر دیا پھر چار پانچ بند بعض مرثیے کے کاٹ دیئے اور نیا مصرع لکھ دیا یا کوئی لفظ بنادیا ایسے اصلاح شدہ مرثیے میر مونسؔ مرحوم نے مجھے ایسے زمانے میں دکھائے

☆۱۔ ناصر سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکہ زیبا، جلد اوّل، طبع اوّل، (مرتبہ مشفق خواجہ) مطبع ظفر سنز، پرنٹرز لاہور، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور، اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۳۰۳

☆۲۔ محسن، سید محمد محسن لکھنوی، تذکرہ سراپا سخن، طبع اوّل، ص ۷۵ (مولف) (مرتبہ ڈاکٹر سید اقتدا حسن)

☆۳۔ نساخ، مولوی عبدالغفور، سخن شعرا، ۳۷۳

☆۴۔ یہ دوسری شادی تھی لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ق ح جعفری

☆۵۔ امرت لال عشرت، ڈاکٹر، سخن ورانِ بنارس، مطبع لیتھو مشین، پریس وراسی، بنارس۔

تھے کہ اب کوئی اصلاح یاد نہیں ہے۔"☆ ابتدا میں مونس نے اپنے والدِ گرامی سے اصلاح لی، بعد ازاں انیس کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔

راقم الحروف کی نظر سے میر مونس کے دو مرثیے گزرے ہیں جن پر میر انیس کی اصلاح موجود ہے۔ایک مرثیے کا مطلع ہے، "جب شاہ کے سفر کا زمانہ گزر گیا" اس مرثیے میں ۱۸۷ بند ہیں، یہ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے۔

اصلاح دیتے وقت انیس مرحوم نے کہیں ایک مصرع بدل دیا ہے یا بعض اوقات کسی مصرعے میں صرف ایک لفظ کہیں کہیں اضافی بند بھی ہیں۔ اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایسے بند نقل کیے جائیں جن میں کم سے کم چند مصرعوں پر اصلاح دی گئی ہو۔

"مشتے نمونہ از خروارے"... جب امام حسینؑ دشتِ نینوا پہنچے تو اسپ باوفا نے شکایت کی کہ اس سرزمین کی خاک پاؤں کی زنجیر ہو رہی ہے، اس وقت امامِ عالی مقام نے ارشاد فرمایا:

یاں کلمہ گو لڑیں گے شہ مشرقین سے
یہ خاک سرخ ہووے گی خونِ حسینؑ سے

اگلا بند معہ اصلاح نقل کیا جاتا ہے۔

بند۶، واقعہ نگاری

کھائیں گے برچھیاں علی اکبرؑ اسی جگہ ترہوں گے خوں میں قاسمِ بے پر اسی جگہ
تیغوں سے ٹکڑے ہوں گے برادر اسی جگہ روئیں گے ہم کو آ کے پیمبرؐ اسی جگہ
تڑپے گی یاں سکینہ پدر کی جدائی سے
زینبؑ اسی زمین پہ بچھڑے گی بھائی سے

اصلاح

زہرا بکا کریں گی کھلے سر اسی جگہ تڑپیں گے دل کو تھام کے شبرؑ اسی جگہ

☆ شاد عظیم آبادی، پیمبرانِ سخن، طبع اول، ص ۲۵۴

ماتم میں خاک اڑائیں گے حیدرؑ اسی جگہ　　　روئیں گے ہم کو آ کے پیمبرؐ اسی جگہ
تھرّائے گا یہ دشت حرم کی دہائی سے
زینبؑ اسی زمین پہ بچھڑے گی بھائی سے

انیسؔ مرحوم کی اصلاح سے بند میں جامعیت پیدا ہوگئی ہے۔ معنی میں وسعت اور مصرعوں میں ہم آہنگی، صرف حضرت سکینہ ہی نہیں بلک بلک کر روئیں گی بلکہ تمام خاک نشین اور سوگوار، ان مظالم پر اشک بار ہوں گے۔

نہرِ فرات کے کنارے خیام اہلِ بیت برپا کیے جانے کا اہتمام کیا جارہا تھا۔ اتنے میں دشمن کے ہراول دستے کا سردار اس پر مصر ہوا کہ اہلِ بیت علیہم السلام کے خیمے ریت پر نصب کیے جائیں۔ یہ سنتا تھا کہ حضرت عباسؑ کو جلال آ گیا لیکن امام عالی مقام نے حضرت عباسؑ کو اپنے سر کی قسم دی۔ فرمایا کہ حق کی راہ میں غیظ و غضب کو دخل نہ دو۔ اور اپنے ساتھ انھیں واپس لے آئے۔

بند ۴۷ مرقع کشی

یہ کہہ کے ساتھ بھائی کو لے کر پھرے امام　　　ریتی پہ اہلِ بیت کے برپا ہوئے خیام
ناقوں سے کانپتے ہوئے اترے حرم تمام　　　رویا کیے حسینؑ کی غربت پہ تا بہ شام
ماتم سرا کا طور جو پیشِ نگاہ تھا
زنگاری خیمہ سب کی نظر میں سیاہ تھا

اصلاح

سمجھا کے ساتھ بھائی کو لے کر پھرے امام　　　ریتی پہ اہلِ بیت کے برپا ہوئے خیام
صحن اس کا سب صفا ہوا اترے حرم تمام　　　آئینہ بن گئی وہ زمینِ فلک مقام
رکھ دوں سر اس کے در پہ یہ کیواں کو شوق تھا
کرسی پہ اس مکانِ معلّٰی کو فوق تھا

انیسؔ مرحوم کی اصلاح سے مصرعوں میں زیادہ ربط اور معنویت پیدا ہوگئی۔

چوتھے مصرعے کی مناسبت سے بیت کا مفہوم کس قدر اعلیٰ اور ارفع ہوگیا جو ایک فن کار کی اصلاح کا بیّن ثبوت ہے۔

صبح عاشور امامِ عالی مقام افواجِ دشمن سے مخاطب ہوئے۔ رسولِ مقبولؐ سے اپنا رشتہ یاد دلایا اور اُن کو راہِ راست پر گام زن ہونے کی تلقین کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، غرض اتمامِ حجت کے بعد۔

بند ۵۰ مرقع کشی

جب شہ سوارِ دوشِ پیمبرؐ ہوا سوار سردارِ فوجِ حضرتِ داور ہوا سوار
کس دبدبے سے نائبِ حیدرؑ ہوا سوار دونوں جہاں کا ہادی و رہبر ہوا سوار
سب شیرِ ذوالجلال کے پیارے جلو میں تھے
شبرنگ پر قمر تھا ستارے جلو میں تھے

اصلاح

میدانِ جنگ میں جو خدیوِ اُمم چلا کس دبدبے سے فوجِ خدا کا علَم چلا
مولا کے ساتھ لشکرِ جاہ و حشم چلا مانندِ آسماں فرسِ خوش قدم چلا
سب شیرِ ذوالجلال کے پیارے جلو میں تھے
شبرنگ پر قمر تھا ستارے جلو میں تھے

خدیوِ امم، فوجِ خدا کا علَم، یہ ترکیبیں معنویت سے بھرپور ہیں، فرسِ خوش قدم مانندِ آسماں چلا، نادر تشبیہ ہے۔ انیسؔ مرحوم کی اصلاح سے بند نہایت مرصع ہوگیا۔

ان ستاروں کی جلوہ آرائی قدرت کی مرہونِ منت ہے۔

بند ۵۳ منظر نگاری

چمکا ان اختروں سے ستارا زمین کا دامن طلائی ہوگیا سارا زمین کا
ذرہ ہر اک بنا فلک آرا زمین کا خورشید میں ہوں تھا، یہ اشارا زمین کا

مہرِ سپہر پست جو تھا ارتفاع کی
انگشت لب پہ رکھتا تھا خطِ شعاع کی

چاروں مصرعے نہایت براق ہیں اور مربوط انیسؔ مرحوم نے بیت میں اصلاح کی جس کی وجہ سے روانی پیدا ہوگئی۔ خطِ شعاع میں ایک قسم کا ثقل تھا جو اصلاح سے دور ہوگیا انگشتِ لب کے بجائے چلمن تھا رخ پہ، کس قدر معنی خیز ہے۔

بند ۵۳ کی اصلاح شدہ بیت ملاحظہ ہو۔

مہر سپہر دیکھ کے شانِ ارتفاع کی
چلمن لیے تھا رخ پہ خطوطِ شعاع کی

جب حضرت عباسؑ کو جنگ کی اجازت مل گئی تو امام علیہ السلام نے فرمایا، کس کو اپنا کلیجا نکال کے دکھاؤں، جو کیفیت میرے دل پر گزر رہی ہے، اس کا اظہار کس سے کروں اور کس طرح۔

بند ۷۸ جذبات نگاری

پھیلائے دونوں ہاتھ یہ فرما کے شاہ نے — چھاتی سے سر لگا دیا اس رشکِ ماہ نے
رخصت کیا جو خسروِ عالم پناہ نے — مانگا سمند دلبرِ شیرِ الٰہ نے
خادم قریب لائے جو اس راہوار کو
کس پیار سے بلانے لگا شہ سوار کو

اصلاح

عباسؑ کو دعا کی رضا دی جو شاہ نے — باندھی کمر جہاد پہ اس رشکِ ماہ نے
آنسو بہائے خسروِ عالم پناہ نے — مانگا سمند دلبرِ شیرِ الٰہ نے
خادم قریب لائے جو اس راہوار کو
کس پیار سے بلانے لگا شہ سوار کو

حضرت عباسؑ کو جنگ کی اجازت مل گئی تو آپ نے ”چھاتی سے سر لگا دیا“

کے ٹکڑے سے "باندھی کمر جہاد پہ" زیادہ موزوں ہے۔ اپنے بے نظیر کردار کے پیشِ نظر وہ چھاتی سے سر نہ لگاتے بلکہ مولا کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیتے۔

''رخصت کیا'' کے بجائے ''آنسو بہائے'' کی اصلاح انیسؔ کی فن کارانہ صلاحیت پر دلالت کرتی ہے۔

''آنسو بہائے'' بھائی سے محبت کا تقاضا تھا، وہ بھائی جو وفا کا پیکر اور علم دارِ لشکر تھا۔ ''آنسو بہائے'' اس لیے کہ بتیس برس کی کمائی کو میدانِ جنگ میں بھیج رہے ہیں۔ رونما ہونے والا سانحہ ان کے پیشِ نظر ہے۔

اسد اللہ کے لال کا رعب و جلال ارے معاذ اللہ۔

بند ۹۰، انتشار کی کیفیت

جنگی صفیں تھیں درہم و برہم اِدھر اُدھر ناوک فگن تھے سہمے ہوئے خم اِدھر اُدھر
دوزخ میں گرتے جاتے تھے اظلم اِدھر اُدھر چھڑکاؤ خوں کا ہوتا تھا ہر دم اِدھر اُدھر
سوزاں تھے زخم گرم تھا میدانِ تیغ کا
پانی جلائے دیتا تھا ہر آن تیغ کا

انیسؔ مرحوم نے تیسرے مصرعے میں یوں ترمیم فرمائی۔

''بے سر پڑے تڑپتے تھے اظلم اِدھر اُدھر''

مرنے کے بعد تو اعدائے دیں سقر کے کندے بنیں گے لیکن ذرا دنیا میں بھی صعوبتیں برداشت کریں، سر و تن میں جدائی ہونے کے بعد اظلم تڑپ رہے تھے۔

بند ۱۱۳، رہوار کی تعریف

اڑنے پہ اس کے طائرِ تصویر تھے طیور آہو بھی سب کھڑے ہوئے تکتے تھے دور دور
کاوے میں گشت میں کہیں کرتا نہ تھا قصور پھرتا تھا آپ وہ اسے چھچی تھی کیا ضرور
پایا جدھر کا رخ اسی جانب روانہ تھا
راکب کے دل کا عزم اسے تازیانہ تھا

انیس مرحوم نے دوسرے مصرعے میں یوں اصلاح فرمائی ہے۔

"حیرت زدہ تھے آہوئے صحرا بھی دور دور"

"حیرت زدہ" کی ترکیب سے مفہوم کی بہتر طریقے سے وضاحت ہوتی ہے۔ آہو ششدر تھے کہ یہ رہوار ہے یا کوئی اور شے۔

چوتھے مصرعے میں کاوے، کے بجائے پوئی زیادہ مناسب ہے۔ اصلاح دیتے وقت کاوے کو پوئی سے بدل دیا۔ یعنی گھوڑے کی دلکی چال، سرپٹ...

دوسرے☆ مرثیے کے چہرے کے چند بند ہیں جن میں پنجتن پاک علیہم السلام کا تعارف کرایا گیا ہے۔

بس یک بیک جو عرش کی رونق ہوئی سوا   گردوں پہ شور صلِ علیٰ ناگہاں اٹھا
اے بادشاہِ ارض و سما واہب العطا   یہ کون ہیں کہ جن کا یہ عالی ہے مرتبا
آئی صدا یہ عاشقِ صادق ہمارے ہیں
یہ ہیں وہی جو سب سے سوا ہم کو پیارے ہیں

انیس مرحوم نے دوسرا مصرع یوں بدل دیا، "چلائے تب ملائکِ درگاہِ کبریا۔" اس کی وجہ سے دوسرے اور تیسرے مصرعے میں ربط پیدا ہوگیا۔

بیت کاٹ کر دوسری بیت لکھ دی۔

آئی صدا کہ باعثِ افلاک ہیں یہی
سن لو کہ عین پنجتنِ پاک ہیں یہی

ان کے اعلیٰ مراتب کا کیا کہنا یہی تو وجہ تخلیقِ کائنات ہیں، چھٹے مصرع میں مزید وضاحت کردی تاکہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ رہنے پائے۔

اگلے بند میں پنجتن پاک علیہم السلام کے اسمائے گرامی بھی بتا دیے۔

☆ اس مرثیے کا مطلع ہے: اللہ رے اوج و مرتبہ شاہِ خوش صفات، یہ قلمی مرثیہ میرے عزیز سید اشفاق حسین بیرسٹر کے پاس تھا۔ صاحبِ موصوف نے اسے نیشنل میوزیم دہلی کے حوالے کردیا تھا۔ میری درخواست پر اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دہلی سے منگائی، اس عنایت کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ مخطوط نمبر۱۰۱۔ ۵۷ نیشنل میوزیم، دہلی۔

ہے ایک ان میں فخرِ رسولانِ روزگار　　جس کے قدم سے دینِ خدا ہوگا استوار
اور ایک ہے علی ولی شیرِ کردگار　　اک فاطمہؑ ہے بنتِ رسولِ فلک وقار
اک ان میں ہے حسنؑ جو شہِ مشرقین ہے
اور ایک ان میں بے کس و مضطر حسینؑ ہے

اصلاح

دوسرے مصرعے کو یوں بدل دیا ''جس کے سبب سے دینِ مبیں ہوگا آشکار۔''
قدم، اور سبب کا فرق اربابِ ذوق پر ظاہر ہے۔ دینِ مبین، میں زیادہ معنویت ہے۔ آشکار کی مناسبت سے بھی ''دینِ مبین'' زیادہ موزوں ہے۔ انیسؔ مرحوم نے تیسرے مصرع کی یوں اصلاح فرمائی، ''ایک ان میں ہے علیِ ولی شیرِ کردگار۔''

پہلے مصرعے میں ہے، ''ہے ایک ان میں'' اسی مناسبت سے اصلاح کی گئی۔

تیسرے مصرعے میں بھی اسی مفہوم کا اظہار ہے، ''من جملہ ان کے۔''

پانچواں مصرع اس طرح تبدیل کردیا ''ایک ہے حسنؑ کہ بادشہِ مشرقین ہے۔'' اس اصلاح کی بدولت مصرعے میں روانی پیدا ہوگئی، شاہ اور بادشاہ میں فرق ہوتا ہے، ''بادشہِ مشرقین'' میں مزید رفعت و بلندی ہے۔

چھٹے مصرعے کی اصلاح ملاحظہ فرمایئے، ''مظلومی جس کے چہرے پہ ہے وہ حسینؑ ہے۔'' امام حسینؑ کی صفت مظلومی نہایت جامع ہے اور اُن کے کردار کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ انیسؔ مرحوم کی کردار نگاری اور فنی مہارت لائقِ صد تحسین ہے۔

مونسؔ نے حسبِ ذیل بند میں امامِ عالی مقام کی چند صفات نظم کی ہیں۔

کیوں عاشقانِ شاہ سنا رتبۂ حسینؑ　　سرتاجِ عرش کرسیِ خالق کے زیب و زین
زہراؑ کی جان، روحِ علیؑ، مصطفیٰؐ کا چین　　مہرِ سپہرِ نورِ خدا شاہِ مشرقین
رونے کی جا ہے جس کا یہ رتبہ جلیل ہو
وہ رن میں تین روز کا پیاسا قتیل ہو

انیس مرحوم کی اصلاح پر غور فرمایئے۔

کیوں عاشقانِ شاہ ِ ثنا رتبۂ حسینؑ سرتاج عرش عالمِ امکاں کی زیب و زین
زہرا کی جان روحِ علی مصطفیٰؐ کا چین مہرِ سپہرِ عز و شرف شاہِ مشرقین
رونے کا ہے مقام جو ایسا سعید ہو
وہ رن میں تین روز کا پیاسا شہید ہو

اصلاح پر مختصر تبصرہ

دوسرے مصرعے میں کرسیِ خالق کے بجائے عالمِ امکاں زیادہ معنی خیز ہے فرش کو بھی تو انھیں کی بدولت عزت نصیب ہوئی۔ چوتھے مصرعے میں انیس نے یوں ترمیم فرمائی، ''مہرِ سپہرِ عز و شرف'' کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ زبانِ بلاغت نشان کی۔

پانچواں مصرع ''مقام اور جا'' ہم معنی ہیں لیکن خواندگی کے لحاظ سے بھی مقام زیادہ مناسب ہے، سعید سے امام عالی مقام کی صفت (سعادت) کا اظہار ہوتا ہے، ایسا سعید اور اطاعت گزار بندہ اسے تین روز کا (بھوکا) پیاسا شہید کیا جائے۔ چھٹے مصرعے میں ''قتیل'' کے بجائے شہید زیادہ جامع ہے اور امام علیہ السلام ہیں بھی شہید راہِ خدا۔

حضور سرورِ کائنات کو امام حسینؑ سے بے پناہ محبت تھی۔ اگلے بند میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

روشن ہے سب پہ ان پہ جو تھا مصطفیٰؐ کا پیار تھی ایک دم جدائی نواسے کی ناگوار
کاندھے پہ اپنے دن میں چڑھاتے تھے بار بار قرباں کبھی تھے خیرِ ذرا اور کبھی نثار
آنکھوں سے اپنی ان کو نہ اک پل جدا کیا
یاں تک کہ نورِ عین کو ان پر فدا کیا

انیس مرحوم نے پہلے مصرعے میں اس طرح ترمیم فرمائی۔

''عالم ہے مصطفیٰؐ کی محبت کا آشکار''

عالم میں زیادہ وسعت ہے لفظ آشکار، مفہوم کی بہتر طریقے سے وضاحت کرتا

ہے۔ دوسرے مصرعے کی اصلاح پر غور فرمایئے:

"تھا ایک دم فراق نواسے کا ناگوار" فراق اور جدائی ہم معنی ہیں، ایک عربی ہے۔ اور دوسرا فارسی، لیکن خوانندگی کے لحاظ سے فراق زیادہ موزوں ہے۔

باقی مصرعوں میں انیسؔ مرحوم نے کسی قسم کی اصلاح نہیں کی۔

احادیث کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل بند میں، اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ باری تعالیٰ کو امام حسینؑ کس قدر عزیز تھے۔

دوشِ نبیؐ پہ ہوتے تھے سجدے میں جب سوار　　سجدے کو طول دیتے تھے شاہِ فلک وقار
جو چیز مانگتا تھا نبیؐ سے وہ گل عذار　　ہوتا تھا جبرئیلؑ کو یہ حکمِ کردگار
رونا ہے اس کا شاق شہِ مشرقین کو
جو شے طلب کرے وہی دے آ حسینؑ کو

انیسؔ نے پہلا مصرع یوں تبدیل کردیا۔

"جب پشت پر نماز میں ہوتے تھے یہ سوار"

امام حسینؑ راکبِ دوشِ رسولؐ تھے لیکن جب حضور اکرم ﷺ سجدے میں ہوتے اس وقت امام حسینؑ اُن کی پشتِ مبارک پر سوار ہوتے تھے۔

پانچویں مصرعے میں یوں ترمیم کی۔

"ہم چاہتے ہیں فاطمہؑ کے نورِ عین کو"

اصلاح کی وجہ سے چوتھے مصرعے اور بیت میں ربط پیدا ہوگیا۔ امام عالی مقام اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں۔

اللہ ری فصاحت و بلاغت مندرجۂ بالا مصرعے کی۔

اسی ضمن میں ایک بند اور نقل کیا جاتا ہے۔

احکامِ کردگار پیامِ حسینؑ ہے　　جو حق کی ہے زباں وہ کلامِ حسینؑ ہے
عقدے ہزار حل ہوں وہ نامِ حسینؑ ہے　　نار اس پہ سرد ہے جو غلامِ حسینؑ ہے
کہتا ہے کردگار کہ گو فعلِ زشت ہیں
یہ ہیں غلامِ شاہ تو ان کی بہشت ہیں

اصلاح

بالائے عرش پاک مقامِ حسینؑ ہے　　سیراب ہے جو تشنۂ جامِ حسینؑ ہے
عقدے ہزار حل ہوں وہ نامِ حسینؑ ہے　　قرآں کے بعد ہے تو کلامِ حسینؑ ہے
سب امتوں کا فخر ہیں گو فعل زشت ہیں
شبیرؑ کے غلاموں کے مسکن بہشت ہیں

انیسؔ مرحوم نے ایک بند میں تمام مناسباتِ لفظی جمع کر دیے ہیں چوتھے مصرعے کی اصلاح سے شاعر نے امام عالی مقام کی فضیلت اور اہمیت بھی بتا دی۔

بیت کی اصلاح کرتے وقت انیسؔ نے رسولؐ مقبول کی اس حدیث کو پیشِ نظر رکھا کہ ان کی امت کو دوسرے پیغمبروں کی امت پر برتری حاصل ہے۔ امام علیہ السلام کی محبت خلد کا پروانہ ہے۔ ان کی مدح سے بشر قاصر ہے، مختصر طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ:

ایوانِ عدل و داد ہیں بابِ سخا ہیں آپ　　ہیں فردِ نور منبعِ علمِ خدا ہیں آپ
متن متیں ہیں حاشیۂ مدعا ہیں آپ　　شرحِ مقدماتِ کتابِ خدا ہیں آپ
حاجت ہے کیا سند کی کہ خود علمِ حق ہیں یہ
ناطق ہے مصحف آپ کہ میرے ورق ہیں یہ

اصلاح

رحمت کا در ہیں بابِ عطا و سخن ہیں یہ　　وعدے پہ گھر لٹا دیا وہ باوفا ہیں یہ
متن متین و حاشیۂ مدعا ہیں یہ　　شرحِ مقدماتِ کتابِ خدا ہیں یہ
لاریب فیہ محرمِ اسرارِ حق یہ ہیں
ناطق ہے مصحف آپ کہ میرے ورق یہ ہیں

حسنِ بندش کی وجہ سے مندرجہ بالا بند کے مصرعے مربوط ہوگئے اور ان میں روانی پیدا ہوگئی۔ قرآن مجید کے الفاظ ''لاریب فیہ'' کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں باقی رہ جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ایسے برگزیدہ بندے پر کربلا میں کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے۔

اُس دن کہاں تھے آہ رسولِ فلک حشم — جس دن وہ دشتِ ظلم تھا اور لشکرِ ستم
تیروں کا مینہ برستا تھا جب ان پر دم بہ دم — خود ڈھونڈتے تھے نانا کو اس دن شہِ امم
داغِ جگر ملا تھا شہِ خوش خصال کو
کھویا تھا جب جہاد میں اکبرؑ سے لال کو

انیسؔ مرحوم نے دوسرے مصرعے میں ترمیم کی ہے، ''گھیرے تھا جب حسینؑ کو وہ لشکرِ ستم'' گھیرے تھا، رزم گاہ کی تصویر کشی ہے۔

تیسرے مصرعے میں 'جب اُن' کے بجائے بے کس لکھ دیا جس سے امامِ مظلوم کی حالتِ زار کا اظہار ہوتا ہے، چوتھے مصرعے کو یوں بنا دیا۔

''نانا کو رو کے ڈھونڈتے تھے خود شہِ امم''

رو کے ڈھونڈنا جذبات کی صحیح عکاسی ہے۔ نانا دیکھیے تو سہی، آپ کی امت نے میرے ساتھ کیسا برا برتاؤ روا رکھا۔

بیت نہایت براق اور مناسب ہے۔

یومِ عاشور گلستانِ رسالت میں ایسی خزاں آئی کہ ''پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا'':

عاشور کی سحر کا یہ احوال ہے رقم — بس دوپہر میں باغِ حسینی ہوا قلم
تھا غم سے داغ داغ دلِ سرورِ امم — لاشوں پہ رو رہے تھے امامِ فلک حشم
ہر اک کی لاش گود میں لیتی تھیں فاطمہؑ
پرسا حسینؑ پاک کو دیتی تھیں فاطمہؑ

انیسؔ مرحوم نے تیسرے مصرعے میں یوں ترمیم فرمائی۔

''تنہا تھے دشمنوں میں امامِ فلک حشم''

اس اصلاح کی وجہ سے دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔

انیس نے چوتھے مصرعے کی یوں اصلاح کی۔

''نہ ساتھ تھا پسر نہ علم دار نہ علم''

نہ حضرت عباسؑ علم دار تھے (جو خود ایک لشکر تھے) اور نہ شبیہ پیغمبر حضرت علی اکبرؑ جن سے امام مظلوم کو بڑی ڈھارس تھی۔

انیسؔ مرحوم نے بیت کاٹ دی اور خود بیت کہہ کر لگا دی۔

بہتا تھا خوں زمیں پہ تنِ پاش پاش سے
لپٹے ہوئے تھے اکبر مہ رُو کی لاش سے

مذکورہ بالا مرثیوں سے جو تصحیح شدہ بند پیش کیے گئے، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مونسؔ☆ کو اپنے بڑے بھائی انیسؔ مرحوم کی شاگردی کا بھی شرف حاصل تھا۔

یہ انیسؔ مرحوم کا فیض تھا اور خاندانی روایات کا تقاضا کہ مونسؔ کے معجز نگار قلم نے بھی فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیے۔ مختلف (مضامین کے) گوہرِ نایاب ایک لڑی میں پرو دیے۔ آج بھی اہلِ علم اور اربابِ ذوق کے دلوں پر اُن کے کمال کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ ایک جادو نگار شاعر اور باکمال مصور تھے۔

شاعری اور مصوری

شاعری اور مصوری میں فرق ہے، شاعر الفاظ کی مدد سے کسی منظر یا واقعے یا جذبے یا قلبی کیفیت کی مرقع کشی کرتا ہے اور ایسے موزوں الفاظ منتخب کرتا ہے جن سے وہ اپنے مافی الضمیر کی حسین تصویر پیش کر سکے لیکن مصور اپنی فطری صلاحیتوں اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے تصویر میں کشش پیدا کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک کے عظیم فن کار عبدالرحمٰن مرحوم کی مصوری کے فن پارے پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے محاسنِ فن کے

☆ مونسؔ نے انیسؔ مرحوم کے انتقال پر آٹھ یا نو بند کا ایک مسدس لکھا تھا جس میں اپنے بھائی سے والہانہ محبت اور شاگردی کا اعتراف کیا تھا۔

تجھ سا انیسؔ خلق سے معدوم ہوگیا — مونسؔ تری جناب سے محروم ہوگیا
کیا شاد ہو وہ دل کہ جو مغموم ہوگیا — پھر تازہ داغِ والدِ مرحوم ہوگیا
انداز مرثیے کے طریقے سلام کے
تو نے دکھا دیے مجھے کوچے سلام کے

شادؔ عظیم آبادی، پیمبرانِ سخن، ص ۲۶۱

بارے میں شاعر[☆۱] کی زبان سے سنیے:

کہاں شمار ہو اس کے محاسنِ فن کا　　نہ تھا قلم کا مگر موقلم کا شاعر تھا
نگار بند پری خانۂ تصور کا　　بھرے خطوط میں جو جزر و مد تنفس کا
برش کے لمس سے بے جان کو کرے گویا　　وہ پیچ و خم میں لب و لہجہ بخشنے والا
جواب رنگ کے آہنگ میں نہیں جس کا　　دیا شبیہ نگاری کو رنگ و روپ نیا

یہ واقعہ ہے کہ چغتائی نے مصوری میں جدید تکنیک سے کام لیا اور خطوط میں تنفس کے جزر و مد بھر دیے۔ اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مونس مرحوم کے چند مرثیوں سے مصوری کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

بند ۱

جب شاہ کے سفر کا زمانہ گزر گیا　　صحرائے کربلا میں علیؑ کا پسر گیا
جنگل تمام خلد کے پھولوں سے بھر گیا　　ایسی ہوا کچھ آئی کہ گلگوں[☆۲] ٹھہر گیا
سرکا نہ اس زمیں سے قدم خوش خرام کا
گردن پھرا کے تکنے لگا منھ امام کا

مرثیے کا پس منظر مدِنظر رہے۔
۲ محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ اپنے اعزہ و رفقا سمیت وارد کربلا ہوئے۔
نواسۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتولؑ، فرزندِ مرتضیٰؑ برادرِ حسنِ مجتبیٰؑ کی تشریف آوری سے سرزمینِ کربلا خلد کا نمونہ بن گئی۔ امامِ عالی مقام کا رہوار سبک رفتار تھا لیکن اس مسحور کن ماحول سے وہ بھی اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں:

"گردن پھرا کے تکنے لگا منھ امام کا"

☆۱۔ خالد، عبدالعزیز، پاکستان کا شہرۂ آفاق مصور، چغتائی مرحوم، روزنامہ جنگ، کراچی ۲۵ر فروری ۱۹۷۵ء، ص۱۲

☆۲۔ گلگوں (ف) صفت گلاب کے رنگ کا۔ عمدہ اور چالاک گھوڑا،
بوئے گل کی طرح گرد واہ دکھلائی نہ دی　　یار کا گلگوں نسیمِ صبح سے چالاک تھا (آتش)

مونس نے ایسی تصویر کھینچی جس میں حرکت بھی ہے، الفاظ کی صناعی کا یہ ایسا حسن ہے جو مصوری پر سبقت لے گیا۔ اسی مرثیے سے چند اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

فرات کے ساحل پر خیامِ حسینی نصب کیے جانے کا انتظام ہو رہا تھا، اتنے میں سامنے سے گرد اٹھی، دو شتر سوار نظر آئے۔ اُنھوں نے خبر دی کہ افواج کوفہ و شام بہت قریب ہیں، ان مخبروں کو گئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی ہوگی کہ میدان میں کالے کالے پھریرے دکھائی دینے لگے۔

بند ۲۵

تاکہ قریب فوج کا انبوہ آگیا　　اٹھ کر غبار دشت میں بادل سا چھا گیا
بانگِ دُہل سے کوہ کا دل تھرتھرا گیا　　قرنا کا شور گوشِ سما میں سما گیا
ہلنے لگا دھمک سے سفینہ زمین کا
ٹاپوں سے ٹکڑے ہوگیا سینہ زمین کا

مونس کی منظر نگاری سحر حلال ہے، گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس قدر غبار اٹھا کہ وہ آسمان تک پہنچ گیا۔ گمان ہوا کہ دشتِ نینوا میں بادل چھا گئے۔ باجوں کے شور سے رن بولنے لگا، کوہ کا دل بھی تھرا گیا، قرنا کا شور آسمان تک سنائی دیتا، زمین کا سینہ بھی شق ہوگیا، منظر کی مکمل تصویر ہے۔ یگانۂ روزگار ڈراما نگار شیکسپیئر کے بارے میں مشہور ہے کہ معاشرت اور خصائلِ انسانی کے قلم بند کرنے میں اسے یدِطولیٰ حاصل تھا، مونس کے کلام کی یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ نفسیات کی مدد سے اور گنجینۂ الفاظ سے قلبی واردات کی نہایت کامیاب مرقع کشی کرتے ہیں۔ پسرِ سعد کی فوج کے ہراول دستے کا سردار اس پر مصر ہوا کہ خیامِ اہلِ بیت نہر سے دور ہٹا دیے جائیں۔ ورنہ:

"خیمے کا پھر پتا نہ لگے گا کہ کیا ہوا"

بند ۳۱

سن کر کلام یہ سپہ بے حجاب کے　　عباسؑ تھرتھرانے لگے ہونٹ چاب کے

چینِ جبیں نے طور دکھائے عتاب کے   تیور بدل گئے خلفِ بو تراب کے
کہنی تک آستیں کو چڑھا کر کلائی سے
اک شیر ہونکتا ہوا جھپٹا ترائی سے ☆۱

غیظ و غضب کی حالت میں حضرت عباسؑ کا تھرتھرانا اور ہونٹوں کو چبانا ان کی قلبی کیفیت کی عکاسی ہے، ''خلفِ بو تراب'' کے ٹکڑے سے حضرت علیؑ کی جلالت کی طرف اشارہ ہے۔

کہنی تک آستیں چڑھائے ہوئے، شمشیرِ آب دار علم کیے ہوئے شجاعت سے سرشار افواجِ دشمن کی طرف لپکے۔ شیرکیؔ مناسبت سے ہونکنا کس قدر موزوں ہیں۔ اس میں صوتی اثرات بھی ہیں۔ جھپٹنا حرکت کی غمازی کرتا ہے، جزئیات کے بیان سے تصویر کے خدوخال ابھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں، یہ ہے فن کا کمال، اسی ضمن میں حسبِ ذیل بند دیکھیے، جس سے لشکرِ اعدا کے انتشار کی کیفیت آشکار ہوتی ہے۔

تھی ہر طرف سپاہِ ضلالت اثر تباہ   ابتر☆۲ اِدھر سوار پیادے اُدھر تباہ
لشکر کی چھاؤنی میں ہوئے گھر کے گھر تباہ   انساں کا ذکر کیا ہے کہ تھے☆۳ جانور تباہ
اس برق نے جو پھونک دیا تھا زمانے کو
جنگل بدلتے پھرتے تھے جانیں بچانے کو

حضرت عباسؑ کی شمشیر، برق کی تصویر تھی، اس کا پیراہن سرخ تھا، اس میں غضب کی لگاوٹ تھی، وہ خود دشمنوں سے گلے ملتی تھی، رزم گاہ میں ایسی ہوا چلی تھی کہ جسموں سے سر اڑ رہے تھے۔ ہر طرف نقارے سرنگوں پڑے تھے، نہ کوس و دف کی آواز سنائی دیتی تھی اور نہ ڈھل کی۔ لشکر کی چھاؤنی میں گھر کے گھر تباہ ہوگئے تھے، کامیاب مرقع کشی ہے۔

حضرت عباسؑ کے رہوار کے بارے میں حسبِ ذیل لاجواب بند کی داد دیجیے۔

☆۱۔ انیسؔ مرحوم کا لاجواب مصرع ذہن میں رہے، ''ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے''
☆۲۔ ایک نسخے میں یہ مصرع اس طرح درج ہے، ''افسر اِدھر تباہ، پیادے اُدھر تباہ''
☆۳۔ ایک نسخے میں 'کہ تھے' کے بجائے 'ہوئے' لکھا ہے۔

بند ۱۱۱

پتلی تھی اس فرس کی کنوتی☆۱ جو دم بدم — پیکاں نوکیلے دو نظر آجاتے تھے بہم
کنڈا☆۲ کیے تھا یوں سرِ میداں وہ خوش قدم — گردن نئی عروس کی جس طرح ہوئے خم
حسنِ مصوری دمِ تحریر دیکھ لو
عباسؑ کے سمند کی تصویر دیکھ لو

کنوتی کو نوکیلے پیکان سے تشبیہ دی ہے۔ شاعر نے عام مشاہدے کی بات کس حسن و خوبی سے بیان کی ہے۔ نئی نویلی دلہن شرم و حجاب کی وجہ سے اپنی گردن جھکائے بیٹھی رہتی ہے، فرسِ خوش قدم کنڈا کیے ہوئے تھا، مونس کی مرقع کشی رشک و روکشِ مانی و بہزاد ہے۔

مونس نے ۱۲۵ بند کا ایک مرثیہ حضرت عون و محمد کے بارے میں لکھا جس کا مطلع ہے، "اے اخترِ اقبالِ سخن جلوہ نما ہو۔" دونوں بھائی میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے، ان کے چہروں کا رنگ کہکشاں سے کہیں صاف تھا۔

قاف سے تا قاف نورِ خدا پھیلا ہوا تھا، خاک کا ہر ذرہ روکشِ انجم تھا۔

بند ۴۵

بشاش و فرحناک تھے زینبؑ کے وہ دل دار — مطلق نہ تھا یہ دھیان کہ لاکھوں ہیں ستم گار
سر اپنا اٹھائے ہوئے جاتے تھے جو رہوار — تن تن کے حشم اپنا دکھاتے تھے یہ ہر بار
کاندھے پہ تو تھے نیچے اور ہاتھ عناں پر
ماتھے پہ شکن تند نظر فوجِ گراں پر

حضرت زینب کے دونوں صاحب زادے خوشی سے سرشار تھے کہ ان کو رزم گاہ جانے کی اجازت مل گئی۔ اب وہ اپنی جانیں امامِ عالی مقام پر قربان کر کے شہادت سے سرفراز ہوں گے۔ دونوں کا تعلق حیدرؑ کے مشہور گھرانے سے تھا۔ اس لیے یہ بھی

☆۱۔ گھوڑے کے کان کا بالا۔
☆۲۔ گھوڑے کا اپنے سر کو دم کی طرف کھینچنا۔

نمواروں کو چن چن کر چورنگ کریں گے اور ہر طرف لاشوں کے انبار ہی انبار دکھائی دیں گے۔ رہوار سر اٹھائے ہوئے میدان کی طرف جا رہے تھے اور دونوں بھائی تن تن کے دشمنوں کو اپنا جاہ و حشم دکھا رہے تھے۔ لجامِ فرس پر ہاتھ کاندھے پر نیچے قہر کی نظروں سے افواجِ اعدا کو دیکھ رہے تھے۔ الفاظ میں مرقع کشی اور فن کاری کا کمال ہے۔

اسی مرثیے سے معرکۂ کارزار کی ایک اور تصویر دیکھیے۔

بند ۶۵

نعروں سے دلیروں کے پڑی فوج میں ہلچل　　جنبش ہوئی گیتی کو لرزنے لگا جنگل
بھاگے اِدھر اسوار اُدھر چھپ گئے پیدل　　اوّل صفِ آخر ہوئی آخر صفِ اوّل
مجمع تہ و بالا سرِ میداں نظر آیا
طبقے کے الٹ جانے کا ساماں نظر آیا

حضرت عون و محمد کے نعروں سے بڑے بڑے بہادر پہلوانوں کے زہرے آب ہو گئے۔ گیتی کو جنبش ہوئی، دشتِ نینوا میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے جوانوں کے قدم اکھڑ گئے، اسوار اور پیدل سب ہی نے راہِ فرار اختیار کی اور میدانِ کارزار انتشار کا شکار ہو گیا۔ کربلا کا طبقہ اب الٹا اب الٹا۔ حضرت عون و محمد کی جنگ نے خیبر اور خندق کے معرکوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ سب قدر انداز رخ پھیرے ہوئے کھڑے تھے، لشکر کے نشان خجالت سے گڑے ہوئے تھے، لشکرِ اعدا کے بڑے بڑے سورما جو قلزمِ آہن میں غرق تھے، ان کے تن کہیں لوٹ رہے تھے اور سر کہیں تھے۔ جو بچ گئے تھے، وہ جائے امن کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

مرقع کشی، طرزِ بیان اور زبان پر قدرت سونے پر سہاگا ہے۔

مونس نے ۱۸۰ بند کا ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے۔

"ہاں اے سحابِ دیدۂ تر اشک بار ہو"

اس مرثیہ میں مصوری کے شاہ کار بند ہیں جن کی بابت ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ... "کرشمہ دامنِ دل می کشد"...

"لیکن طوالت کے اندیشے سے انتخاب در انتخاب"
ہی پر اکتفا کریں گے۔

میدانِ کارزار کی کیفیت...

افواجِ اعدا نے جب امامِ مظلوم پر تیروں کی بوچھار کی تو سپاہِ مخالف کو رول کر دو صفوں میں در آئے، اس وقت یہ غل ہوا کہ حضرت علی درِ خیبر کھول کر بڑھے ہیں۔

بند ۹۳

بھڑکا رہی تھی تیغ جو آتش اِدھر اُدھر
سب دوزخی پڑے ہوئے تھے غش اِدھر اُدھر
ناوک قلم تو خاک پہ ترکش اِدھر اُدھر
گوشوں کو ڈھونڈتے تھے کماں کش اِدھر اُدھر
راہِ صواب سے جو رخ ان سب کے پھر گئے
حلقے میں خود اجل کے خطاکار گھر گئے

پیماں شکن زخموں سے چور چور تھے جسموں پر جو خلعت تھے، وہی ان کے لیے کفن ہو گئے تھے، لاشوں کے بار سے لاشے عذاب میں تھے۔ یہ فشارِ لحد کے فشار سے کم نہ تھا۔

زمین پر مورچے پامال تھے، توسن پیکروں پر تھے اور پیکر زمین پر، دل بے تاب کی طرح تن پارہ پارہ تھا، ہر ایک کشتۂ سیماب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

بند ۱۰۹

بے دم پڑے تھے خاک پہ سرافگنوں کے تن
بے تن کہیں تھے سر کہیں بے گردنوں کے تن
کٹ کٹ کے راکبوں پہ گرے توسنوں کے تن
کیا کیا خراب و خستہ تھے رُوئیں تنوں کے تن
جز روئے موت اور کسی پر نظر نہ تھی
اس وقت تن بدن کی سروں کو خبر نہ تھی

مصور کا موقلم معرکۂ کارزار کی تصویر اس حسن و خوبی سے پیش کرنے سے قاصر رہے گا لیکن مونس کی پیش کردہ تصویر کے نقوش ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

رزمیہ شاعری میں ڈرامائی شان کے یہ نادر نمونے ہیں۔

امامِ مظلوم پر جب سپہ روسیاہ کا نرغہ ہوا اور تین رخ سے دس ہزار تیر چلے تو ان کا سینۂ اقدس چھن گیا، بازو فگار ہوگئے، جسمِ مبارک سے لہو کی دھاریں چھٹنے لگیں، رکابوں میں قدم تھرتھرا رہے تھے اور زخموں کی تاب نہ لاکر۔

بند ۱۶۵

بسمل کی طرح لوٹتے تھے شاہِ دیں کبھی　　اٹھ بیٹھے گاہ خم ہوئے سوئے زمیں کبھی
حسرت سے کی نظر سوئے چرخ بریں کبھی　　تھاما جگر کو ہاتھوں سے گاہے جبیں کبھی
گرنے لگے تو ٹیک کے ہاتھوں کو رک گئے
آیا جو غش تو خاک پہ سجدے میں جھک گئے

دل خراش واقعات کی بھی تصویر کشی ہے اور نفسیات کی بھی۔

"ٹیک کے ہاتھوں کو رک گئے" اور غش کی حالت میں "خاک پہ سجدے میں جھک گئے۔" مونسؔ نے مندرجہ بالا بند میں حرکت کے عمل میں تسلسل قائم رکھا ہے جو فن کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے بعد خنجر و گلو کے روح فرسا اور جاں گزا مرحلے کی مرقع کشی ہے۔

بند ۱۶۷، شہادت

لکھا ہے راویوں نے کہ ہنگامِ قتلِ شاہ　　کانپے جبال آگئی لرزے میں قتل گاہ
آندھی☆[1] اٹھی غضب کی کہ اللہ کی پناہ　　سورج گہن☆[2] میں آگیا دنیا ہوئی سیاہ
تڑپے طیور خاک پہ مسکن سے چھوٹ کے
تارے فلک سے گرنے لگے ٹوٹ ٹوٹ کے

اس قیامت خیز منظر کو دیکھ کر حرمِ ابن بوتراب خیمے سے نکل پڑے، کوئی برہنہ پا تھا اور کوئی بغیر نقاب کے، اضطراب کی حالت میں ماؤں سے بچے چھوٹ گئے

☆۱۔ ایک نسخے میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے، "آندھی غضب کی آئی کہ اللہ کی پناہ"
☆۲۔ ایک نسخے میں یہ مصرع اس طرح درج ہے، "آیا گہن میں شمس جہاں ہوگیا تباہ"

تھے، ان کی آہ و فغاں اس قدر دردناک تھی کہ دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے، سب کے بالوں پر دشتِ مصیبت کی خاک پڑی ہوئی تھی۔

ماتم گساروں اور سوگواروں کے قلبی واردات کی صحیح عکاسی اور نفسیات کی نادر مصوری ہے۔

مذکورۂ بالا مرثیے میں بہت سے ایسے بند ہیں جن کو پڑھ کر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور مونس کی مصوری کی تعریف و توصیف کی دل کھول کر داد دینی پڑتی ہے۔

زبان

مونس کے اندازِ بیان اور ان کی شستہ زبان کی جس قدر تعریف کی جائے، وہ کم ہے۔ ان کے چند مرثیوں سے زباں دانی اور سحر بیانی کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں، ان کے ایک مرثیے☆ کے چہرے میں تعلّی ہے۔

بند ۳

سب ایک زباں ہوں یہ طلاقت نہیں دیکھی	یہ حسن یہ بندش یہ لطافت نہیں دیکھی
یہ نور کی لفظیں یہ فصاحت نہیں دیکھی	یہ سلسلہ بندی یہ بلاغت نہیں دیکھی
دیکھو تو عجب طبع رواں پائی ہے اس نے
دھوئی ہوئی کوثر سے زباں پائی ہے اس نے

اس تعلّی کو صداقت پر محمول کیا جاسکتا ہے، مندرجہ بالا بند ٹکسالی زبان کا نمونہ ہے۔ اسی مرثیے سے ایک اور بند نقل کیا جاتا ہے جس میں لطفِ زبان کے علاوہ صوتی اثرات کی ہم آہنگی بھی ہے۔

بند ۶۷

گھوڑوں کا یہ عالم تھا کہ تھمتے نہ تھے دم بھر	سرعت میں حرارت میں یہ بجلی تھا وہ صرصر

☆ "اے اخترِ اقبالِ سخن جلوہ نما ہو" (مطلع)

جاتا تھا یہ میدان میں سن سن تو وہ فرفر وہ ابر یہ سیماب وہ گل رُو یہ سمن بر
وہ رشکِ پری اور یہ چھلاوا ہمہ تن تھا
خوبی میں وہ طاؤس یہ شوخی میں ہرن تھا

مندرجہ بالا بند میں حضرت عون و محمد کے گھوڑوں کی تعریف کی گئی ہے۔ صرصر، سن سن، فرفر، صوتی اثرات کی عمدہ مثالیں ہیں۔

اسی ضمن میں مونس کے ایک مرصع☆ مرثیے سے چند بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں محاسنِ زبان کی جلوہ گری ہے۔

بند ۹۴

تیزی وہ دستِ پاک کی وہ آب و تابِ تیغ کیا منہ کسی کا تھا کہ جو دیتا جوابِ تیغ
طوفاں کی موج سے تھا سوا اضطرابِ تیغ بڑھ کر گلوں تک آ گیا دریائے آبِ تیغ
اتری بھی یہ تو خون سروں پر چڑھا رہا
دو چار ہاتھ باڑھ کا پانی بڑھا رہا

اللہ ری زبان پر قدرت۔ حسنِ بیان پر حسنِ فصاحت نثار ہو رہا ہے۔

بند ۹۷

سیّد کے قاتلوں سے غضب اس کو لاگ ہے دل ناریوں کے دیکھ کے غصّے میں آگ ہے
دشتِ دغا میں چار طرف بھاگ بھاگ ہے ڈسنے کو موذیوں کے وہ اُفعی ہے ناگ ہے
چلّاتے تھے سپاہ میں گھائل بچے رہو
ہے اس کی آب میں سمِ قاتل بچے رہو

مندرجہ بالا بند سخن طرازی کی عمدہ مثال ہے۔ چاروں مصرعوں کے قافیوں نے انداز بیان میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

رزم گاہ میں جس طرف فوج اعدا سر بکف نظر آئی، تلوار بھی اُسی سمت پہنچ گئی

☆ مطلع "ہاں اے سحاب دیدۂ تر اشک بار ہو"

اور صفوں پر اس نے اپنا تسلط جمالیا۔ بعد ازاں،

بند ۹۹

گردن سے سر گرا دیے سردار دیکھ کر در آتی تھی دلوں میں جگر دار دیکھ کر
فقروں کو آپ اپنے اژدار دیکھ کر کہتی تھی سرکشوں سے خبردار دیکھ کر
سرکو ہٹو بچو کدھر آئے بڑھے ہوئے
تم سب ہو آج میری نظر پر چڑھے ہوئے

زبان پر یہ حاکمانہ قدرت اُسی کو نصیب ہو سکتی ہے جس کے گھر کی زبان ہو یا اسے انیسؔ کی شاگردی کا شرف حاصل ہو۔

تشبیہات اور استعارات کی آمیزش نے بھی مونسؔ کے کلام میں سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ تشبیہ و استعارہ وہ خوبیاں ہیں جو زبان کی شانِ فصاحت کی کان اور بلاغت کی جان ہیں۔

مونسؔ نے تشبیہات و استعارات سے نہایت دل کش نقش و نگار بنائے ہیں۔

امام عالی مقام کے خیمۂ اقدس کے بارے میں ایک بند دیکھیے:

وہ اوج اور وہ خیمۂ[☆۱] گردوں حشم کا دور خورشیدِ دیں تھا اس میں یہ رفعت تھی ایک اور
شمسے[☆۲] کی زرق برق پہ موسیٰ کریں جو غور دل میں کہیں کہ طورِ تجلّی کا سب ہے طور
حیراں ہو کیوں نہ چشم ہر اک حورِ عین کی
کھینچے ہے آسماں کو طنابیں زمین کی

مونسؔ نے خیمے کے لیے گردوں حشم کی ترکیب استعمال کی اور امام حسینؑ کو خورشیدِ دیں کہا جس طرح سورج ساری دنیا پر اپنی کرنیں بکھیرتا ہے اسی طرح امامِ عالی مقام (آفتابِ دیں) عالم کو ہدایت فرماتے رہے۔

☆۱۔ مطلع، جب شاہ کے سفر کا زمانہ گزر گیا، بند ۴۷ کے بعد فٹ نوٹ میں وہ بند اضافی ہیں۔

☆۲۔ شمسہ (ف) سنہرا قرص جو قبہ یا کلس میں لگاتے ہیں،

قربان ضیا ہر ملک و حور کا دل تھا
شمسے پہ تجلی تھی کہ خورشید خجل تھا، (نفیسؔ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر تجلی دیکھی تھی جس کی تاب نہ لاکر وہ بے ہوش ہوگئے تھے، خیمے کے شمسے کی یہی کیفیت ہے۔ شمسہ کو طور تجلی سے تشبیہ دی ہے۔ خیمہ نصب کرنے کے لیے طنابیں لگائی جاتی ہیں، مونس نے پہلے مصرعے میں خیمہ گردوں حشم کہا ہے، اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چھٹا مصرع پڑھیے اور اس انداز بیان پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیجیے۔ آخر میں ایک بند پیش کیا جاتا ہے جو جلوہ گاہ حسن مضامین ہے۔☆[1]

دم☆[2] چھوڑتی تھی تن میں نہ شمشیر قضا دم☆[3]
جس پر یہ چلی ڈر کے پکارا وہ چلا دم☆[4]
سر پر ہو یہ آفت تو بھلا لے کوئی کیا دم☆[5]
خنجر کی زباں☆[6] لال تھی گویا کہ نہ تھا دم☆[7]
تھا ہاتھ میں اکبر کے جو پھل تیغ علی کا
مہتاب کو دھوکا ہوا انگشتِ نبیؐ کا

حسنِ بیان، لطافتِ زبان، محاروں کی چاشنی، تشبیہ کی معنی آفرینی سے لطف اٹھائیے۔

مونس نے مرثیہ کی تکنیک میں کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن ان کا شہپرِ فکر پرواز کے لیے نئے نئے مضامین تلاش کرتا رہا۔

ان کے مرثیوں کی چھ جلدیں مطبوعہ ہیں۔ ان کے اہلِ خاندان کے پاس مزید مرثیوں اور سلاموں کا ذخیرہ موجود ہے۔ ان کے سلاموں میں مضمون آفرینی اور موعظت

☆۱۔ مطلع، میدانِ وغا میں علی اکبرؑ کی ہے آمد، شمسے پہ تجلی تھی کہ خورشید جمل تھا (مونس)
☆۲۔ دم چھوڑنا، زندہ نہ رہنے دینا۔
☆۳۔ قضا دم، ترکیب کا برمحل استعمال
☆۴۔ دم چلا، مرگیا
☆۵۔ دم لینا سانس لینا توقف کرنا: مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میر تقی میر)
☆۶۔ زبان لال ہونا، کنایہ، زیادہ کہنے سے عاجز ہونا۔
زبان لاکھ ہے لالِ غنچۂ گل کی ۔۔۔ کہاں سے شکوہ بلبل ہزار بار کریں (جلیل)
☆۷۔ دم نہ ہونا، سکت نہ ہونا، عاجز ہونا۔

کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جس سے ان کی فن کارانہ مہارت کا علم ہوتا ہے۔

مونس خوش لہجہ بھی تھے اور خوش فکر بھی، باکمال مصور بھی تھے اور جادو بیاں شاعر بھی۔

رزمیہ اور المیہ مضامین نظم کرنے میں وہ قدرتِ کاملہ رکھتے تھے، اسی لیے ان کا شمار صفِ اوّل کے مرثیہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔

۱۵۔ نفیسؔ، میر خورشید علی

انیسؔ مرحوم نے فنِ مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا اور آسمانِ شاعری پر آفتاب بن کر چمکے۔ خداوند تعالیٰ نے ان کو تین فرزند عطا فرمائے تھے، میر خورشید علی نفیسؔ، میر محمد عسکری رئیسؔ اور میر محمد سلیسؔ۔ سن کے علاوہ فن کے اعتبار سے بھی میر نفیسؔ اپنے تمام بھائیوں میں ممتاز تھے۔ استعدادِ علمی بہت اچھی تھی، فارسی میں میر محمد عباس سے مشورہ تھا اور اردو میں اپنے والد کے شاگرد تھے، مرثیہ گوئی کی شہرت میں میر انیسؔ کے بعد انھیں کا مرتبہ ہے۔

نفیسؔ کا معمول تھا کہ ۲۵ رجب کو اپنا تصنیف مرثیہ دلا رام کی بارہ دری میں پڑھا کرتے تھے... ایک مرتبہ میر صاحب مرثیہ جدید پڑھ رہے ہیں، لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ صاحبِ مجلس منبر کے پاس کھڑے ہیں، یہ بھی ایک مسن آدمی ہیں میر انیسؔ کے ملنے والے میر اعظم علی نام ہے، رجب کی مجلس ان کی مشہور ہے، لوگ دور دور سے آتے ہیں، آٹھ آٹھ روز تک اسی انتظار میں قیام فرماتے ہیں۔

میر صاحب اسی انداز سے پڑھ رہے ہیں۔ محویت کا عالم ہے، ایک مرتبہ آپ نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"وہ گرد اٹھی وہ جگر بندِ بوتراب آیا"

منبر پر نیم قد کھڑے ہوگئے اور ہاتھ سے اشارہ کر کے "وہ" اس طرح کہا کہ لوگ پیچھے پھر کے دیکھنے[☆1] لگے۔"

☆ عشرت، خواجہ عبدالرؤف لکھنوی، تذکرۂ آبِ بقا، ص ۱۴۱۔ ۱۴۲

نفیس نے تقریباً ساٹھ پینسٹھ سال مشقِ سخن کی اور مرثیہ گوئی میں انھوں نے بہت شہرت حاصل کی۔

''اُن سے (میر نفیس سے) میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا، بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی و سلام و رباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے۔''☆۱

ہندوستان میں میر نفیس مرحوم کے مرثیے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

میرے استفسار پر زیدی صاحب نے فرمایا:

''ان کے غیر مطبوعہ مرثیے سید ہادی حسین صاحب لائق کے پاس لکھنؤ میں موجود ہیں۔''☆۲

۱۳۱۸ھ (مطابق ۱۹۰۰ء) میں میر نفیس کا انتقال ہوا۔

سید محمد ہاشم نے حسبِ ذیل☆۳ تاریخِ وفات لکھی۔

بلبلِ باغِ ثنا و چمن آرائے سخن
والد ان کا تھا سخن اور وہ شیدائے سخن
وارثِ فن و کمالِ اب و اجدادِ نفیس
عارفِ کہنہ سخن واقفِ منشائے سخن
ان کی نیسانِ طبیعت سے ملے عالم میں
بحرِ مواجِ سخن کو درِ یکتائے سخن
عہدۂ مدحِ ائمہ میں ہوئی پانچویں پشت
پائے نام ان کی رہا منصبِ والائے سخن
ضاحک و میر حسن، میر خلیق اور انیس
تھے یہ سب زیب دہِ مسندِ زیبائے سخن

☆۱۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخِ اردو ادب، مطبوعہ نامی پریس، لاہور، (مترجمہ مرزا محمد عسکری) ناشر، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ص ۳۳۷

☆۲۔ جناب سید یوسف حسین زیدی (خلف علی محمد عارف مرحوم)

☆۳۔ ہاشم، سید محمد، مجموعہ تاریخ معروف بہ تاریخِ آئینہ جمال، ۱۳۵۲ھ (مطابق ۱۹۳۳ء عیسوی) ص ۲۷۔۲۸

لاجواب ان کے سخن اور یہ سخن سے بے مثل
تھا نظیر ان کے سخن اور یہ ہمتائے سخن
یہی باب اور یہی مرجع سخن زیبا کے
رکھتا تھا ان سے سخن آپ تمنائے سخن
شاعر اس طرح کا گویا نہ ہوا اردو میں
ہر سخن داں کو نہیں اس میں کہیں جائے سخن
تھے یہ وہ یوسفِ کنعان معانیِ حسیں
سوگ میں مرگ سے جن کے تھی زلیخائے سخن
وہ فصاحت وہ بلاغت وہ کلامِ شیریں
جس کے مذکور پہ لب چاٹ کے رہ جائے سخن
جوہری لوٹتے تھے لعل و گہر مضمون کے
موج زن ہوتا تھا جب آپ کا دریائے سخن
سالِ رحلت کی ہوئی فکر تو ہاتف نے کہا
وائے عالم سے گیا محی و مولائے سخن

۱۳۱۸ ہجری

مرثیہ کے اجزائے ترکیبی کو مدِنظر رکھتے ہوئے نفیس مرحوم کی مرثیہ نگاری پر تبصرہ کیا جارہا ہے۔

چہرہ

چہرہ یعنی مرثیہ کا آغاز
ایک مرثیہ کا چہرہ ☆[1] پیشِ خدمت ہے جس میں تعلّی ہے۔

بند ۱

پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمراں ہے آج پھر جلوۂ جلوسِ معانی عیاں ہے آج

☆ مطلع، پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمراں ہے آج، تعداد بند ۱۵۳

پھر شلِ بحر، جوش پہ طبعِ رواں ہے آج ۔۔۔ پھر دُرفشاں زبانِ بلاغت نشاں ہے آج
مشتاق نقدِ نظم ہر اک حق پسند تھا
لو آج پھر کھلا وہ خزانہ جو بند تھا

بند ۲

ہے بحرِ نور حال یہ فکر و نظر کا ہے ۔۔۔ یہ طبعِ باصفا ہے کہ معدن گہر کا ہے
یہ ذہنِ پُرضیا ہے کہ مسکن قمر کا ہے ۔۔۔ مطلع ہے مرثیے کا کہ مطلع سحر کا ہے
مدحت ہے اس میں لختِ دلِ بوتراب کی
مجلس میں روشنی ہے اسی آفتاب کی

پُرشکوہ الفاظ اور حسنِ بندش سے سامعین/ قارئین پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور اربابِ ذوق تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

ایک مرثیہ☆ حضرت عباسؑ کے حال میں ہے جس کا چہرہ نفیسؔ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

بند ۱

عباسؑ کو جہاد کی جس دم رضا ملی ۔۔۔ پایا شرف، سعادتِ قربِ خدا ملی
جان آگئی کہ دردِ جگر کی دوا ملی ۔۔۔ رخصت ملی کہ دولتِ لاانتہا ملی
دے کر دعائیں شہ کے قدم چومنے لگے
اٹھ کر قدم سے شلِ اسد جھومنے لگے

بند ۲

اس کی خوشی جو تھی کہ ملی اب رہِ ثواب ۔۔۔ چہرے کا رنگ سرخ ہوا مثلِ آفتاب
تیغ و سپر اٹھا کے جری نے بہ آب و تاب ۔۔۔ پٹکا کمر سے باندھ لیا مثلِ بوتراب
جوش آگیا فزوں ہوسِ جنگ ہوگئی
بالیدگی سے تن پہ زرہ تنگ ہوگئی

☆ مطلع، عباسؑ کو جہاد کی جس دم رضا ملی (تعداد بند ۱۲۹)

جب امام حسینؑ نے حضرت عباسؑ کو نہرِ فرات سے پانی لانے کی اجازت دے دی تو ان کی دلی مراد برآئی، خوشی کی وجہ سے چہرے پر سرخی دوڑ گئی، مسرت کی حالت میں تیغ و سپر اٹھالی۔ کمر سے پٹکا باندھ لیا، زرہ تنگ ہوگئی (قلبی واردات کے پیشِ نظر) نفیس نے ایک ماہرِ نفسیات کے فرائض انجام دیے ہیں۔

مرقع کشی قابلِ صد تحسین ہے، اندازِ بیان نہایت حسین ہے۔

چہرے میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔

منظر وہ کیفیت ہے جو چند واقعات یا متعدد جزئیات سے پیدا ہوا، اس لیے ضروری ہے کہ شاعر کا مشاہدہ وسیع ہو تا کہ منظر نگاری میں تنوع ہو۔

طلوعِ صبح ☆ کا منظر دیکھیے:

بند ۱

فراغ ماہ کو جب رات کے سفر سے ہوا — فروغ انجمِ تاباں نہاں نظر سے ہوا
تمام دہر منور رخِ سحر سے ہوا — ظہورِ مہر میں کوہ و دشت و در سے ہوا
وفورِ حسن سے چاروں طرف ضیا پھیلی
جہاں میں روشنیِ قدرتِ خدا پھیلی

بند ۲

وہ دور دور بیاضِ فلک و نورِ سحر — وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور وہ ظہورِ سحر
وہ گلشنوں میں نوا سنجیِ طیورِ سحر — نقاب چہرے سے الٹے ہوئے وہ حورِ سحر
وہ نورِ حسن جو اپنا سماں دکھانے لگا
فلک پہ چاند خجالت سے منھ چھپانے لگا

صبح کا پرکشش منظر، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، طیور عبادتِ الٰہی میں مصروف ہیں، کوئی پرند یاحق کہہ رہا ہے اور کوئی یاہو، جہاں میں ہر طرف خدا کی قدرت کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

☆ مطلع، فراغ ماہ کو جب رات کے سفر سے ہوا (تعداد بند ۱۳۹)

جب سپہر بریں پر صبح کا ظہور ہوا تو ضیائے کواکب پر نورِ صبح غالب ہوا، صبح کی روشنی فرشِ زمیں پر پھیل گئی اور اس کے طالع بیدار ہوگئے۔

۲۔ سراپا

کردار نگاری میں کرداروں کا سراپا بھی شامل ہوتا ہے جس سے ان کی نفسیات اور سیرت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس موضوع سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوتا جوئے شیر لانا ہے۔

نفیسؔ نے ایک مرثیے☆[1] میں حضرت عباسؑ کا سراپا اس طرح نظم کیا ہے۔

حسنِ پیشانیِ انور سے خجل مہرِ مبیں　　جس سے روشن ہے اُدھر چرخ اِدھر روئے زمیں
ورقِ مصحفِ ناطق سحرِ مشرقِ دیں　　ہے نشاں سجدہ باری کا جو بالائے جبیں
　　نخلِ گلزارِ عبادت کا ثمر ہے دیکھو
　　جلوہ گر یا کفِ موسیٰ پہ گہر ہے دیکھو

'ورقِ مصحفِ ناطق' اور 'سحرِ مشرقِ دیں' کی ترکیبیں کس قدر معنویت سے بھرپور ہیں، پیشانیِ اقدس کے نشان کو نخلِ گلزارِ عبادت کا ثمر قرار دیا۔ یہ بھی واضح کردیا کہ اس نشان میں یدِ بیضا کی خصوصیت ہے۔

ان کے چہرے کی ضیا عرشِ اعظم کو ضیا بخشتی ہے، اس میں آئینۂ نورِ خدا کا جلوہ ہے۔

آفتاب و مہ تاباں کا بھلا کیا ذکر، یہ تو گردوں پر شرم گیں پھرتے ہیں، حضرت عباسؑ کے چہرۂ انور پر دونوں کی نظر حشر تک نہ ٹھہر سکے گی۔

ایک مرثیے☆[2] میں نفیسؔ نے حضرت علی اکبرؑ کا سراپا یوں نظم کیا ہے۔

بند ۴۸

چہرے کی ضیا مہر کی تنویر سے بہتر　　آواز ہے داؤد کی تقریر سے بہتر

☆۱۔ مطلع، طبع روشن ہے مری شمع شبستانِ سخن، بند ۵۲

☆۲۔ مطلع، اُس سے کا ہوں خوشدہ کہ سکتی نہیں جس میں (تعداد بند ۱۳۶)

دل دوزی میں ایک ایک پلک تیر سے بہتر ابروئے کشیدہ خمِ شمشیر سے بہتر
اُن کے شرف اللہ کے محبوبؐ سے پوچھو
حسن ایسا جسے یوسفِ یعقوب سے پوچھو

تلمیحات اور تشبیہات کی مدد سے نفیسؔ نے شبیہِ پیغمبرؐ کا سراپا نظم کیا بعد ازاں یہ احساس ہوا کہ زبان اُن کے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر رہی۔ اگلے بند میں اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔

بند ۴۹

یہ فرقِ ہمایوں یہ جبیں اور یہ ابرو یہ چشم، یہ رخسار ضیا بار یہ گیسو
یہ لب یہ دہن اور یہ قد و قامتِ دل جو یہ پھول سا تن جس میں محمدؐ کی ہے خوشبو
شان اُن کی وہ ہے جس پہ فدا عرشِ بریں ہے
جو عضو ہے اک سورۂ قرآنِ مبیں ہے

تشبیہات کی معنی آفرینی مسلم لیکن شبیہِ پیمبرؐ کا سراپا ہے، اس لیے شاعر کو کہنا پڑا۔

"جو عضو ہے اک سورۂ قرآنِ مبیں ہے"

اس کے بعد تو کسی قسم کے اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، نہ قرآنِ مبین کا جواب ہو سکتا ہے اور نہ حضرت علی اکبرؑ کے حسن کا۔

نفیسؔ نے ایک مرثیہ☆ میں حضرت امام حسینؑ کا سراپا ایک نئے انداز سے نظم کیا ہے۔

شانے ہیں کہ دو چاند ہیں بازو ہیں کہ تصویر وہ ہاتھ کہ جن کے لیے پیدا ہوئی شمشیر
گردن کی ہے خواہش کہ چلے خنجرِ بے پیر سینے کو تمنا ہے کہ چھاتی پہ لگیں تیر
اعضا بھی سراپا ہیں طلب گار خدا کے
سر سجدے کا مشتاق قدم راہ رضا کے

☆ مطلع ہے، ہاں اے قلمِ صدق رقم نور فشاں ہو، بند ۵۷ (تعداد بند ۱۶۳)

نفیسؔ نے خدا کے اس برگزیدہ بندے کا سراپا نظم کیا ہے جو راکبِ دوشِ رسولِ مقبولؐ تھا اور جس نے بچپن ہی میں محضرِ شہادت پر دستخط فرما کر دینِ اسلام کے بقا کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اسی لیے اس نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کی شہسوارِ راہِ خدا کا سراپا ایسا ہی ہونا چاہیے۔

رضائے الٰہی بہت سخت اور مشکل ہے وہ خنجر کی دھار پر ہے۔

جب امام عالی مقام سربہ سجود ہوں، اُس وقت سوکھے گلے پر شمر کا خنجر چلے۔

نمونے کے طور پر نفیسؔ مرثیوں سے چند بند نقل کیے گئے ہیں، ورنہ ان کے مرثیے تو گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں۔

۳۔ رخصت

میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے انصار و رفقا امامِ حسینؑ سے اذن وغا طلب کرتے، اعزہ امامِ عالی مقام سے اجازت لینے کے بعد خیمے میں بھی رخصت کے لیے جاتے۔

مرثیہ گو جذبات نگاری سے درد و اثر پیدا کرسکتا ہے، جذبات کو ابھارنے کے لیے وہ واقعات کے نئے نئے پہلو تلاش کرتا ہے۔

حضرت عباسؑ کی رخصت کا منظر کس قدر روح فرسا ہے، بچوں کے بین، حضرت سکینہ کا مشک لاکر اپنے چچا جان کو دینا اور پانی لانے کے لیے اصرار کرنا۔

آپ نے اپنی لاڈلی بھتیجی کو گود میں لیا، سوکھے ہوئے ہونٹ ہونٹ سے ملے، پیار کیا پھر حضرت زینبؑ کی آغوش میں دیا، یہ کہتے ہوئے کہ میری شہزادی نے دو روز سے پانی نہیں پیا، میں مشک بھرنے کے لیے نہر پر جا رہا ہوں، دعا مانگیے کہ میں اعدا پر ظفر پاؤں اور پانی لانے میں کامیاب ہوجاؤں۔

اس کے بعد حضرت عباسؑ امام عالی مقام کے قریب گئے اور دستِ ادب جوڑ کر کہا کہ مولا، یہ ارمان ہے کہ جلد سے جلد آپ پر فدا ہوجاؤں۔

رو☆[۱] کے شہ بولے کہ قابو میں نہیں ہے دلِ زار
ہائے کس منھ سے کہوں میں کہ ہوں گھوڑے پہ سوار
آؤ ان شانوں کے بوسے تو میں لے لوں اک بار
جسم بے جان چلی اب ہے سنبھلنا دشوار
خاک پر گرتے ہیں دم سینے میں گھبراتا ہے
جلد تھامو علی اکبرؑ ہمیں غش آتا ہے

حضرت عباسؑ بھی اشک بار ہوئے جھک کر سلام کیا، بعد ازاں:

"جلوہ فرما ہوا شبدیز پہ وہ نیک انجام"

جب نہرِ فرات پر حضرت عباسؑ کے بازو قلم ہوگئے تو صرف ہم شکلِ نبیؐ حضرت علی اکبرؑ باقی رہ گئے تھے۔ امام علیہ السلام کی خواہش تھی کہ جوان بیٹا میدانِ کارزار میں نہ جائے، حضرت علی اکبرؑ اس پر مصر کہ کسی نہ کسی طرح اذنِ وغا مل جائے۔ میری زندگی میں قبلۂ کونین پر آنچ آئے میں کیسے برداشت کرسکوں گا۔

شہ نے کہا خیر اب ہمیں رو کر نہ رلاؤ
اچھا یہی مرضی جو تمھاری ہے تو جاؤ

لیکن ماں بہنوں اور پھوپھیوں سے رخصت ہو آؤ، حضرت علی اکبرؑ خیمے میں تشریف لے گئے۔ حضرت زینبؑ نے دوڑ کر ان کی بلائیں لیں اور دریافت فرمایا کہ تم ہتھیار سجا کر کہاں جارہے ہو۔

حضرت علی اکبرؑ نے عرض کی کہ رن سے اعدا کے پرے خیمے کی طرف بڑھے آ رہے ہیں، میدانِ کارزار میں جا کر ان لشکریوں کو اپنے دادا کی شجاعت کے جوہر دکھاؤں، آپ بھی رخصت کیجیے، اس کے بعد جذباتی اپیل ہے:

"میں آپ کو پیارا ہوں کہ شبیرؑ ہیں پیارے"

دل ہل☆[۲] گیا بانو کا یہ بیٹے نے کہا جب   مظلومیِ شبیرؑ پہ رونے لگیں زینبؑ

☆۱۔ مطلع: طبع روشن ہے مری شمع شبستانِ سخن (بند ۳۳)
☆۲۔ مطلع: اس بے کا ہوں نوشندہ کہ مستی نہیں جس میں، بند ۳۱

ہاتھوں سے جگر تھام کے اکبر سے کہا تب صدقے گئی سمجھی میں جو ہے آپ کا مطلب

غازی ہو مددگار شہِ عرش نشیں ہو
اب مجھ پہ کھلا عازمِ فردوسِ بریں ہو
"اچھا مرے دل دار خدا حافظ و ناصر"

سادہ اور سلیس الفاظ میں روداد غم کا بیان ہے۔ جب حضرت علی اکبرؑ رخصت لے کر روانہ ہوئے، اس وقت خیمے میں کہرام بپا تھا، سیدانیاں نوحہ کناں تھیں، بھرے گھر سے جیسے جنازہ نکل رہا ہو۔

۴۔ آمد

میدانِ کارزار میں ورود۔ حضرت زینبؑ کے دونوں صاحب زادے (عون و محمد) ہتھیار زیبِ تن کیے ہوئے برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہوئے۔ اس کے بعد:

بند ۸۷

گھوڑوں☆ کو جو کی دونوں نے مہمیز برابر بجلی سے تڑپنے لگے شبدیز برابر
دو آ ہوئے چینی تھے جلو ریز برابر چالاک برابر تو سبک خیز برابر
ششدر تھا فلک دونوں کے سُم آٹھ قمر تھے
تاباں مہِ نور چار اِدھر چار اُدھر تھے

بند ۸۹

سرعت میں کہیں تیز غزالانِ خطا سے
اونچے گئی ہاتھ اوجِ سعادت میں ہمارے
اڑ جانے میں مڑ جانے میں بڑھ جانے میں جا سے
افزوں کہیں طاؤس سے بجلی سے ہوا سے
جنگل میں بھی تھے تو کبھی چرخِ بریں پہ
سایا بھی پہنچتا تھا تو گر گر کے زمیں پہ

☆ مطلع، اے طورِ تجلّی سخن جلوہ گری کر (تعداد بند ۱۵۱)

تشبیہات اور استعارات کے علاوہ نفیس نے نازک خیالی، تخیل کی بلند پروازی اور وسیع مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔

یہ مصرع "سایا بھی پہنچتا تھا تو گر گر کے زمیں پر" فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہے۔ سحرکاری بلکہ اعجاز شاعری ہے۔

علم دارِ لشکر کی آمد کا منظر

حضرت عباسؑ شبدیز پر جلوہ فرما ہوئے، لجامِ فرس دستِ مبارک میں لیتے ہی فرس گرم عناں ہو کر برقِ جہندہ بن گیا، جب رہوار بن بن کے پاؤں اٹھانے لگا تو پریوں کے ہوش اڑ گئے، صبا اپنی چال بھول گئی، بعد ازاں:

بند ۴۷

شیرِ خالق☆ کے نشاں نے علم اونچا جو کیا　　ہم بغل مہر سے جا کر ہوئی پنجے کی ضیا
سر پہ غازی نے جو دامانِ علم کھول دیا　　ابرِ رحمت نے علم دار کو سائے میں لیا
خوبیاں لہر پھریرے کی جو دکھلانے لگی
موجِ کوثر کی فدا ہونے پہ لہرانے لگی

حضرت عباسؑ نے علمِ لشکر بلند کیا۔ اللہ ری رفعت اس علم کی کہ اس کے پنجے کی ضیا مہر تک پہنچ گئی۔ اس علم کی کیا تعریف ہوسکتی ہے جس کے پھریرے پر موجِ کوثر فدا ہونے کی تمنا کرے۔

بند ۴۸

دوش پر تیغ بہادر نے رکھی مثلِ علی　　زخمِ جاں باز اڑا فتح و ظفر ساتھ چلی
سطوت و رعب و جلالت سے یہ گویا تھا جلی　　غزوۂ ذاتِ سلاسل پہ چلے حق کے ولی
غل تھا یہ ہیں وہ بشر جن کے ملک خادم ہیں
رخ سے روشن تھا کہ یہ ماہِ بنی ہاشم ہیں

☆ مطلعِ طبع روشن ہے مری شمعِ شبستانِ سخن

حضرت عباسؑ فخرِ بنی ہاشم تھے۔ اُن کے نور سے سارا جنگل روشن ہوگیا۔ ان کے عکسِ رخسار سے صحرا گلشن ہوگیا۔ بوئے گیسو سے دامنِ دشت عطر بیز ہوگیا۔ اُن کے چہرے کے مقابلے میں آفتاب و ماہتاب کی بھلا کیا حقیقت تھی۔

حضرت امام حسینؑ کی معرکۂ کارزار میں آمد

امامِ عالی مقام نے رہوار کی باگ لی تو اس کی سرعت سے موجِ نسیمِ سحر گرد ہوگئی، رخش تھا یا ہوا پر برق کی تصویر تھی، سیماب کی مانند نہ اس کو قرار تھا نہ سکون، فرس بھی دُلدل کی طرح معرکہ آرا تھا۔

حضور سرورِ کائنات کی عبائے مبارک امام حسینؑ کے جسمِ اقدس پر تھی۔ حضرت علیؑ کی ذوالفقار کمر میں اور حضرت حمزہ کی ڈھال دوشِ مبارک پر۔ اس طرح آپ میدان میں تشریف لے گئے۔

اللہ رے[☆1] اجلال و نہیب شہِ ذی شاہ | تنہا ہیں پہ تھراتا ہے سب لشکرِ بدخواہ
آنکھوں میں ہے یہ رعب کہ العظمۃ للہ | گرز و تبر و تیر و سناں بھی نہیں ہم راہ

فرزند ہیں اُس کے جو شجاعِ ازلی ہے
حمزہ کی فقط ڈھال ہے اور تیغِ علیؑ ہے

امامِ عالی مقام کا رعب و داب اللہ اکبر۔ افواجِ اعدا کے سپاہی لرزہ براندام ہوگئے۔ برچھیاں ہٹ ہٹ گئیں، صف صف سے مل گئی۔

رجز

شمالی ہند میں جب مرثیے کا تعمیری دور شروع ہوا اس وقت سے رجز مرثیے کا اہم جزو شمار کیا جانے لگا۔ شاعر کی جولانیِ فکر کے لیے یہ میدان نہایت وسیع ہے۔ جہاں اس کا اشہبِ قلم کبھی کبھی بے لگام بھی ہوجاتا ہے۔

انداز میں جدت پُرشکوہ الفاظ اور ڈرامائی انداز کی وجہ سے رجز دل نشیں و مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ نفیس ایک[☆2] مرثیے سے حضرت عباسؑ کے رجز کے چند بند نقل کیے

☆1۔ مطلع، ہاں اے قلم صدق رقم نور فشاں ہو (بند ۳۵)
☆2۔ مطلع، طبع روشن ہے مری شمعِ شبستانِ سخن

جاتے ہیں۔

بند ۵۹

لو بڑھا رن سے دل و جانِ شہنشاہ عرب لو کھلے صفدر و غازی کے رجز میں وہی لب
ایک نعرے میں زمیں کیا کہ فلک ہل گئے سب متک دکھلا کے صدا دی یہ بصد غیظ و غضب

جو نہیں لاکھوں سے رکتا وہ دلیر آتا ہے
دور ہو جاؤ ترائی سے کہ شیر آتا ہے

بیت کے تیور ملاحظہ ہوں۔ پانچویں مصرعے میں شجاعت کا تذکرہ ہے اور چھٹے مصرعے میں لشکریوں کو للکارا ہے۔ کیوں نہ ہو اسد اللہ کا لال جلال میں ہو بہو اسد اللہ ہے۔

شیر خدا کی شجاعت پر خیبر و خندق کے معرکے گواہی دے رہے ہیں، ہم بھی تو شیرِ خدا کے شیر ہیں۔ اس لیے:

بند ۶۸

زور اپنا ہے عیاں غرب سے تا سرحدِ مشرق
توڑ دیں سد سکندر کو ہم اس میں نہیں فرق
خوں میں ڈوبیں گے جو فولاد کے دریا میں ہیں غرق
سرد ہو جائے گی تلواروں کی خود آتشِ برق

زور لشکر کا ہو پانی وہ دلاور ہیں ہم
بحرِ آہن میں جو پیرے وہ شناور ہیں ہم

حضرت علی اکبرؑ کے رجز کے دو بند☆ ملاحظہ کیجیے۔

بند ۷۱

ہم وہ ہیں کہ مرحب سے دلاور کو پچھاڑیں ڈالیں جو کڑی آنکھ تو چہرے کو بگاڑیں
سرکیں نہ جگہ سے جو قدم کھیت میں گاڑیں سو قلعے جو خیبر سے ہوں بھاری تو اکھاڑیں

☆ مطلع، اس سے کا ہوں نوشدہ کہ مستی نہیں جس میں

پروا نہیں گر کوئی نہیں ساتھ ہمارے
طاقت میں کہیں بند نہیں ہاتھ ہمارے

خیبر و خندق ہمارے دادا حضرت علیؑ کی بہادری کے گن گاتے ہیں، ہم میں بھی زورِ اسد اللّٰہی ہے، افواج کی کثرت کی ہم کو کیا پروا۔ یہ یاد رہے کہ:

بند ۴۷

رن سے اسد اللہ کے پیارے نہیں ہٹتے   گردوں میں جو ثابت ہیں ستارے نہیں ہٹتے
کفار کو بے جان سے مارے نہیں ہٹتے   بڑھتے ہیں تو پھر پاؤں ہمارے نہیں ہٹتے
دے جن کو خدا اوج وہ جھکتے ہیں کسی سے
بہتے ہوئے دریا کہیں رکتے ہیں کسی سے

اسداللہ کے پیارے جب رزم گاہ میں پہنچتے ہیں تو اُن کے قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔ اعدا کی جان لیے بغیر اُن کو چین نہیں آتا۔ خداوند تعالیٰ جن افراد کو بلند مراتب سے نوازے، دنیا والے ان پر تسلط کیسے جما سکتے ہیں۔

سیّد الشہدا کے رجز☆ کے دو بند ملاحظہ کیجیے۔ افواج روم و شام سے وہ یوں مخاطب ہوئے۔

بند ۶۲

تم کیا ہو اگر ایک طرف دونوں جہاں ہوں   اس تیغ کی دہشت سے طلب گار اماں ہوں
ہٹ جائیں اشارے میں جو سو کوہ گراں ہوں   میں چاہوں تو آثار قیامت کے عیاں ہوں
صحرا ہو نہ دریا نہ مکاں ہو نہ مکیں ہو
بے چرخ پہ گردوں ابھی پیوندِ زمیں ہو

امامِ مبین، تو خشک و تر کا مالک ہوتا ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا تابعِ فرمان ہوتا ہے۔ اس کے ایک اشارے سے دنیا میں انقلاب رونما ہوسکتا ہے۔

امام عالی مقام نے حضرت علیؑ کے شان دار کارناموں کا تذکرہ فرمایا، بدر و

☆ مطلع: ہاں اے قلمِ صدق رقم نور فشاں ہو

احد، خیبر و خندق کی لڑائیوں کے علاوہ وہ اجنہ سے بھی معرکہ آرا ہوئے اور اُن کو شکست دی۔

بند ۶۳۔

ہم خیبر و خندق میں اکیلے ہی لڑے ہیں	پانی تو ہے کیا آگ میں ہم کود پڑے ہیں
دبتے ہیں وہ فولاد سے دل جن کے کڑے ہیں	تھراتے ہیں رستم سے بہادر جو بڑے ہیں
ہے خالقِ اکبر کا غضب حرب ہماری
جبریلؑ سے روکی نہ گئی ضرب ہماری

ضربِ ذوالفقار کی تاب جب فرشتے نہ لا سکے تو تم بھلا کس شمار قطار میں۔ آج وہی ذوالفقار نیام سے نکلی ہے۔

۶۔ جنگ

مجاہدین میدانِ کارزار میں نبرد آزما ہوتے ہیں۔

رزمیہ شاعری میں ہیرو کے رہوار اور اس کی تلوار کی تعریف کی جاتی ہے۔ مضامین کی جدت، خیالات کی ندرت اور طبع کی ذہانت سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

نفیسؔ نے ایک مرثیے☆ میں حضرت عباسؑ کے اسپ سبک رفتار کی یوں تعریف فرمائی۔

بند ۴۶

پاؤں بن بن کے وہ رہوار اٹھانے جو لگا	ہوش پریوں کے اڑے بھول گئی چال صبا
جست میں آ ہوئے تاتار سعادت میں ہما	خم گردوں مہ نو چاند سے روشن ماتھا
جلد نازک پہ چھڑی پھول کی بھی بھاری تھی
چہرۂ حور پہ آنچل تھا کہ اندھیاری تھی

تشبیہ کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ مشبہ کی رفعت کا اظہار تشبیہ سے ہوجائے اور

☆ مطلع: طبع روشن ہے مری شمع شبستانِ سخن

جس غرض سے مشبہ کا تذکرہ مقصود ہو، اس بیان میں تشبیہ سے مزید اثر پیدا ہو جائے۔ مندرجہ بالا بند میں نفیس نے نادر تشبیہات استعمال کی ہیں، اسی مرثیے سے حضرت عباسؑ کی تلوار کی تعریف میں ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

بند ۵۷

وہ چمک اس کی وہ عباسؑ دلاور کا جلال　　تھا نمایاں کہ اٹھا دستِ علیؑ بہرِ جدال
ضو خمِ تیغ کی ظاہر جو ہوئی شکلِ ہلال　　انگلیاں اٹھ گئیں حیراں ہوئے سب اہلِ ضلال
غل تھا حیرت کا سماں چرخ نے دکھلایا ہے
چاند انتیس کا دسویں کو نظر آیا ہے

شاعر نے تلوار کو ہلال سے تشبیہ دی ہے، اس کے ذہنِ رسا کا اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ایسی چیز سے تشبیہ دے رہا ہے کہ جتنی باتیں مشبہ بہ میں پائی جائیں، اسی قدر یا اس سے ملتی جلتی باتیں مشبہ میں مل جائیں۔ انتیس کا چاند بمشکل نظر آتا ہے، کوشش کے بعد جب وہ دکھائی دیتا ہے تو اس کی طرف بے ساختہ انگلیاں اٹھ جاتی ہیں۔ ہلال میں کجی بھی ہوتی ہے اور چمک بھی، یہی کیفیت تلوار کی ہے۔

نفیس مرحوم کے ایک مرثیے[☆1] سے امام عالی مقام کے رہوار کی تعریف میں ایک بند ملاحظہ ہو۔ وہ رہوار سبک رَو تھا کہ تختِ سلیماں، اس کی وہ جست، وہ سرعت اور طرارے، اس کے قدم میں بہتے ہوئے دریا کی روانی تھی۔

سیماب کی صورت نہ قرار اس کو نہ آرام
چالاک و گراں قدر و سبک سیر و گل اندام
یہ فاصلۂ شش جہت اس کے لیے دو گام
مشرق میں کبھی صبح تو مغرب میں کبھی شام
جو عرش کا مالک ہے وہ سردار ہے اس کا
خورشید بھی اک حاشیہ بردار ہے اس کا

☆ مطلع، ہاں اے قلمِ صدق رقم نور فشاں ہو، بند ۳۶

دوسرے مصرعے میں شاعر نے صنعتِ تنسیق الصفات استعمال کی ہے۔ اس رہوار کی سرعت کی بھلا کیا تعریف ہوسکتی ہے جو شش جہات کا فاصلہ چشم زدن میں طے کرسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا راکب امامِ مبین ہے جو عرشِ معلّی کا مالک بھی ہے۔ رخش کی سج دھج دیکھ کر "غل تھا کہ ہوا آج دلہن بن کے چلی ہے۔"

امام حسینؑ کی تلوار کی تعریف میں بھی چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

بند ۵۰

تیغ ایسی☆ جہاں خم ہے خجالت سے مہِ نو   سیفی کا اثر رکھتا ہے جس مہر کا پرتو
دو اس کی زبانیں ہیں مگر خوبیاں سو سو   مقراضِ اجل، شعلہ و سرکش ہمہ تن ضو
ہر صف پہ صفیں گرتی ہیں رن پڑتا ہے رن پر
چلتی ہے نئی قطع سے یہ جامۂ تن پر

بند ۵۱

تیزی بھی لگاوٹ بھی سخاوت بھی ستم بھی   غصہ بھی جلالت بھی غضب بھی چم و خم بھی
بے باکی بھی چالاکی بھی طراری بھی دم بھی   پانی بھی جلانے کے لیے آگ بھی سم بھی
سر ایک کا ثابت صفِ دشمن میں نہ چھوڑے
لاکھوں ہوں تو یہ جان کسی تن میں نہ چھوڑے

نفیسؔ نے تیغ کو مہِ نو سے تشبیہ دی ہے، یہ حضرت علیؑ کی ذوالفقار ہے۔ اس لیے اس کی دو زبانیں ہیں "مگر خوبیاں سو سو" کیا تعریف ہوسکتی ہے، اس ٹکڑے کی۔

خط کشیدہ الفاظ صنعت تنسیق الصفات کی عمدہ مثالیں ہیں۔ معرکۂ کارزار میں جس وقت ذوالفقار کھنچ گئی، دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے۔ جامۂ تن پر یہ نئی قطع سے چلتی ہے۔

اس کی کون کون سی خوبیاں بیان کی جائیں، یہ جاں سوز بھی ہے اور جہاں سوز بھی، جگر سوز بھی ہے اور عدو سوز بھی۔ اس لیے اہلِ جفا کی صفیں آپ تیغ سے جلادیں،

☆ حوالہ بالا

خدا کی قدرت نہیں تو اور کیا ہے کہ لوہے میں آگ کا اثر ہے۔

ذوالفقار نے افواجِ اعدا میں ہلچل مچا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاں بازوں نے ہمت ہار دی اور جی چھوڑ دیے، ایک تیغ نے دو لاکھ دشمنوں کے منھ موڑ دیے، اجل خود فوج وغا ساز کا جائزہ لے رہی تھی۔ قضا برطرفی کے پروانے بانٹ رہی تھی۔

آتش بھی ہے پانی بھی، کرامات ہے یہ تو
ہاں گھاٹ پہ دھارا ہے، نئی بات ہے یہ تو

تیغ سیلِ فنا ہے۔ اس کی باڑھ وہ آفت ہے جسے بلا کہتے ہیں، اس کا منھ قضا کا منھ ہے جس کے سر پر یہ آتی ہے، اس کی جان لیے بغیر نہیں جاتی، یہ دشمن کش بھی ہے اور قتال بھی، بے درد بھی ہے اور دل آزار بھی، سفاک بھی ہے اور جہانگیر بھی۔ اس کی چال پر نہ جانے کتنے ہی گلے کٹ گئے ہوں گے۔

معرکۂ کارزار کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں تاکہ رزم کے مفہوم کی مزید وضاحت ہو سکے۔ حضرت عباسؑ کی نگاہیں دشمنوں کے لیے تیغ خشم ہیں، میدانِ کارزار میں ان کے وارد ہوتے ہی:

نقارے☆ سرنگوں تھے سرِ خاک ہر طرف   غوغائے زیر و بم تھا نہ آوازِ کوس و دف
سب تھے دُہل دُہل کے دہل چپ میانِ صف   تھا ناوکِ شکستہ کا ایک ایک دف ہدف
پھیلی تھی نارِ قہر جو مقتل کی راہ میں
قرنا بھی پھنک کے رہ گئی تھی رزم گاہ میں

اعدائے دیں کے اضطرار اور انتشار کی کیفیت پر اسلحۂ جنگ گواہ ہیں، لشکریوں کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

حضرت عباسؑ مشکیزہ اور علم لیے ہوئے نہرِ فرات کی جانب روانہ ہوئے، جہاں حشر کا سماں نظر آ رہا تھا، گھاٹ پر برقِ شرر کے کوندتے ہی سرِ کفار اڑنے لگے اور فرات کے کنارے خون برسنے لگا۔

"تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" لشکریوں کو خیبر و خندق کے معرکے یاد

☆ مطلع، پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمراں ہے آج، بند ۱۰۹

آ گئے۔ حضرت عباس نے بڑے بڑے بہادروں کو تہِ تیغ کر دیا اور تا حدِ نظر لاشے ہی لاشے نظر آنے لگے۔

پل[1] بندھ گئے ہیں لاشوں کے ہر سو کنار جو / کانٹے پڑے ہیں تیر سے۔ پہلو کنار جو
مضطر ہیں مثلِ موج، جفا جو کنار جو / جانوں سے ہاتھ دھوئے ہیں بدخو کنار جو
پیچھے ہٹا ہے ڈر کے جو لشکر لڑائی میں
آدھی ہے فوج نہر میں آدھی ترائی میں

جزئیات کے بیان سے نفیسؔ کو مرقع کشی میں بڑی کامیابی ہوئی۔ سامعین/ قارئین کی آنکھوں کے سامنے فرات کی جنگ کا منظر پھر جاتا ہے۔ یہ ہے شاعری کا اعجاز، نفیس کے مرثیوں میں ایسے مناظر کی کمی نہیں۔

۷۔ شہادت

عام طور سے مرثیہ امام حسینؑ کے کسی انصار یا عزیز کی شہادت پر ختم ہوتا ہے اور آخر میں امام علیہ السلام کی شہادت واقع ہوتی ہے لیکن یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ اس پر صحیح معنی میں المیہ کا اطلاق نہیں ہوتا، کیوں کہ ہر مرثیہ گو کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ واقعاتِ شہادت بیان کر کے مومن کی روح کی جلا کرے، اُس میں جوش و ولولہ پیدا کرے اور اسے اخلاقی درس بھی دے تاکہ اس کے دل میں ایثار و قربانی کا جذبہ کروٹیں لینے لگے۔ نفیسؔ کے مرثیوں سے اس ضمن میں چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔

حضرت عباسؑ مشکیزہ لے کر فرات پر پہنچ گئے، اسے بھر لینے کے بعد انھوں نے خیمے کا ارادہ کیا، اتنے میں فوجِ اعدا سمٹ آئی اور ان کو گھیر لیا۔

بند ۱۳۶

ایک راوی[2] نے یہ لکھا ہے بصد درد و بکا / آڑ میں نخل کی تھا، ایک شقیِ دوسرا
اس کا تیغا جو پڑا دستِ یمیں قلم ہوا / مشک پر نالے کے شانے سے لہو بہنے لگا

☆۱۔ حوالۂ بالا، بند ۱۱۵
☆۲۔ مطلع: طبع روشن ہے مری شمع شبستانِ سخن

آہ بھی منھ سے نہ کی ظلم کی ایذا سہ کر
جنت گئے مشک پہ یاحافظ و ناصر کہہ کر

بند ۹

ناگہاں سر پہ لگا گرزِ گراں ہائے غضب　　شق ہوا فرقِ علم دارِ جواں ہائے غضب
گر پڑا گھوڑے سے وہ سروِ رواں ہائے غضب　　پھٹ گئے زخمِ تنِ شیرِ ژیاں ہائے غضب
خاک سے دستِ بریدہ تھے اُٹھے پہلو میں
مشک تھی چھاتی پہ اور ہاتھ کٹے پہلو میں

شہادت کی کیفیات کی پُردرد الفاظ میں لاجواب مرقع کشی ہے۔

نفیس نے بین کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا۔ بین، لکھے بھی خوب اور پڑھے بھی خوب۔

امامِ حسینؑ کی شہادت کے بعد جو کیفیت ہوئی، اس کا اندازہ کسی قدر حسبِ ذیل☆۱ بند سے کیا جاسکتا ہے۔

قاتل نے گلے پہ جو رکھا خنجرِ خوں خوار　　تھرائی زمیں یوں کہ ہلا گنبدِ دوار
چلائے فرشتے کہ ہوا حشر نمودار　　اے اہلِ زمیں بند کرو دیدۂ خوں بار
الٹے نہ زمانہ غضبِ ربِ صمد سے
لو فاطمہؑ سر کھول کے نکلی ہیں لحد سے

حیف صد حیف امام علیہ السلام کا سرِ اقدس نوکِ نیزہ پر۔ جبال متزلزل ہوئے۔ سیاہ آندھیاں چلیں۔ آسمان سے خون برسنے لگا۔ اس خون آشام منظر کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ کہیں دفترِ عالم الٹ نہ جائے۔ اس مرثیے☆۲ سے آخری شہید کی بابت اور دو بند نقل کیے جاتے ہیں۔

جب امامِ حسینؑ نے بہت سے اہلِ ستم کو واصلِ جہنم کیا تو لشکرِ اعدا کے قدم اکھڑ گئے۔ لشکری چلانے لگے، یہ لڑائی نہیں بلکہ قہرِ الٰہی ہے، دہائی ہے دہائی۔

☆۱۔ مطلع، ہاں اے قلمِ صدق رقم نور فشاں ہو، بند ۱۱۸
☆۲۔ مطلع، ہاں اے قلمِ صدق رقم نور فشاں ہو

بند ۱۰۳

جس وقت دہائی کی سنی آپ نے آواز　　قربان رحیمی کے تھے شاہِ سر افراز
فرمایا کہ اے فرقۂ مکار و دغا باز　　ہم صبر میں بھی سارے زمانے سے ہیں ممتاز
اک سینے پہ دو لاکھ اگر تیر پڑیں گے
تم جنگ سے عاجز☆۱ ہو تو اب ہم نہ لڑیں گے

یہ کہہ کر آپ نے ذوالفقار نیام میں رکھ لی اور سپر زینِ فرس سے لٹکا دی۔
شمر موقعے کی تلاش میں تھا، اس نے لشکریوں کو آواز دی، آؤ شہِ مرداں کے پسر کو گھیر لو۔ یہ سن کر بھاگے ہوئے سوار پلٹ آئے، اس ابرِ کرم پر تیروں کا مینہ برسنے لگا، اس کے بعد:

بند ۱۱۷

ظالم جو بڑھے تیغ بکف فوج کی صف سے　　رونے کی صدا آنے لگی ارضِ نجف سے
آرام چھٹا روحِ رسولانِ سلف سے　　مجروح کو پھر گھیر لیا چار طرف سے
جلّادوں میں آغوشِ محمدؐ کا پلا تھا
خنجر تو کئی تیز تھے اور ایک گلا تھا

شمر کا خنجر اور امامِ مظلوم کا خشک گلا، اسی لیے "خنجرِ قاتل بھی پیاسا رہ گیا۔"

۸ بین

نفیس کے مختلف مرثیوں سے چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔
حضرت عون و محمد کی شہادت سے خیامِ اہلِ بیت میں کہرام مچ گیا۔ جب خیمے میں یہ خبر پہنچی کہ ان کے لاشے امامِ مظلوم خیمے میں لا رہے ہیں۔ اس وقت:

بند ۱۴۶

رانڈیں☆۲ صفِ ماتم پہ سب آئیں جو کھلے سر　　گھبرا کے یہ کہنے لگی شبیرؑ کی خواہر

☆۱۔ ایک نسخے میں 'تو' درج ہے
☆۲۔ مطلع: ہے طور تجلائے سخن جلوہ گری کر

کیوں پیٹتی ہو چھاتیاں ٹھہرو ابھی دم بھر   پروا نہیں کچھ مجھ کو لٹا گھر تو لٹا گھر
ہے ہے نہ کرو صاحبو، گھبرائیں گے شبیرؑ
آتے بھی ہیں تو شرم سے پھر جائیں گے شبیرؑ

دونوں کے لاشوں کو دیکھ کر اہلِ حرم پر کیا گزری، یہ نفیس کی زبان سے سنیے:

بند ۱۴۸

یہ ذکر تھا جو لاشوں کو لائے شہِ ابرار   جس صف پہ بہن تھی وہیں آئے شہِ ابرار
خود شرم سے تھے سر کو جھکائے شہِ ابرار   پُرخوں تھا گریبانِ قبائے شہِ ابرار
اک حشر تھا سر اہلِ حرم کھولے ہوئے تھے
لاشوں پہ علم دار علم کھولے ہوئے تھے

مندرجہ بالا بند میں جزئیات نگاری اور جذبات نگاری کے عمدہ نمونے ہیں جن کو پڑھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آ جاتا ہے۔

ساقی نامہ

ساقی نامہ مثنوی کے لوازمات میں سے ہے۔ مثنوی کے عنوانات میں ساقی نامے کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں من جملہ ان کے ایک موضوع خمریات بھی ہے جس کا ذیلی عنوان ساقی نامہ ہے۔

خمریات میں شاعر ساقی خم و سبو، ساغر و مینا و جام، درد تہِ جام وغیرہ کا تذکرہ کرتا ہے۔ پیر مغاں اور محتسب مے کدہ کی کیفیات بیان کرتا ہے۔

عربی زبان میں ابونواس کی خمریات کافی مشہور ہیں۔ اس کا اثر دوسرے فارسی شعرا نے بھی قبول کیا۔

عمر خیام کی رباعیات بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ ''تصوف اسلامی کے ہمہ گیر رواج نے فارسی شاعری میں خمریات کو حقیقت اور مجاز کا ایک آمیزہ بنا دیا۔ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) تک کی خمریات کی اصطلاحات حقیقی معانی

لیے ہوئے ہیں، اس کے بعد بیش تر یہ اشاراتی اور رمزیہ زبان بن جاتی ہیں اور اس طرح ساقی نامہ کا وجود آتا ہے۔"☆۱

مرثیے میں ساقی نامے کی داغ بیل انیسؔ مرحوم نے ڈالی ہے۔ میر نفیسؔ نے مرثیے کے اس گوشے کو بہت وسعت دی۔ ساقی کے مفہوم میں بھی تبدیلی ہوئی، شاعر کا خطاب ساقیِ کوثر سے ہوتا تھا اور وقتِ مدد ان کو پکارا جاتا۔

نفیسؔ نے ساقی نامے کے دو یا تین بند لکھے ہیں اور وہ بھی جب افواجِ اعدا کے کسی رویں تن کا مقابلہ حسینی سپاہ کے کسی ہیرو سے انفرادی طور پر ہوا۔

نفیس کے مرثیوں سے نمونے کے طور پر چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت عباسؑ میدانِ جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا رہے ہیں، مقتل کی راہ میں نارِ قہر پھیلی ہوئی تھی، شاعر اپنے ساقی سے مئے زلال طلب کرتا ہے۔

ہاں ساقیا☆۲ زلالِ مئے ناب چاہیے — موتی سے جو کہ صاف ہو وہ آب چاہیے
داروئے صحتِ دلِ بے تاب چاہیے — برسائے خوں وہ تیغ ظفریاب چاہیے
ہو فتح بازوئے شہِ والا صفات کی
باقی ابھی لڑائی ہے نہرِ فرات کی

نفیسؔ مرحوم کے ایک دوسرے مرثیے☆۳ سے ساقی نامہ کا ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

اے ساقیِ سخن مئے گلگوں پلا مجھے — کوثر سے بھر دے جامِ شراب ولا مجھے
مطلوب دل کے آئینے کی ہے جلا مجھے — معشوقِ آفتاب لقا سے ملا مجھے
مدح و ثنا کروں جو امامِ جلیل کی
مصرع ہر ایک موج بنے سلسبیل کی

اس عہد سے ساقی نامہ بھی مرثیے کے قوام میں شامل ہوگیا۔

☆۱۔ ریاض، ڈاکٹر محمد، اقبال کے ساقی نامے، "ماہِ نو" کراچی، اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۳۶
☆۲۔ مطلع، پھر بادشاہِ ملکِ سخن حکمراں ہے آج، بند ۱۱۱
☆۳۔ مطلع، تسبیح فاطمہؑ کے جو دانے بکھر گئے، بند ۳۹ (تعداد بند ۹۶)

مرثیے کے موضوع میں تنوع ہوتا ہے، اس لیے کامیاب مرثیہ گو ایسے الفاظ منتخب کرتا ہے جو ہر مضمون کے اظہار کے لیے ہم آہنگ ہوسکیں۔

نفیسؔ کو زبان پر قدرت تھی، منظرنگاری سراپا اور رزمیہ شاعری میں اُنھوں نے پُرشکوہ الفاظ استعمال کیے، رخصت جذبات نگاری، شہادت اور بین کے موقعوں پر اُنھوں نے سادہ اور سلیس الفاظ کا نہایت فن کاری سے استعمال کیا۔ اسی لیے ان کے مرثیوں میں زبان کی شیرینی اور حلاوت ہے، سادگی اور سلاست ہے، لطفِ زبان بھی ہے اور خوبیِ بیان بھی۔ اُنھوں نے بھی انیسؔ مرحوم کی طرح اردو زبان کو الفاظ کا بے بہا ذخیرہ عطا کیا۔

نفیسؔ ایک عظیم مرثیہ گو شاعر اور فن کار تھے۔ اردو داں طبقہ اُن پر جس قدر فخر کرے وہ کم ہے۔

۱۶۔ وقارؔ کے مراثی پر ایک نظر

سید فضلِ علی وقارؔ کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے، اس لیے خورشید خاوری کا دیباچہ☆ من و عن نقل کیا جاتا ہے تاکہ اُن کی زندگی کے حالات اور واقعات پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

”اما بعد! چوں کہ ذخیرہ مراثی من تصنیف عالی جناب سحبانِ زماں، فرزدقِ دوراں، افصح الفصحا، افسر الشعرا، مداحِ آلِ نبیؐ، سید فضلِ علی صاحب مرحوم المتخلص بہ وقارؔ رئیسِ اعظم زید پور، ضلع بارہ بنکی، تلمیذِ خدائے سخن حضرت انیسؔ مغفور اعلی اللہ مقامہ خاندانِ جناب مرحوم میں محفوظ چلا آتا تھا گو کہ امتدادِ زمانہ سے اکثر تصانیف مثل سلاموں اور رباعیوں کے تلف ہوگئیں جن کے لیے دستِ تاسف ملنا پڑتا ہے۔ اسی خیال سے کئی بار کوششِ بلیغ کی گئی کہ یہ خزینہ لآلی مخزونہ حلیہ طبع سے مزین ہوکر خدمتِ حضراتِ مومنین و شائقین باتمکین میں پیش کیا جاوے تاکہ ذریعۂ ایصالِ ثواب

☆ وقارؔ، سید فضلِ علی، خورشید خاوری (ریاضِ وقار)، بار اوّل، نظامی پریس، لکھنؤ، (دیباچہ طالبؔ زید پوری) ۱۹۳۷ء، ص ۱ تا ص ۴

روحِ مصنف مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ ہو مگر کچھ ایسے اسباب رونما ہوتے رہے کہ یہ آرزو بارآور نہ ہو سکی۔ ہزار ہزار شکر ہے کہ میری سعی رائیگاں نہ گئی۔ جناب اخی المعظم قبلہ مسٹر سید عابد حسن صاحب بیرسٹر ایٹ لا مدظلہ و برادر عزیز سید محمد عباد صاحب سلمہٗ رؤسائے زیدپور جن کے پاس یہ جواہر آب دار محفوظ تھے اور جو ورثائے مصنفِ مرحوم ہیں، خود مصارفِ طبع آمادہ ہو گئے۔ لہٰذا جلدِ اوّل جو دس مرثیوں پر مشتمل ہے، میں نے اور نورِ نظر سعید زمن سید شبیر حسن صاحب وفاؔ بی اے ابن جناب معظم مسٹر عابد حسن صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے مرتب کی اور نام برعایتِ سنہ عیسوی ''خورشیدِ خاوری'' (۱۹۳۷ء) و برعایت سنہ ہجری ''جلد ریاض وقار'' (۱۳۵۵ھ) قرار دیا۔ اگر کسی جگہ کوئی غلطی یا لغزش پائی جاوے تو مومنین ہماری کم عملی پر محمول فرما کر نظرانداز فرمائیں۔ مصنفِ مرحوم نے اپنی تمام عمر اسی شغلِ مداحی میں صرف فرما دی۔ اس کے علاوہ فنِ تجوید اور اکثر علومِ عربیہ میں بھی کافی دست گاہ حاصل کی تھی۔ ۱۸۹۲ء میں اس عاریتِ سرائے فانی سے طرفِ ملکِ جاودانی انتقال فرمایا اور صرف یہ کلام اپنی یادگار چھوڑا۔ لاش مرحوم کی کربلائے معلی جناب خان بہادر سید شرف علی صاحب ریٹائرڈ سب جج مرحوم نے جو حقیقی برادر زادہ مرحوم تھے، روانہ فرمائی۔ اب جوارِ سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا میں آرام فرما ہیں۔

جناب مرحوم کی مجلسِ چہلم جانشینِ انیسؔ یعنی جناب میر خورشید علی صاحب نفیسؔ مرحوم نے خود پڑھی اور چار رباعیاں تصنیف کر کے پڑھی تھیں جن سے ظاہر ہوگا کہ کس پایہ کے بزرگ تھے جو درج ذیل ہیں:

(۱)

کب راہ رُوِ ملکِ عدم ملتے ہیں ملتے ہیں نہ وہ ہم سے، نہ ہم ملتے ہیں
سیّد فضلِ علی کا جاں کاہ ہے غم ایسے بھی دوست جہاں میں کم ملتے ہیں

(۲)

گردش ہے عجیب یہ زمانے کے لیے سب آئے ہیں اس دہر سے جانے کے لیے

احباب تو ہنستے گئے دنیا سے نفیسؔ ہم رہ گئے اشکِ خوں بہانے کے لیے

(۳)

دردا کہ عجب یار موافق چھوٹا صد حیف بڑا محبِ صادق چھوٹا
کیا حالتِ دل زباں پہ لاؤں میں نفیسؔ کافی ہے کہ مجھ سے مرا عاشق چھوٹا

(۴)

ہم جن کے لیے آئے وہ ہیہات کہاں سب اہلِ سخن ہیں یاں پہ وہ بات کہاں
مانا کہ کبھی خواب میں دیکھیں گے نفیسؔ وہ سلسلۂ حرف و حکایات کہاں

مصنف مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہ کے سلاموں اور رباعیوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، مگر نہایت افسوس ہے کہ وہ امتدادِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا، تلف ہوگیا، چند شعر دو سلاموں کے جو زباں زدہ گئے تھے، نقل کرتا ہوں اور ایک سلام پورا اور پانچ شعر دوسرے سلام کے دستیاب ہوسکے جو جلد میں طبع ہوگئے ہیں۔ اگر شائقین نے قدردانی فرمائی تو قسط وار بقیہ کلام پیش کش کرتے رہیں گے، ابھی کافی ذخیرہ موجود ہے۔

خواہشِ اکسیر و حرصِ کیمیا رکھتے نہیں
پاس کچھ جز صبر، خاکِ شفا رکھتے نہیں
زر نہ دیتا ہو نہ دے منعم دلوں کو تو نہ توڑ
ان کی سنتا ہے خدا گو یہ صدا رکھتے نہیں

ایضاً دیگر

قید زنداں میں رہے موسیٰ ابن جعفرؑ اس قدر
گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
حالِ دل بھائی سے کہنے بھی نہ پائی تھی بہن
جنگ کو سرور چلے تقریر آدھی رہ گئی

"راقم جس زمانے میں میر نفیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہ کی خدمت میں مرثیہ پڑھنے کو جاتا تھا۔ تو وہاں اکثر سید فضل علی وقار موصوف سے نیاز حاصل ہوتا تھا۔ آپ میرے حال پر بہت شفیق تھے۔۔۔آپ کی شادی مساۃ شمس النساء دختر سید جعفر حسین سے ہوئی تھی۔

کوئی اولاد نہیں بلا اعقاب انتقال کیا۔۔۔ آپ نے اپنی حیات میں زیارت عتبات کا شرف حاصل کیا تھا اور انتقال کے بعد آپ کی لاش کربلائے معلی بھیج دی گئی۔"[1]

سید یونس حسین یونس زید پوری شاگرد مرزا اوج نے قطعۂ تاریخ لکھا:

جناب فضل علی باوقار و عارف تھے — بجا ہے ایسے ہی بندوں کو باخدا کہنا
گل کلام میں خوشبو و رنگ انیس کا ہے — صحیح ہے نہیں ہرگز غلط مرا کہنا
خدا کا فضل ہے مرحوم کا یہ حصہ ہے — ہر اک کا کام نہیں یوں زبان کا کہنا
کلام چھپ گیا ہے دیکھیں صاحبانِ نظر — پڑھے ہوئے کو ہے لازم پڑھا ہوا کہنا
زروئے حسن یہ تاریخ لکھی یونس نے — وقار کے یہ مراثی ہیں ان کا کیا کہنا[2]

وقار کے مرثیوں کے وہ فہرست نقل کی جارہی ہے جو "خورشیدِ خاوری" میں درج ہے۔

نمبر شمار	مطلع	موضوع	تعداد بند
۱۔	للہ الحمد کہ پھر طبعِ رسا اوج پہ ہے	حضرت رسولِ مقبولؐ	۲۰۷
۲۔	حسنِ سخن ثنائے جنابِ امیر ہے	حضرت علیؑ	۱۷۸
۳۔	حسنِ رخِ کلام ثنائے بتولؑ ہے	جنابِ فاطمہؑ	۱۰۷
۴۔	کس مدح سے سرسبزی گل زارِ سخن ہے	حضرت امام حسنؑ	۱۱۶
۵۔	کعبے کی طرف قبلۂ ایماں کا سفر ہے	سفر حضرت امام حسینؑ	۸۳
۶۔	پرچم کشا فلک پہ جو مہرِ مبیں ہوا	حضرت عون و محمد	۲۳۲
۷۔	الٹا جو حورِ صبح نے رخ سے نقاب کو	حضرت قاسمؑ	۱۵۸
۸۔	آمد ہے رن میں ضیغمِ شیرِ الٰہ کی	حضرت عباسؑ	۱۳۲
۹۔	جب چھٹ گئے عباسؑ دلاور شہِ دیں سے	حضرت علی اکبرؑ	۱۷۰
۱۰۔	اے زباں بحرِ طبیعت کی روانی دکھلا	حضرت امام حسینؑ	۱۶۲

وقار کے چند مرثیوں سے کچھ بند پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان کی مرثیہ نگاری

☆۱۔ فروغ سیتاپوری، شجراتِ طیبات، ص ۳۹۳۔۳۹۵
☆۲۔ وقار، خورشید خاوری، ص ۱۷۶

کی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے۔

چہرہ

چہرے کے موضوع میں تنوع ہوتا ہے جس میں واقعہ نگاری بھی ہوتی ہے۔

شاعر واقعات اور حالات کا جائزہ لیتا ہے اور قلبی کیفیات کو نظم کے خوب صورت سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔

امام حسینؑ کی روانگی کے وقت جو اہلِ مدینہ کی حالت ہوئی۔ اس کی مرقع کشی☆[1] ملاحظہ فرمایئے۔

واقعہ نگاری

شبیر چلے کیا ہوا ویرانِ مدینہ
بے نوحؑ تباہی سے بچے گا نہ سفینہ
بیکار وہ خاتم ہے نہ ہو جس پہ نگینہ
جب دل ہی جدا ہوگیا بے نور ہے سینہ
رونق تھی مدینے کی اسی شاہ کے دم سے
فریاد کہ ہم چھٹتے ہیں آقا کے قدم سے

مندرجہ بالا بند میں صنائع بھی ہے، تشبیہ کی معنی آفرینی بھی، تلمیح کی رعنائی بھی اور جذبات کی ترجمانی بھی۔

جو لوگ امامِ عالی مقام کو رخصت کرنے آئے تھے، وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ وفورِ جذبات کی وجہ سے اور امام علیہ السلام کے وقار کے پیشِ نظر ان کی قلبی کیفیات کی عکاسی قابلِ تحسین ہے۔

سب صورتِ تصویر ہیں خاموش ادب سے
پر چین کسی دل کو نہیں رنج و تعب سے☆[2]

☆۱۔ وقار، خورشید خاوری، مطلع، کعبہ کی طرف قبلۂ ایماں کا سفر ہے، بند ۳، ص ۶۹

☆۲۔ حوالہ بالا (بیت) بند ۱۰، ص ۷۰

"صورتِ تصویر" کی ترکیب نہایت پُرکشش اور برمحل ہے۔

مصوری بھی واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔ شاعر مصوری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ وہ الفاظ کے حسین امتزاج سے ایسی مکمل تصویر پیش کرتا ہے جو اصل پر سبقت لے جاتی ہے۔ اس طرح شاعر مصور سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

مصوری

قاسم[☆1] کے قریں جمع ہیں سب شہر کے اطفال
رخ زرد ہیں اور آنکھیں بکا کرنے سے ہیں لال
دوڑے ہوئے آئے ہیں گھروں سے تو ہے یہ حال
منھ خشک ہیں الجھے ہوئے ہیں گیسوؤں کے بال
سر تا بہ قدم خاک میں تن اُن کے اَٹے ہیں
کرتوں کے قباؤں کے گریبان پھٹے ہیں

مندرجہ بالا بند میں وقار نے محاکات سے بھرپور کام لیا ہے، موزوں الفاظ کی مدد سے منظر کی کامیاب مرقع کشی کی ہے، چہرے میں منظرنگاری کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

منظرنگاری

کامیاب منظرنگاری کے لیے ضروری ہے کہ مرثیہ نگار کا مشاہدہ وسیع ہو، تخیل کی رنگ آمیزی کے علاوہ اس میں قادر الکلامی کے جوہر بھی پائے جاتے ہوں اور داخلی کیفیات کے اظہار کی وہ بطریقِ احسن صلاحیت رکھتا ہو۔

صبح کا منظر

صبح ہوتے ہی نجم سپہر چشم سے روپوش ہوگئے۔ شب کے چراغ خاموش ہوگئے۔ شش جہت سے قدرتِ خدا عیاں تھی۔ دشتِ نینوا میں بھینی بھینی پھولوں کی خوشبو

☆1 وقار، حوالۂ بالا، بند ۱۲، ص ۷۰

تھی، مرغانِ خوش نوا نغمہ سنج تھے۔

وہ وقتِ صبح ☆[1] اور وہ ظہور آفتاب کا — جھونکے نسیم کے وہ مہکنا گلاب کا
وہ سبزہ زار لطف وہ نہروں کے آب کا — وہ ہر شجر پہ دشت کے جوبن شباب کا
تھا رشکِ خلد کو چمنِ لالہ زار سے
طاؤسِ چرخ وجد میں تھا اس بہار سے

وقار نے صبح کا دل کش منظر پیش کیا ہے۔ آفتاب طلوع ہو چکا ہے، نسیم کے جھونکے پھولوں کی خوش بو، فضا میں بکھیر رہے ہیں، عروسانِ چمن کی زیب و زینت کا کیا کہنا، ہر پھول حسن و رنگ میں بے مثل و لاجواب تھا، اس سبزہ زار اور لالہ زار کو دیکھ کر طاؤسِ چرخ بھی وجد میں آگیا اللہ ری سحر انگیزی اس منظر کی دوسرے منظر کی ایک جھلک۔

وہ ☆[2] فریب سبزۂ نوخیز کی لہک — گویا بچھا تھا فرش زمرد کا دور تک
ہوتی تھی دیکھنے سے خنک جس کے مردمک — مینو سواد ہونے میں اس کے نہیں تھا شک
فائق ملاحت اُس کی تھی مخمل کے خواب پر
سبزہ نہ تھا بہار تھی جوشِ شباب پر

ہر گل میں نئی بہار و انواع و اقسام کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسی لیے بلبل عشق کا دم بھر رہی تھی ہر خطہ چمن گل دستہ بنا ہوا تھا، چھٹا مصرع بار بار پڑھیے۔
"سبزہ نہ تھا بہار تھی جوشِ شباب پر" زبان اور طرزِ بیان سبحان اللہ۔

سراپا

شاعر کی جولانیٔ طبع کے لیے بھی یہ موضوع نہایت صبر آزما بھی ثابت ہوسکتا ہے، وقار نے ایک مرثیے ☆[3] میں حضرت علی اکبرؑ کا سراپا کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

بائے سر بسم اللہ قرآں ہیں جو ابرو — بسم اللہ اسی بیت کی تعریف سے کرتو

☆۱۔ وقار، حوالۂ بالا، مطلع، پرچم کشا فلک پہ جو مہر مبیں ہوا، بند ۵، ص ۹۷

☆۲۔ وقار، حوالۂ بالا، مطلع، اٹھا جو حورِ صبح نے رخ سے نقاب کو، بند ۹، ص ۱۰۵

☆۳۔ حوالۂ بالا، مطلع، جب چھٹ گئے عباسؑ وفا ورِ دنیا سے، بند ۳۶، ص ۱۳۳

تشبیہ وہ لکھ جس میں نہ ہو فرق سرِ مو — چھوٹے نہ ثنا کا کوئی گوشہ کوئی پہلو
ممتاز ہوں مداحِ پسرِ سرورِ دیں میں
ہر بات پہ اک بیت ملے خلدِ بریں میں

مداح[☆1] کو مشکل ہے رخِ پاک کی مدحت — صانع نے بنائی ہے عجب نور کی صورت
جس طرح محمدؐ پہ ہوئی ختم رسالت — ختم ان پہ اسی طرح ہوئی حسن کی دولت
بے مثل اسے صفحۂ ایجاد میں پا کر
صانع نے قلم رکھ دیا یہ نقش بنا کر

وقارؔ نے نادر تشبیہات استعمال کر کے اپنے مفہوم کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی کوشش کی حسن کا نقش آخر تو یہی ہے اور صانع کی قدرت کا مکمل نمونہ بھی اس عالم ایجاد میں کوئی ان کا مدِ مقابل یا ہم سر ہو سکے، یہ ناممکن ہے، لباسِ بشری میں "نورِ خدا ہے جلوہ گر۔"

رخصت

جب امام حسینؑ رخصت کے لیے خیام میں تشریف لے گئے تو اہلِ بیت علیہم السلام کو اس طرح صبر کی تلقین فرمائی۔

دیکھ کر[☆2] سب کو بہ حسرت یہ کہا شاہ نے تب
تنِ تنہا ہوں عزیز و رفقا جا چکے سب
لشکرِ ظلم و ستم اب مجھے کرتا ہے طلب
میں بھی جاتا ہوں تمھیں سونپ کے اللہ کو اب
آہ و زاری نہ کسی رنج و بلا میں کرنا
قید کے دن بھی بسر صبر و رضا میں کرنا

'بہ حسرت' جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ سادہ اور سلیس الفاظ میں

☆1۔ حوالۂ بالا، مطلع، جب چھٹ گئے عباسِ ولا ورشہِ دیں سے، بند ۳۶، ص ۱۳۳

☆2۔ حوالۂ بالا، مطلع، جب چھٹ گئے عباسِ ولا ورشہِ دیں سے، بند ۵۴، ص ۱۳۳

☆3۔ وقارؔ، حوالۂ بالا، مطلع، اے زباں بحرِ طبیعت کی روانی دکھلا، بند ۲۳، ص ۱۵۹

کس قدر درد و غم کا اظہار ہے۔ عزیز و رفقا سب نے جامِ شہادت نوش کیا، تم سب کو خداوندتعالیٰ کے حوالے کر کے میں ایفائے عہد کے لیے جا رہا ہوں۔ امام علیہ السلام نے اپنی چاہنے والی بہن زینبؑ سے تسکین آمیز جملے بھی کہے اور شہادت کا مقصد بھی بیان فرما دیا۔

قتل[☆۱] اور قید کو ہم تم نہ گوارا کریں گر
بخششِ اُمتِ محبوبؐ خدا ہو کیوں کر
ہم کو تو عید ہو گردن پہ پھرے گر خنجر
تم اسیری کی جفاؤں میں رکھو حق پہ نظر
شاد ہو روحِ نبیؐ صبر و شکیبائی پر
حق تو نانا کا مساوی ہے بہن بھائی پر

نانا کی امت کو بخشوانا بہن اور بھائی دونوں کا فریضہ ہے، لہٰذا سفرِ کوفہ و شام اور زنداں کے مصائب سے نہ گھبرانا، بخششِ امت کے لیے میں اپنا سر بارگاہِ احدیت میں پیش کر رہا ہوں، تم اپنے سر کی چادر[☆۲] دے دینا۔

رجز

حضرت قاسم بن حسنؑ جب میدانِ کارزار میں تشریف لے گئے تو اپنے دادا حضرت علیؑ کی شجاعت کا تذکرہ کیا۔ بعد ازاں شوقِ شہادت کا اظہار فرمایا۔

شہ زور[☆۳] جتنے دہر میں ہیں ہم سے زیر ہیں
سب جس کا لوہا مان گئے وہ دلیر ہیں
شائق شہید ہونے کے جینے سے سیر ہیں
ہم شیرِ کردگار کے بیشہ کے شیر ہیں

☆۱۔ وقارؔ، حوالہ، مطلع، اے زباں سحر طبیعت کی روانی دکھلا، بند ۳۱، ص ۱۶۱

☆۲۔ گھبرانا بھائی سوا، چادر چھنی، در در پھری اب تو نانا کی بخششِ امت کا ساماں ہو گیا

☆۳۔ وقارؔ، حوالہ بالا، مطلع، اٹھا جو حورِ صبح نے رخ سے نقاب کو، بند ۶۹، ص ۱۱۲

شادی ہے سر کٹانے کی خالق کی راہ میں
لشکر یہ کب سماتا ہے اپنی نگاہ میں

صاحبِ ذوالفقار شیرِ کردگار کے بیشہ میں ہم نے بھی پرورش پائی ہے۔ لاکھ دو لاکھ کا لشکر بھلا ہماری نظر میں کیا سما سکتا ہے۔ یہ فوجیں کیا ہیں، قلعۂ آہن ہو تو وہ بھی کٹ جائے، اگر ڈانٹیں تو پہاڑوں کے جگر خوف سے پھٹ جائیں، ہمارا شمار شجاعانِ عرب میں ہوتا ہے، ہم دلیر ہیں، بہادر واقع ہوئے ہیں۔

دلیر کی تعریف بھی سن لو۔

ہے وہ☆[1] دلیر قلب میں جس کے ہو دیں کا درد
غیر از خدا ڈرے نہ کسی سے وہی ہے مرد
منظور ہے جو مجھ سے مقابل ہو فرد فرد
یا جتنی یہ سپاہ ہے مل کر کرے نبرد
وسواس کچھ نہیں ہے بے شمار سے
ہوتے ہیں شیر صید فگن کب شکار سے

حضرت عباسؑ معرکۂ کارزار میں تشریف لے گئے اور شمر سے یوں مخاطب ہوئے۔ تیری یہ مجال کہ تو نے مالکِ کوثر پر پانی بند کردیا ہے۔

میں نہرِ فرات سے پانی لانے جا رہا ہوں۔ اپنی ساری فوج کو حکم دے کہ مجھے روک لے یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ:

میں اس☆[2] خدا کے شیر کے بیشہ کا ہوں اسد
بیر العلم سے لایا جو پانی بہ جد و کد
کب آنکھ میں سماتی ہے یہ فوج لاتعد
جنگاہ سے سبھوں کو بھگادوں میں تو سند

☆۱۔ حوالہ بالا، بند ۱۷، ص ۱۱۳
☆۲۔ وقارؔ، حوالہ بالا، مطلع، آمد ہے رن میں ضیغمِ شیرِ الٰہ کی، بند ۳۹، ص ۱۲۸

صورت یہ ہوگی لشکرِ خانہ خراب کی
حالت ہوا میں ہوتی ہے جو کچھ سحاب کی

تمام شجاعانِ زمن اسدِ قلعہ شکن کی شجاعت کے قائل ہیں، ہم انھیں کے تو ورثہ دار ہیں، جب وہ بیرالعلم سے پانی لے آئے تو ہمارے لیے نہرِ فرات سے پانی لانا کون سی مشکل بات ہے۔ مندرجہ بالا بند کی بیت لاجواب ہے جس طرح بادل کے ٹکڑے ہوا کے اشارے کے پابند ہوتے ہیں، اے شمر یہی حالت تیری فوج کی ہوگی، وہ بھی میرے اشاروں پر چلے گی۔ نادر تشبیہ شاعر کے مفہوم کی بطریقِ احسن وضاحت کرتی ہے۔

رزمیہ شاعری

ہیرو کی تلوار اور اس کے رہوار کی خوبیاں بیان کرنا رزم نگاری کا اہم موضوع ہے۔ حضرت عباسؑ کی تیغِ برق دم کے محاسن بیان کرتے وقت حواسِ خمسہ گم ہیں فکر عاجز ہے اور خیال متحیر ہے۔ قوس کا سر اس کے سامنے شرمندگی سے جھک جاتا ہے، تلوار کتنی متضاد خصوصیات کی حامل ہے۔

تلوار کی تعریف

فتح☆ و ظفر کا آئینہ بھی شعلہ رنگ بھی
طینت کی پاک و صاف بھی اور خانہ جنگ بھی
قہر و غضب کے ساتھ عدالت کا رنگ بھی
عاجز نوازیاں بھی وغا کی امنگ بھی
باطل پہ خشم، لطف کی حق پر نگاہ بھی
دشمن بھی شرک و کفر کی اور حق پناہ بھی

تلوار دوست کی سینہ سپر ہے اور دشمن شکار، آب دار بھی ہے اور شعلہ ریز خوں بار بھی، اس کی باڑھ نہیں بلکہ دریائے اجل کا گھاٹ ہے، اس تلوار میں یہ سب

☆ وقار، حوالہ بالا، بند ۹۳، ص ۱۲۹

خوبیاں اس لیے پائی جاتی ہیں کہ:

''ہم دم وہ اک زمانے سے تھی ذوالفقار کی''

رہوار کی تعریف

مرثیہ گو شعرا نے ہیرو کے رہوار کی بھی خوب تعریفیں کیں۔ اگر وہ زمین پر دوڑے تو اس کے سموں کا نشان تک نہ ہو، اگر دریا میں رواں ہو تو پانی میں جنبش نہ ہو، برق رفتاری کی وجہ سے اس کو تو صبا پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ اتنا سبک ہے کہ اس کے قدم سطحِ ہوا پر ٹک جاتے ہیں۔ ایک مرثیے میں ☆[1] وقار نے حضرت عباسؑ کے رخش کی یوں تعریف فرمائی۔

تھی بے عدیل تیغ تو مرکب تھا بے نظیر
تیزی سے جس کی تنگ تھا وہ لشکرِ کثیر
کاوہ میں اس کے فوج بداندیش تھی اسیر
کیا دخل اس کے حلقے سے نکلے کوئی شریر
مسدود بابِ امن تھا سب کی نگاہ میں
باندھی تھی یہ فرس نے ہوا رزم گاہ میں

رخش نے لشکریوں سے بزبانِ حال کہا مجھ سے بچ کر تم کہاں جاؤ گے، تم اجل کے پھندے میں پھنس گئے ''ہوا باندھنا'' محاورہ ہے یعنی رعب جمانا، اپنا تسلط قائم رکھنا، کیا مجال کہ کوئی دشمن میری زد سے بچ سکے۔

چل پھر☆[2] میں صاف برقِ جہندہ کی آؤ جاؤ
ثابت نہیں زمیں پہ قدم کا کہیں لگاؤ
یکساں ہے سب اتار کسی کا ہو یا چڑھاؤ
برہم مزاجیوں پہ تصدق ہیں سو بناؤ

☆۱۔ وقار، حوالۂ بالا، مطلع، آمد ہے رن میں ضیغمِ شیرِ الٰہ کی، بند ۶۹، ص ۱۳۰

☆۲۔ حوالۂ بالا، بند ۲۷، ص ۱۳۰

حاصل ہے سیر سارے نشیب و فراز کی
پستے ہیں دل وہ پائی تھی رفتار ناز کی

وقارؔ نے صنعتِ تضاد کے برجستہ استعمال سے لطفِ بیان میں اضافہ کردیا ہے۔ رخش کی رفتار قیامت ہے، قیامت لاجواب مصرعہ ہے، ''چل پھر میں صاف برقِ جہندہ کی آؤ جاؤ'' زبان اور انداز بیان سونے پر سہاگہ ہے۔

حضرت علی اکبرؑ کی تلوار بھی صاعقۂ قہر خدا تھی وہ جس سمت چلی کشتوں کے کشتے نظر آنے لگے گویا کاٹا ہوا جنگل زمین پر بچھا ہوا تھا۔ اس میں سرعت اس بلا کی ہے کہ جل بھی اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہے، تیغِ تیز برق غضب کے جلوے اور امیرِ عرب کے اندازِ حرب وضرب دکھا رہی تھی۔

وہ[☆1] باڑھ کہ دریا بھی روانی کو نہ پہنچے
بجلی بھی کبھی شعلہ فشانی کو نہ پہنچے
شعلے کی زباں تیز زبانی کو نہ پہنچے
وہ گرم کہ آتش کبھی پانی کو نہ پہنچے
جوہر تھے کہ عریانی میں گل پیرہنی تھی
ہاں قہر کے دریا میں بجھا کر وہ بنی تھی

اسی لیے اس نے ہر حملے میں سیکڑوں کو بے دم کردیا لیکن اس کی روانی اور تیزی میں کمی نہیں واقع ہوئی۔ اس میں ایسا دم تھا کہ ہر ضرب میں صدہا کو بے دم کیا۔ بہ شمشیر میں ایسا سم تھا کہ جسے چھوگئی وہ بے جان ہوگیا۔

جب چل[☆2] گئی خود سرِ دشمن پہ نہ ٹھہری
سر کرکے دوبارہ کبھی گردن پہ نہ ٹھہری
چار آئینہ و پیکر و جوشن پہ نہ ٹھہری
دو ہوگیا راکب تو وہ توسن پہ نہ ٹھہری

☆1۔ وقارؔ حوالۂ بالا، مطلع، جب چھٹ گئے عباسِ دلاور شہِ دیں سے، بند ۸۰، ص ۱۳۶
☆2۔ وقارؔ حوالۂ بالا، مطلع، جب چھٹ گئے عباسِ دلاور شہِ دیں سے، بند ۸۲، ص ۱۳۷

بجلی سی چمک کر جو گری خانۂ زیں پر
رہوار کو دو کر کے جو ٹھہریں تو زمیں پر

یہ انیسؔ کا فیض ہے کہ وقارؔ نے تلوار کی تعریف میں ایسے عمدہ بند نظم کیے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وقارؔ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے استاد کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی جس میں انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔

امام عالی مقام کے سبک رفتار رہوار کے بارے میں ایک[☆1] بند پیش کیا جاتا ہے۔

سامنے حور بھی محجوب ہو صورت ایسی
جس سے شرمندہ پری اڑنے میں سرعت ایسی
شیرِ گردوں بھی ہے سہما ہوا شوکت ایسی
بار امامت کا اٹھائے ہوئے قوت ایسی
اوج تھا تختِ سلیماں سے بھی اعلا اس کا
پشت پر شاہ تھے، تھا اوج دوبالا اس کا

رخش کی قوت کے بارے میں چوتھا مصرع لاجواب ہے۔

"بار امامت[☆2] کا اٹھائے ہوئے قوت ایسی"

فصاحت و بلاغت کا کمال ہے، سحرِ حلال ہے۔ اعجاز شاعری ہے جس میں الہامی کیفیت پائی جاتی ہے۔

معرکۂ کارزار کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے تاکہ رزمیہ شاعری کے مفہوم کی وضاحت ہوسکے۔

یومِ عاشور رزم گاہ میں موت کا بازار گرم ہے، ہزاروں اسوار تہِ تیغ ہوگئے اور

☆1۔ وقارؔ حوالۂ بالا، مطلع، اے زباں بحر طبیعت کی روانی دکھلا، بند ۹۲، ص ۱۹۷

☆2۔ انیسؔ مرحوم کے مشہور مرثیے کا مطلع ہے، وا حسرتا کہ عہدِ جوانی گزر گیا، لیکن، مراثی انیسؔ، جلد اول، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، مرثیہ نمبر ۳۶ کا مطلع حسب ذیل درج ہے۔
"جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا"۔ اسی مرثیے کا ایک مصرع ملحوظِ خاطر رہے۔
"ناز اس پہ تھا کہ بار امامت اٹھائے ہوں، ص ۳۷۲

رہواروں کی ٹاپوں سے بس گئے ارضِ نینوا پر لاشوں کا انبار نظر آنے لگا۔ سپہ شام کے سردار مضطرب ہیں کبھی رن کی کیفیت کا جائزہ لیتے ہیں اور کبھی پسر سعد کو خبر دیتے ہیں کہ قلب لشکر خالی ہوگیا، امام علیہ السلام کی جنگ کا ایک منظر دیکھیے۔

جا پڑے ☆[1] غیظ میں مثلِ اسداللہ جدھر — تھے پرے سارے شکستہ تو صفیں تھیں ابتر
صرصرِ قہر تھی یا چل رہی تھی تیغ دو سر — نخلِ قامت کو بناتی تھی خزاں دیدہ شجر
سر پہ سر گرتا تھا پت جھڑ کی صفت ظاہر تھی — تھی بہار اجل اور فصلِ حیات آخر تھی

کربلا کے بن میں ایسا رن پڑا جس کی مثال کائنات میں نہیں ملتی۔ فتنۂ حشر ڈر کر دامنِ محشر میں چھپ گیا، رن کا غلغلہ چرخِ بریں تک پہنچ گیا اور زلزلہ بھاگ کر کوفے کی زمین تک پہنچا، الحفیظ، الامان۔

شہادت

اس ضمن میں وقارؔ کے مرثیوں سے چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔

حضرت عباسؑ نے لشکرِ اعدا کے اس غول کو روند اُس صف کو خون میں نہلا دیا پھر نہر میں گھوڑا ڈال دیا، مشکیزہ پانی سے بھر لیا، خیمے کا رخ کیا، لشکر ستم سمٹ کر آگیا ہزاروں کو تہِ تیغ کیا، اتنے میں ایک تیر مشک پر لگا۔ سب پانی بہ گیا، بانیِ ستم تیغوں کے وار کر رہے تھے جری کا دستِ راست قلم ہوگیا، اس کے بعد کسی شقی نے بائیں ہاتھ پر بھی وار کیا۔

باگیں ☆[2] چھٹی ہوئی ہیں پریشاں ہے راہوار — دونوں قدم مگر ہیں رکابوں میں استوار
مارا کسی نے گرزِ گراں سر پہ ایک بار — صدمے سے اس کے فرقِ مطہر ہوا فگار
دل بے قرار ہوگیا غش کھا کے گر پڑے — پشتِ فرس سے خاک پہ تیوار کے گر پڑے

سپاہِ اعدا میں فتح و ظفر کے باجے بجنے لگے کہ علم دارِ لشکر امام کو شہید کر دیا۔ اس غم سے امامِ مظلوم کی کمر جھک گئی، بصارت میں کمی واقع ہوگئی۔ کلیجہ منہ کو آگیا، دل پاش پاش ہوگیا۔

☆۱۔ وقارؔ، حوالۂ بالا، مرثیۂ بالا، بند ۷۱، ص ۱۶۳

☆۲۔ وقارؔ حوالۂ بالا، مطلع، آمد ہے رن میں ضیغمِ شیر الٰہ کی، بند ۱۰۵، ص ۱۳۲

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت

ہم شبیہ پیمبرؐ کی جنگ کا کیا کہنا، دشمنوں کے مورچے توڑ دیے، ہزاروں نمونداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے، آخر کب تک لڑتے ضعف سے نڈھال ہوگئے، موقع پاکر سنان بن انس نے کلیجے پر برچھی کا بھرپور وار کیا جس سے کلیجہ چھد گیا، امام مظلوم افتاں وخیزاں کڑیل جوان کے لاشے پر پہنچ ہی گئے۔

بین

غمِ حسینؑ میں اشک افشانی کو مآلِ مجلس تسلیم کیا جاتا ہے۔
اس ضمن میں نمونتاً دو[☆1] بند نقل کیے جاتے ہیں۔
حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد:

سر پیٹ کے حضرت نے گریبان کیا چاک
تڑپے کہ ہوئی خون میں تر جسم کی پوشاک
فرماتے تھے رو کر مرے جینے پہ ہے اب خاک
فردوس میں مجھ کو بھی بلالو شہِ لولاک
بے زار ہوں جینے سے جواں بیٹے کے غم میں
پردیس میں آکر میں گھرا فوجِ ستم میں

اس کے بعد امامِ مظلوم جوان بیٹے کی لاش اٹھا کر خیمے میں لے گئے اور زینبؑ خستہ جگر کو آواز دی، آؤ بہن آؤ ہم لاشِ پسر لے آئے ہیں۔

یہ سنتے[☆2] ہی ناموس میں برپا ہوا محشر
سب بیبیاں ڈیوڑھی کی طرف دوڑیں کھلے سر
خیمے میں جولائے شہِ دیں لاشۂ اکبرؑ
دل ہل گیا غش کھا کے گری خاک پہ مادر

☆1۔ وقار، حوالۂ بالا، مرثیۂ مذکورہ، بند ۱۳۵، ص ۱۵۲

☆2۔ وقار، حوالۂ بالا، مرثیۂ مذکورہ، بند ۱۳۳، ص ۱۵۳

تاب آئی نہ اُس وقت شہنشاہِ زمن کو
باہر گئے پھر لاشِ پسر دے کے بہن کو

کڑیل جوان کا لاشا دیکھ کر خیامِ اہلِ بیت میں کہرام مچ گیا، ساری فضا سوگوار و ماتم گسار ہوگئی۔

''افزوں غمِ اولاد سے ماتم نہیں کوئی''

وقار کے مرثیوں کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے مراثی میں واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور رزمیہ شاعری کے عمدہ نمونے ہیں۔

ان کے کلام میں اعجاز بیانی بھی ہے اور رعنائی خیال بھی، خلوص بھی ہے اور تاثیر بھی اس لیے اربابِ نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس کے لیے دعوتِ فکر ہے۔

وقار کا کلام الفاظ و معانی کا ایسا شاداب گلشن ہے جو آسیبِ خزاں سے محفوظ رہے گا۔

۱۷۔ یونس، میر کاظم حسین

یونس ہمشیر زادہ و شاگرد میر ببر☆ علی انیس خوب کہتے تھے۔
سلام کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

جس گدا پر کچھ بھی لطفِ شاہِ یزداں ہوگیا
کیوں سلیماں کہیے یوں کہیے مسلماں ہوگیا

روز روشن کی طرح روشن ہے، شب تک کچھ نہ تھا
صبح کا ہونا تھا سب کچھ ساز و ساماں ہوگیا

یہ کہوں گا کربلا پہنچوں گا اے یونس میں جب
جو مرے دل میں تھا پورا آج ارماں ہوگیا

☆ گل دستۂ سلام، ۱۳۴۴ھ، (مطابق ۲۶-۱۹۲۵ء)

مرثیہ گوئی میں تلمذ رکھنے والے شعرا

''اردو میں ابتدائے سخن مرثیے سے ہے''

دکن میں مرثیہ گوئی کی ابتدا

''بہمنی خاندان نے ۱۳۴۷ھ سے ۱۵۲۵ء تک اس ملک (دکن) کی تہذیب و معاشرت اور ادب و سیاست کی رہ نمائی کی اور اپنے بعد ایسی مستقل یادگاریں چھوڑ گیا جو اس کے نام اور کام کو یاد دلاتی رہیں گی، ان یادگاروں میں سب سے اہم اردو زبان اور ادب ☆ ہے۔''

بہمنی عہد میں دکنی ادب کے دور کا آغاز ہوا۔ ۱۵۰۳ء میں اشرفؔ نے ایک طویل مثنوی نوسرہار لکھی جو ۱۸۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں حضرت امام حسینؑ کے واقعات اور حالات نو ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر اردو زبان میں یہ پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

''بہمنیوں نے دکن میں علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی اچھی فضا پیدا کر دی تھی جو اُن کی سلطنت کے ساتھ ختم نہیں ہوئی بلکہ اُن کی جانشین حکومتوں اور خاص

☆ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، دکنی ادب کی تاریخ، مطابع ایجوکیشنل پریس، کراچی و نشاط پریس کراچی۔ ناشرین، اردو مرکز، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، جون ۱۹۶۰ء، ص ۱۰

کر بیجاپور اور گولکنڈہ میں ایسی نشوونما پائی کہ دنیائے اردو اس پر جتنا ناز کرے کم ہے۔☆[۱]

دکن کے چند مرثیہ گو شعرا کے کلام سے نہایت اختصار کے ساتھ انتخاب پیش کیا جا رہا ہے تاکہ مرثیے کے آغاز اس کے ارتقا اور عروج کی بابت صحیح نتائج اخذ کیے جاسکیں۔

حسینی، شاہ ندیم اللہ

حسینی کا شمار عادل شاہی☆[۲] دور کے شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کے کئی مرثیے بیاض☆[۳] میں ملتے ہیں۔ چو مصراعی مرثیے سے انتخاب پیشِ خدمت ہے۔

کیا عرش پو☆[۴] غل آج ہے زخمی امام امجد پڑا
بن سر پیاسا کربلا میں نائبِ احمدؐ پڑا
سلطان دو عالم کا وہ کیسوں☆[۵] صاحبِ مسند پڑا
ہیہات کٹ کر ظلم سوں☆[۶] امت کا وہ سید پڑا

☆

کرسوں☆[۷] مدینہ کی طرف زینبؑ کہے: یا مصطفیٰؐ
بھائی مرا جس کا بدن (تھا) تیری شفقت سوں پلا
زخموں سے چوراب سرا اوپر اس کے کھڑے ہیں اشقیا
تازی سوں ڈھل کر خاک میں سالار دیں ارشد پڑا

ہاشمی

میاں خاں بیجاپوری کو عادل شاہ کے درباری شاعر ہونے کا فخر حاصل تھا۔ ۱۲۹۷ء میں ہاشمی کا انتقال ہوا۔

☆۱۔ حوالۂ بالا، ص ۲۷
☆۲۔ ۱۳۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک
☆۳۔ حسینی، شاہ ندیم اللہ، ق ۳۔ ۶۸۳، کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو، کراچی ص ۳ و ۴
☆۴۔ پہ ☆۵۔ کس طرح
☆۶۔ سے ☆۷۔ منہ

تصانیف: مثنوی یوسف زلیخا، غزل کا دیوان اور مرثیے۔
بیاض[☆۱] سے ایک مرثیے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

دل بندِ مصطفیٰؐ کا تابوت لے چلے ہیں
فرزندِ مرتضیٰؑ کا تابوت لے چلے ہیں
حضرت حسینؑ حسنؑ کا شاہنشہِ زمن کا
حضرت نبیؐ کے من کا تابوت لے چلے ہیں
تھے فاطمہؑ کے پیارے ناحق ان[☆۲] کوں مارے
مل قدسیاں سنوارے تابوت لے چلے ہیں
کر ظلم نابکاراں حضرت کے شہسواراں
مارے ہیں دوست داراں تابوت لے چلے ہیں
اس غم کوں نئیں سرایت یو غم ہے بے نہایت
پائے ہیں شہ شہادت تابوت لے چلے ہیں
غم سوں جہاں جلیا ہے جیوں شمس تملیا ہے
شہ جگ سیتی چلیا ہے تابوت لے چلے ہیں
حضرت کیرے نواسے حیدر کیرے خلاصے
ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں
اے ہاشمی شہاں کا سلطانِ انس و جاں کا
مقبولِ دو جہاں کا تابوت لے چلے ہیں

احساؔن کا شمار برہان پور کے مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس نے بہت سے مرثیے لکھے، ایک چومصراعی مرثیے[☆۳] سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہے سلام اس کے اوپر جو دو جہاں کا شاہ ہے
شکر سے واقف وہ ہے گا صبر سے آگاہ ہے

☆۱۔ ہاشمی ق ۳۔ ۹۱۱ کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۴۹۔۵۰
☆۲۔ ان کو
☆۳۔ احساؔن بیاض، مخطوطہ نمبر ق ۳۔ ۶۳۹، کتب خانۂ خاص انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۱۹۔۲۰

دیکھ کر قاتل کوں یوں کہتا وہ عالی جاہ ہے
واں چھری لیکھے تو یاں سر فی سبیل اللہ ہے

۵۔ قاتل اس کے حلق پر جس دم چھری دھرنے لگا
اور اس مظلوم کا لوہو سے منھ بھرنے لگا
عالمِ بالا پہ تب شور و فغاں کرنے لگا
اب شفق میں ڈوبتا یہ چودھویں کا ماہ ہے

۱۲۔ اب جناب حق میں ہوں گا یہ دعا میں مانگتا
بہرِ خونِ ناحقِ مظلوم دشت کربلا
وہاں بھجوا دیو مجھ احسان کو اے کبریا
میرے آقا کا جہاں روضہ ہے اور درگاہ ہے

نظامی برہان پوری [☆۱]

دکن کے قدیم مرثیہ نگاروں نے ہیرو کا سراپا نظم کرنے پر بہت کم توجہ دی۔ اشرفؔ نے مثنوی 'نوسرہار' میں حضرت علی اکبرؑ کا سراپا نظم کیا اور نظامی نے امام حسینؑ کا۔ نمونے کے طور پر چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

حسنؑ تاج شاہاں سلام علیک | حسینؑ ماہِ تاباں سلام علیک
پشانی [☆۲] حسینؑ کی جو والشمس [☆۳] ہے | بھواں ہیں فرقاں سلام علیک
مبارک دو لب سورہ المائدہ [☆۴] | دو تشدید دنداں سلام علیک
زباں مکھ منے از مزمل [☆۵] کا ہے | دو کوثر زنخداں سلام علیک

☆۱۔ نظامی بیاض مراثی، مخطوطہ نمبر ق ۳۔۱۱۶ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی، صفحہ ۵

☆۲۔ پیشانی

☆۳۔ والشمس (سورج کی قسم) تیسواں پارہ

☆۴۔ سورہ المائدہ چھٹا ساتویں پاروں میں ہے

☆۵۔ چادر لپیٹنے والا (رسول اللہ) کا لقب ہے، پارہ انتیس۔

وہ گردن ہے طٰہٰ☆[1] و یٰسین☆[2] دل — گلاشہ کا مرجاں سلام علیک
وہ نصر من اللہ و فتح قریب☆[3] — شہنشہ کی باہاں سلام علیک
حسینؑ کا سینہ سورہ الفاتحہ☆[4] — و وقد آلِ عمراں☆[5] سلام علیک
نظامیؔ قیامت کا کچھ ڈر نہ کر — حسینؑ شاہِ سلطان سلام علیک

قطب شاہی دور ۱۵۰۸ء سے ۱۶۸۷ء تک

شاہیؔ شاہ قلی خاں اس عہد کا نہایت مشہور مرثیہ نگار گزرا ہے۔

''اس کے دو مرثیے اڈنبرا یونی ورسٹی اسکاٹ لینڈ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

اگرچہ ان میں تیس سے زیادہ شعر موجود نہیں ہیں تاہم ادبی خصوصیات کے لحاظ سے ان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک مرثیہ واقعی لاجواب ہے، اس میں اس سفر کا ذکر کیا ہے جب کہ حضرت امام حسینؑ کے شہید ہونے کے بعد آپ کا خاندان قید ہو کر کربلا سے دمشق کو جاتا ہے، اس میں صحیح حالات کی ترجمانی کی گئی ہے، اس کا طرزِ بیان اس واقعے کی حد تک انیسؔ کے اندازِ بیان کے مماثل ہے، زبان بھی اعلیٰ اور شاعرانہ ہے۔☆[6]

اس مرثیے سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

دیکھے محرم کا چاند سکھ کوں بسارو☆[7] تمام
دل کوں☆[8] کرو داغ داغ شاہ و گدا خاص و عام

☆۱۔ طٰہٰ بھی رسولِ پاکؐ کا لقب ہے (سولھواں پارہ)
☆۲۔ پارہ بائیس و تئیس (سورہ یٰسین کو قرآن مجید کا دل کہا جاتا ہے)
☆۳۔ (اے رسولؐ) نصرت من جانب اللہ ہے اور عنقریب تم کو فتح ہوگی۔ پارہ اٹھائیس سورہ الصف آیت ۱۱۔۱۲
☆۴۔ فرقان حمید کا پہلا سورہ
☆۵۔ سورہ آلِ عمران، تیسرے اور چوتھے پاروں میں ہے
☆۶۔ زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، اردو شہ پارے، جلد اول، مکتبۂ ابراہیمیہ، امداد باہمی حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۰
☆۷۔ ختم کرو
☆۸۔ کو

ابنِ رسولؐ خدا تس کے فراقوں بدل
آہ کے بھرنے☆[۱] انجومنین کے کرتا ہے جام
ذات مبارک کے تئیں کہتے ہیں ناحق شہید
دیکھو ستم گار لوگ اس کوں سمجھ خوب کام
کیا یو منافق یزید کیتا برائی☆[۲] سگل
دل منے خاماں کرو ایسے نبیؐ کا کلام
اس کی شقاوت بدل دوشہِ خورشید نے
گلشنِ فردوس میں کیتے☆[۳] ہیں اپنا قیام
شاہ شہید حسینؑ وصف تمہارا یو پاک
شاہی☆[۴] کرے و ردیو عشق سوں ہر صبح و شام

عابد شاہ

عابد کا تعلق قطب شاہی دور سے ہے۔ اس کا شمار دکن کے ممتاز مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

بیاض☆[۵] میں عابد کے آٹھ مرثیے ہیں ایک مرثیے سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

ماتم کی ہانک سن کر چودہ طبق ہلے ہیں
اسمان ہور زمیں سب لرزاں ہو کھلبلے ہیں
لوح و قلم عرش ہور کرسی شہاں کے غم سوں
شمس و قمر ستارے یکدھر تھی ڈلے☆[۶] ہیں

☆۱۔ آنسو
☆۲۔ شغل
☆۳۔ کرتے ہیں
☆۴۔ شاہی، بیاض مخطوطہ نمبر ق ۳-۱۱۱، کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۶۱
☆۵۔ عابد، بیاض مراثی ق ۳-۱۱۱، کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۲۰۵-۲۰۶
☆۶۔ پریشاں

اس غم تے مصطفیٰؐ ہور غمگیں علیؑ ہوئے جب
افسوس کے ہو ہاتاں سالم ولیاں ملے ہیں
حوراں پریاں و غلماں آدم صفی حوا ہور[☆۱]
جن و بشر ملک سب اس غم تے تلملے ہیں
شاہ دو جگ کے غم سوں سینہ پھوٹیا گگن کا[☆۲]
جس کو شفق کہتے سو وہ لہو کے سب ڈلے ہیں
سن سوز کربلا کا ٹکڑے ہوئے جگر سب
ہر یک سینے میں یاراں گویا کہ رن کھلے ہیں
سب زاہدان و عابد سٹ[☆۳] زہد ہور عبادت
شاہاں کے درد و غم سوں رو رو نپٹ گلے ہیں

تقریباً دو سو سال تک دکن میں مرثیے لکھے گئے، اس دوران مرثیے کی ہیئت میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کے موضوعات میں بھی اضافے ہوتے رہے لیکن بین کی اہمیت کو ہر مرثیہ نگار نے تسلیم کیا اور سامعین کی طرح وہ بھی اسے مآلِ مجلس سمجھتا رہا، سادگی خلوص اور تاثیر اس عہد کے مرثیہ گو شعرا میں قدرِ مشترک ہے۔

۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں ریاست گولکنڈہ کی تباہی کے بعد دکن انتشار سے دوچار ہوگیا۔ بہت سے شعرا کا کلام ملکی خلفشار کی نذر ہوگیا، تھوڑا بہت بیاضوں میں محفوظ رہ گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی مرثیوں کی روایات باقی رہ گئیں، فضا سازگار ہوتے ہی شمالی ہند کے مرثیہ نگاروں نے ان روایات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کی ابتدا محمد شاہ[☆۴] کے عہد سے ہوئی "وہاں (دہلی

☆۱۔ اور
☆۲۔ آسمان
☆۳۔ چھوڑ کر
☆۴۔ ۱۷۱۹ء سے ۱۷۳۹ء تک

میں) تھوڑے بہت مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے، ان میں سب سے پہلے فضلیؔ ہیں جن کی کربل کتھا یا وہ مجلس مشہور ہے۔ ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔''[☆۱] ۱۱۴۵ ہجری مطابق ۱۷۳۲ء میں فضل علی خاں فضلیؔ نے روضۃ الشہدا کا خلاصہ مکمل کرلیا۔ انھوں نے نثر کے ساتھ نظم بھی لکھی ہے، یہ نظمیں سلام[☆۲] و مرثیہ کے طرز پر ہیں۔

کربلا میں کیا پڑا گھمسان ہے   عابدیں جس دکھ سیتی[☆۳] گریان ہے
فاطمہؓ کا جان یو بے جان ہے   آج کی شب کا دیکھو[☆۴] مہمان ہے
جس کا نانا ہے محمد مصطفیٰؐ   ہور پدر بے شک ہے شاہِ لافتیٰ
کیوں جگہ ان کا پڑا ہے سر جدا   تن مبارک بھوئیں[☆۵] اوپر نالان ہے
رو پکاریں سب تیماں یاحسینؑ   ہم ہوئے تم بن غریباں یاحسینؑ
بخت الٹ گئے ہور نصیباں یاحسینؑ   چو طرف سے ہم اوپر طوفان ہے
آج ہے فضلیؔ قیامت وادریغ   ڈھل پڑا تاج امامت وادریغ
تیں گگن پر استقامت وادریغ   غم سیتیں ساتوں زمیں لرزان ہے

فضلیؔ کے ہم عصر بہت سے مرثیہ گو تھے لیکن صرف ایسے مرثیہ گو شعرا کے کلام سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے جنھوں نے مرثیے کی تکنیک و ہیئت میں تبدیلیاں کیں یا موضوع کو وسعت دی اور تنوع بخشا۔ مثلاً سکندر وغیرہ۔

سکندر کے ہم عصر سوداؔ کا تذکرہ ضروری ہے۔

وہ نہایت پُرگو شاعر گزرے ہیں، انھوں نے قصیدے کے طرز پر مرثیے لکھے۔ مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی شکل میں بھی ترجیع بند اور ترکیب بند بھی۔

ان کے مسدس سے ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

☆۱۔ حامد حسن قادری، پروفیسر، تاریخ مرثیہ گوئی، ۱۹۶۳ء، ص ۴۳

☆۲۔ فضلیؔ، کربلا کتھا (مرثیہ امام مظلوم علیہ السلام) شائع کردہ تحریر دہلی، جلد ۱، شمارہ ۲، ۱۹۶۷ء، ص ۲۷۸ تا ص ۲۸۰

☆۳۔ سے

☆۴۔ ی تلفظ میں نہیں آئے گی

☆۵۔ زمین

بند ۱

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی
جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری جلادی
کوئی فرزندِ علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اس کی تو نہیں ڈرتا ہے

سوداؔ نے مرثیہ کی ہیئت میں بھی تبدیلی کی اور اس کے موضوع میں تنوع پیدا کیا، مرثیے کو زبان اور بیان کی خوبیوں سے مالا مال کیا۔

میر تقی میرؔ کے مربع مرثیے مشہور ہیں، انھوں نے مسدس بھی لکھا ہے نمونتاً ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

ریت کے لیے شبیرؔ مارا　　　بھلا یوں اس کی تھی تقدیر مارا
کہوں کو کیوں ہے بے تقصیر مارا　　　علی اصغرؔ کے پھر کیوں تیر مارا
چھاتیں عورتوں کی کیوں رولائیں
روا کا ہے کو رکھیں یہ جفائیں

میر تقی میر نے مرثیوں میں اندوہ ناک واقعات کا بیان کیا اور مرثیہ کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

میر ضاحکؔ اور میر حسنؔ نے بھی مرثیے کہے۔

میر حسنؔ کے مربع مرثیے سے تین بند☆ نقل کیے جاتے ہیں۔

جن نہالوں کے تئیں زہرا نے پالا دودھ سے
وے شجر بن پانی مرجھا کر زمیں پر گر پڑے
بیخ و بنیاد ان کی کھودی باغیوں نے تیغ سے
موسم گلزار احمد کا سماں بدھ کر گیا

☆ بحوالہ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم، رسالہ "آج کل" دہلی ۱۹۶۵ء

متصل مقتل کے پہنچے جس گھڑی اہلِ حرم
دیدہ گریاں سینہ بریاں خشک لب اور چشم نم
دیکھ کر ہاتھوں کو سب کہنے لگے بادرد و غم
ہاتھ سے اہلِ جفا نے کیا ستم ان پر کیا
یک بیک عابدؑ کی اتنے میں گئی اودھر نظر
جس طرف لاشیں پڑی تھیں خاک وخوں میں سربسر
دیکھ اس احوال کو بولا وہ یوں اک آہ بھر
آہ میں کیدھر رہا اور قافلہ کیدھر رہا

اس سے قبل اس امر کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے کہ مرثیے کے تعمیری دور میں مرثیے کے لیے ایک ڈھانچہ تیار کرلیا گیا تھا اور اس کے اجزائے ترکیبی بھی مقرر کردیے تھے۔ اس ضمن میں میر خلیقؔ، میر ضمیرؔ، مرزا فصیحؔ اور دلگیرؔ کی کوششیں قابلِ قدر ہیں۔

خلیقؔ☆، میر مستحسن

میر حسنؔ کے دوسرے بیٹے تھے۔ فیض آباد ان کی تربیت کا گہوارہ بنا۔ بعدازاں وہ لکھنؤ چلے گئے۔ مصحفیؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں اُنھوں نے غزلیں لکھیں، بعد ازاں مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوئے، خلیقؔ کے بہت کم مرثیے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے بعض مرثیے کسی مغالطے کی بنا پر انیسؔ مرحوم کی اُن جلدوں میں شامل کیے گئے ہیں جو شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیں۔

خلیقؔ کے ایک مختصر لیکن مشہور مرثیے کا مطلع ہے۔

''گھر سے جب بہرِ سفر سیّدِ عالم نکلے''

مرثیے کا پہلا بند دیکھیے۔

گھر سے جب بہرِ سفر سیّدِ عالم نکلے — سر جھکائے ہوئے بادیدۂ پرنم نکلے
خویش و فرزند کمر باندھ کے باہم نکلے — رو کے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے

☆ پیدائش ۱۱۸۱ھ (مطابق ۶۸۔۱۷۶۷ء) کے لگ بھگ، وفات ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ء)

رات سے گریۂ زہرا کی صدا آتی ہے
دیکھیں قسمت ہمیں کس دشت میں لے جاتی ہے

مندرجۂ بالا بند سہل ممتنع کا عمدہ نمونہ ہے، آسان اور سلیس زبان میں خلیق نے واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا، سر ''جھکائے ہوئے'' تھے، مرضیِ معبود کے تابع ہونے کی وجہ سے۔ ''بادیدۂ پرنم'' اس لیے کہ روضۂ رسولِ مقبول سے بہ درجۂ مجبوری جدا ہو رہے ہیں، مستقبل کے واقعات اُن کے پیشِ نظر تھے، اس لیے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

یہ پُرخطر سفر پیش خیمہ ہے، آلام ومصائب کا۔

خلیق کے مرثیوں میں سراپا بھی ہے اور معرکۂ کارزار کی جھلکیاں بھی ہیں۔ لیکن رخصت اور بین اُن کے مراثی کی اہم خصوصیات ہیں، محاسنِ زبان کی بھی اُن کے کلام میں فراوانی ہے۔

ضمیر☆ مظفر حسین ولد قادر حسین

مصحفی کے شاگرد تھے، غزل گوئی سے ان کی شاعری کی بھی ابتدا ہوئی۔ بعد ازاں مرثیہ گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ ضمیر نے پہلا مرثیہ حضرت صغرا کے قاصد کے حال کا لکھا اور اسے مرزا ظفر علی کے ہاں مجلس میں پڑھا، ان کی بابت مشہور ہے کہ ہر ماہ ایک مرثیہ تصنیف فرماتے، صبح کی منظر کشی اور جنگ کی مرقع کشی پر خوب خوب طبع آزمائی کی، اس ضمن میں ایک بند پیشِ خدمت ہے۔

طرف صحرا کی زمیں پر ہوئی اک گل کاری — چمن آرا ہوئے عباسؑ جو واں اک باری
یک قلم تیغ سے وہ فوج قلم کی ساری — عوضِ نہر ہوئیں خون کی نہریں جاری
قتل جن ہاتھوں سے چن چن کے وہ بے دین ہوئے
باغباں آپ ہی اور آپ ہی گل چین ہوئے

مرثیہ کی تکنیک میں سراپا، اور جنگ کے مناظر کا تفصیلی بیان ضمیر کا اہم اضافہ ہے۔ واقعہ نگاری اور زبان کی شیرینی بھی ہے، ضمیر نے طویل مرثیے لکھے۔

☆ پیدائش تقریباً ۱۱۹۷ھ (مطابق ۸۳-۱۷۸۲ء) سال وفات ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء

فصیح، مرزا جعفر علی ☆۱

فصیح نے ابتدا میں غزلیں کہیں ناسخ سے اصلاح لی۔ علم عروض کے ماہر تھے، احادیث پر بھی ان کی نظر گہری اور وسیع تھی۔

مرثیہ گوئی ان کی شہرت کا سبب بنی "مرثیے میں صف آرائی اس کی ایجاد اور حسینی مضامین میں استاد۔"☆۲ فصیح کے مرثیوں میں رزم نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کے اکثر مراثی میں چہرہ نہیں ہے، جنگ کے بیان، رخصت اور شہادت کا تذکرہ بالعموم ہے، طویل بحروں کے مرثیے اسی دور کی یادگار ہیں۔

طویل بحر میں ایک مرثیے سے ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

بخدا کہ پاؤں کا آبلہ مجھے تاجِ سر سے زیاد ہے
یہ خلش جو اس میں ہے خار کی مرا دل شگفتہ وشاد ہے
یہ ہوائے تند جو چلتی ہے بخدا کہ بادِ مراد ہے
اسی قیدِ ظلم میں ہر نفس مرا نفس صرفِ جہاد ہے
میں قدم قدم پہ شہید ہوں میں نفس نفس پہ قتیل ہوں
نہ اسیر ہوں نہ مریض ہوں نہ سقیم ہوں نہ علیل ہوں

فصیح کے مرثیوں میں تنوع ہے، انھوں نے مرثیے کو اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کا ذریعہ بنا دیا اور اسے علمی انداز سے ہم آہنگ کیا۔

حاجیِ حرمین ہونے کا اُنھیں شرف ملا اور وہیں کے ہو رہے۔

دلگیر ☆۳ غلام حسین

ان کا نام چھنکو لال / چھنو لال تھا، شروع میں ان کا تخلص طرب تھا، اس وقت وہ غزلیں کہتے تھے اور مرزا خانی نوازش کے شاگرد تھے۔

☆۱۔ پیدائش ۱۱۹۷ھ (مطابق ۸۳-۱۷۸۲ء) فیض آباد وہاں سے دلی گئے اور نواب شجاع الدولہ کے عہد میں اپنے والد مرزا ہادی خوش نویس کے ہم راہ لکھنؤ پہنچے، وفات ۱۲۷۰ھ (مطابق ۵۴-۱۸۵۳ء)

☆۲۔ ناصر سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکۂ زیبا، حصہ دوم، طبع اول مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۵

☆۳۔ پیدائش تقریباً ۱۱۹۸ھ وفات ۱۲۶۳ھ مطابق ۴۸-۱۸۴۷ء (مطابق ۸۴-۱۷۸۳ء)

۱۲۳۰ھ (مطابق ۱۵-۱۸۱۴ء) میں وہ مشرف بہ اسلام ہوئے، غلام حسین نام رکھا، دلگیر تخلص اختیار کیا۔

دلگیر بہت پرگو اور زود گو واقع ہوئے تھے، ان کے مرثیوں کی تعداد پانچ سو سے زائد ہے۔ انھوں نے ۲۷ بند کے مختصر مرثیے بھی لکھے اور ۱۶۷ بند کے طویل مرثیے بھی۔

زبان میں لکنت تھی، اس لیے اپنا کلام خود پڑھنے سے قاصر تھے۔

دلگیر کے مرثیوں میں تنوع پایا جاتا ہے، مختلف موضوعات پر انھوں نے طبع آزمائی کی، لیکن رخصت کے مضامین پر خاص توجہ دی ہے اور اس میں نئے نئے گوشے پیدا کیے، ایک بند نقل کیا جاتا ہے۔

رخصت

جب کہ مارا گیا میدانِ ستم میں نوشاہ
دیکھا عباسؑ نے تب سوئے شہِ عرش پناہ
شہِ دیں جان گئے بھائی ہے، اب رخصت خواہ
آنسو آنکھوں سے گرے منھ سے کہا بسم اللہ
الغرض اذنِ شہنشاہِ امم کو لے کر
آیا میدان میں عباسؑ علم کو لے کر

سودا کی طرح دلگیر نے بھی سماجی اور معاشی زندگی کی مرثیوں میں کامیاب عکاسی کی ہے۔

مرثیے کے قوام میں بہت سے اجزا شامل کیے گئے اور اس تعمیری دور میں مرثیے کے لیے ایک ڈھانچہ تیار ہوگیا اس وقت تک مرثیے بطرزِ سوز خوانی پڑھے جاتے تھے، اس لیے تیس یا چالیس یا زیادہ سے زیادہ پچاس بند پڑھے جاسکتے تھے لیکن اب تحت اللفظ خوانی کا رواج عام ہونے لگا۔ اس کے پیشِ نظر طویل مرثیے تصنیف کیے گئے، تحت اللفظ خوانی اور مرثیہ گوئی کو مقبول بنانے میں میر خلیق اور میر ضمیر پیش پیش تھے۔

میر خلیق کے نامور شاگرد میر انیس اور میر ضمیر کے شاگرد رشید مرزا دبیر نے قدرتِ کلام اور طباعی کے جوہر دکھائے، نادر تشبیہات اور استعارات سے زبان کو سجایا

اور صنفِ مرثیہ کو بامِ عروج تک پہنچا دیا، اس کی بدولت مرثیے کی ساکھ قائم رہ گئی۔ تاریخِ مرثیہ ان حضرات کو ہرگز فراموش نہیں کرسکتی۔

میر انیسؔ کے فیض سے اس عہد میں چمنستانِ نظم میں ہزار ہا گل ہائے رنگا رنگ کھلے اُن کے شاگردوں نے فن مرثیہ گوئی کو زندہ رکھا۔ اس باب میں ایسے ہی مرثیہ نگاروں کا تذکرہ ہے۔

ابو محمد

ابو محمد تحصیل دار مہاراجہ بنارس کو بھی انیسؔ مرحوم سے تلمذ تھا۔

''اب یہ بات رہی کہ یہ دونوں بزرگ (انیسؔ و دبیرؔ) ایسے (یعنی استادِ فن) تھے یا نہ تھے پس اگر یہ دونوں ایسے نہ ہوتے تو فی زمانہ اکثر صاحبِ فن جو کتب فن کا اچھی طرح درس دیتے ہیں اور عمل بہ مطابقت علم کرتے ہیں اور محل استعمال محاورات و الفاظ اچھی طرح جانتے ہیں، مثل جناب سیّد محمد محسن خاں صاحب ذوی[☆۱] القدر بہادر ساکن جون پور ڈپٹی کلکٹر الٰہ آباد اور جناب ابو محمد صاحب تحصیل دار مہاراجا بنارس وغیرہ وغیرہ شاگردانِ جناب میر انیسؔ صاحب لکھنوی مرحوم اور ان کے ماسوا بہت حضرات اساتذۂ فن کے نام کہاں تک لکھے جائیں گے گو یہ سب اپنی استادی کے زمانے میں ان کے کمال و استادی کے کیوں معترف رہتے اور اپنے اکتسابِ کمالات کو ان کی استادی سے کیوں منسوب کرتے۔''[☆۲]

مندرجہ بالا بیان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابو محمد نے فن مرثیہ گوئی میں انیس مرحوم سے صلاح لی اور زبان کے نکات ان سے سیکھے۔ ابھی تک ان کا کلام دستیاب نہ ہوسکا۔

آرزوؔ، حکیم سیّد بندہ رضا

حکیم سیّد بندہ رضا خلف سیّد حسن رضا بلگرامی (وزیر شاہ اودھ) کا سلسلۂ نسب

☆۱۔ کذا، ذوالقدر

☆۲۔ فیضؔ، سیّد محمد تقی لکھنوی، تقریظ مسکت شائستہ بہ جواب انتخاب نقص ناسخ

حضرت زید شہید سے ملتا ہے۔

آرزو کا سنہ ولادت ۱۲۷۸ھ[☆۱] ہے صرف ونحو منطق اور طب کی کتابیں لکھنؤ کے علما سے پڑھیں، اس زمانے میں لکھنؤ شعر وسخن کا مرکز تھا، وہ بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے۔

''جب طبیعت نے شعر وسخن کی طرف میلان کیا تو منشی محمد زکی صاحب زکی، بلگرامی اور شیخ امداد علی صاحب بحر لکھنوی کو اپنے کلام کا مشیر بنایا...

مرثیہ گوئی میں میر انیس کے شاگرد ہوئے، اکثر مجالسِ عزا میں لکھنؤ سے باہر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔''[☆۲]

تصانیف

ایک دیوان، تین واسوخت اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ غزلوں کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

ہوئی ایذا میں راحت یہ ہے احساں دشمنِ جاں کا
لب زخم جگر پر لی جو چٹکی لگ گیا کانٹا
زلیخا نے تو رسوائی میں کچھ باقی نہ رکھا تھا
خدا پردہ نہ رکھ لیتا اگر یوسفؑ کے داماں کا

☆

کیا ہم سے تم کو کام ہے غیروں کی لو خبر
ناخوش ہیں یا کہ خوش ہیں تمھاری بلا سے ہم

☆

نہ دیکھا اک نظر مڑ کر ادھر بے بارہا نکلے
بڑے ناآشنا نکلے بڑے تم بے وفا نکلے

☆۱۔ مطابق ۶۲-۱۸۶۱ء۔

☆۲۔ لالہ سری رام خمخانۂ جاوید، جلد اول، بار اول، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۰۸ء، ص ۴۱-۴۲

یہ کیا جب آؤ تو ہنستے ہوؤں کو تم رلا جاؤ
کرو وہ بات دل سے ایک عالم کے دعا نکلے

☆

بتوں کے دور میں اچھی بڑھی توقیر پتھر کی
جدھر دیکھو ادھر بِکنے لگی تصویر پتھر کی
نہ منھ سے بولتے ہو کچھ نہ سر سے کھیلتے ہو کچھ
ابھی کیوں آدمی سے بن گئے تصویر پتھر کی

ازلؔ، سیّد آغا حسن

مرثیہ گوئی میں وہ انیسؔ کے شاگرد تھے۔

مہدی حسن احسنؔ کے حقیقی نانا سیّد آغا حسن ازلؔ مغفور غزل میں میر وزیر علی صاحب صباؔ مرحوم کے شاگرد تھے اور مرثیوں پر انھوں نے اصلاح میر صاحب و مرزا صاحب و آغا صاحب (میر عشقؔ صاحب مرحوم) سے الگ الگ لی تھی اور کمال یہ ہے کہ ہر ایک استاد سے اجازت لے کر ایک کے بعد دوسرے کو مرثیے دکھائے تھے۔ کچھ مرثیے میر صاحب کو دکھائے پھر ان سے اجازت مانگی کہ حکم ہو تو کچھ اور مرثیے مرزا صاحب کو بھی دکھلا دوں اور ہر ایک نیک نفس پاک طینت نے نہایت خوشی سے اجازت بھی دے دی تھی۔ یہ وجہ تھی جو سب خاندانوں کے سرگروہ ممبر تشریف لاتے تھے اور سنا ہے کہ وہ مرثیے میر احسن صاحب کے والد مرحوم پڑھتے تھے اور صاف کہہ دیتے تھے کہ یہ مرثیہ میر صاحب کا یہ مرزا صاحب کا یہ آغا صاحب کا اصلاحی ہے۔ لکھنؤ میں یہ روایت مجھ سے بڑے بڑے آدمیوں نے بیان کی اور جناب مرزا اوجؔ صاحب قبلہ مدظلہ و میر حسین جان صاحب ساکن محمود نگر نے اس کی تصدیق فرمائی۔"☆

۴۔ حزیںؔ، محمد علی

حکیم محمد علی حزیںؔ کو بھی انیسؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ فخر الدین ناظمؔ

☆ افضل حسین ثابت، حیاتِ دبیرؔ، حصہ اوّل، باب ۷، ص ۱۲۷۔ ۱۲۸

کے ضمن میں ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ص۱۹ ''متعدد علما سے اُنھوں نے (ناظمؔ نے) علم حاصل کیا۔ فنِ شعر میں حکیم محمد علی حزیںؔ جو میر انیسؔ مرثیہ گو مرحوم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ ان سے مشورہ رکھتے ہیں۔'' ☆۱

سلام ☆۲

سرِ منبر جو مدحِ شاہِ خیبر گیر ہوتی ہے
کلام اللہ کی اے مومنو تفسیر ہوتی ہے

بیاں جس گھر میں ہوتے ہیں مصائب آلِ احمدؐ کے
وہاں پر آ کے گریاں مادرِ شبیرؑ ہوتی ہے

ہوا حر کے لیے وہ جو نہ تھا اس کے ارادے میں
یوں ہی ہوتا ہے جس کی رہ نما تقدیر ہوتی ہے

حسینؑ ابنِ علیؑ مہماں ہوئے ہیں قومِ بے دیں کے
عوض آب و غذا کے قتل کی تدبیر ہوتی ہے

کہا زینبؑ نے لاشِ شہ پہ بے گور و کفن تم ہو
خجل واللہ تم سے زینبؑ دل گیر ہوتی ہے

سرِ اقدس سناں پر ہے زمیں پر لاش بے سر ہے
نبی زادے کی امت میں یہی توقیر ہوتی ہے

یہ ظلم و جور کیسا ہے کوئی پرساں نہیں ہوتا
نبی کی آلِ طاہر قید بے تقصیر ہوتی ہے

کیا وعدہ وفا تم نے دیا سر راہِ مولا میں
مگر اب شام و کوفہ میں بھن تشہیر ہوتی ہے

☆۱۔ حکیم، محمد عبداللہ، یادگارِ حکیم، ۱۳۰۲ھ، ص ۳۳۸

☆۲۔ نوحہ جات حزیں، در مطبع اخبار آصفی، حیدرآباد دکن، رونق یافت، ۱۳۰۲ھ

مریضِ کربلا کانوں پہ جب غش کھا کے گرتے ہیں
تو گریاں چشم خوں آلود سے زنجیر ہوتی ہے
عذابِ قبر تو کیسا سوال اُس سے نہیں کرتے
کفن پر جس کے خاکِ پاک کی تحریر ہوتی ہے
رخِ انور کو جس دم دیکھتے تھے شاہ کہتے تھے
بعینہٖ یوں شہِ لولاک کی تصویر ہوتی ہے
حزیںؔ روضہ پہ سرورؑ کے مجاور ہو کے رہ جاؤ
رسائی بخت کرتے ہیں تو یہ تدبیر ہوتی ہے
چلو بس خاک ڈالو سیم و زر اور لعل و گوہر پر
وہیں پر خاک ہوجاؤ جہاں اکسیر ہوتی ہے

۵۔ خسروؔ، نواب حسن علی خاں

نواب حسن علی خاں کا شمار بھی انیس کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔[☆۱] نواب صاحب کے نہ تو مزید حالات معلوم ہوسکے اور نہ کلام ہی دستیاب ہوسکا۔

۶۔ ذکیؔ، مرزا محمد خاں

سخن[☆۲] شعرا میں مولوی عبدالغفور خاں نے ان کا نام مرزا محمد علی لکھا ہے نیز یہ بھی تحریر کیا ہے کہ میں نے انھیں کلکتے کے مشاعروں میں دیکھا ہے۔ یہ دو شعر ان کے ہیں:

مسیحا کی ہم نے زبانی سنا ہے
کہ بیمارِ الفت سنبھلتا نہیں ہے
نکلتا ہے دم ایسے پردہ نشیں پر
جو گھر سے بھی باہر نکلتا نہیں ہے

☆۱۔ رسالہ ارمغان، فرخ، دسمبر ۱۸۹۸ء
☆۲۔ مولوی عبدالغفور نساخ، سخن شعرا، ص ۲۰۱

مرزا محمد خاں لکھنوی کا شمار واجد علی شاہ کے عہد کے شاعروں میں ہوتا ہے۔
''شاگرد مولوی محمد بخش شہید و حضرت انیس۔'' ☆

نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

ہم غم سے جاں بہ لب تھے اور درد تھا جگر میں
منھ پھیر کر سدھارے ہنستے ہوئے وہ گھر میں

لب پر ہے نام تیرا ہے تو ہی تو نظر میں
سینے میں تو کبھی ہے اور ہے کبھی جگر میں

دیوانہ جان کر وہ کرتے ہیں ہوشیاری
دل چھین کر بھی میرا کہتے ہیں جاؤ گھر میں

دھیان اس کے ابروؤں کا ہے کعبے کی زیارت
معبود کا ہے جلوہ ہر دم مری نظر میں

ہم تیرے قد کے شیدا قمری کو سرو کا غم
ہوتا ہے فرق اتنا انساں میں جانور میں

ناسازیِ مسیحا جاں باز کی قضا ہے
تاریک ہے زمانہ اندھیر ہے نظر میں

قاتل سے مل نہ نکلا سرگشتہ جنوں کا
سر کٹ گیا ہے لیکن باقی ہے درد سر میں

ملکِ عدم کا جانا بارِ گناہ سر پر
گزرے گی اے ذکی کیا اس راہِ پرخطر میں

۷۔ سراج، سیّد سراج الدین احمد

سراج الدین احمد خلف سیّد مجیب الدین صفدر ساکن امروہہ۔
سراج ریاست بھوپال میں تھانہ دار اور تحصیل دار رہے۔ ''شعر گوئی میں میر

☆ لالہ سری رام، خمخانۂ جاوید، جلد سوم، بار اوّل، دلّی پرنٹنگ ورکس، دلّی، ۱۹۱۷ء، ص ۲۲۳

ببر علی انیسؔ کے شاگرد☆[1] تھے۔"

۱۳۰۵ھ☆[2] میں ان کا انتقال ہوا۔

ان کی تصانیف حسبِ ذیل ہیں۔

سراج العارفین، سراج المومنین اور زادِ غریباں

ان کے کلام کا نمونہ حاصل نہ ہوسکا۔

سراجؔ نے سید مصاحب بن سید رحمت علی امروہوی کے انتقال پر حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔

آں کہ مصاحب علی صاحب زہد و تقا
بود عزادارِ خاص بہرِ حسینِؑ ذکی
بست چو رخت از جہاں گفت سروش از سراجؔ
یکہ بہ سوئے ارم رفت مصاحب علی

۸۔ شیداؔ، حکیم محمد رسول

حکیم محمد رسول خاں بہادر خلف میر ہاشم علی خاں موہانی ۱۲۶۹ھ (مطابق ۱۸۵۲ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میر مظفر علی خاں اور حیدر علی خاں اکبر بادشاہ ثانی کے زمانے میں امرائے دربار تھے۔ حکیم صاحب کے بزرگوں کو فنِ طب سے شغف رہا۔ ان کے جدِامجد حکیم میر کاظم علی خاں بہادر اپنے زمانے کے حاذق طبیب گزرے ہیں۔ مہاراجا بڑودہ کے معالج تھے۔ حکیم محمد رسول بھی اس عہدے پر فائز رہے۔

شیداؔ نے مولوی غلام حسین کنتوری اور نعمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے علومِ رسمیہ میں استفادہ کیا۔ فنِ طب کے علاوہ شیداؔ کو علمِ ریاضی میں کافی مہارت تھی۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

شیداؔ نے "فنِ شعر گوئی میں انیسؔ مرحوم سے اصلاح لی۔ مرثیہ قصیدہ غزل کے

☆۱۔ برترؔ سید رحیم بخش، تاریخِ واسطی، مطبع ریاضی امروہہ، ص ۳۲۱

☆۲۔ مطابق ۱۸۸۸ء

علاوہ (انھیں) فن تاریخ گوئی سے خاص مناسبت تھی۔'' ☆

ایک سلام کے دو مشہور شعر ہیں۔

نہ ظالم نہ شاہِ زماں رہ گئے　　سلامی ستم کے بیاں رہ گئے
نکل آیا حر تیر سا فوج سے　　کماں دار کھینچے کماں رہ گئے

دوسرے سلام کا ایک شعر ہے:

غمِ حسینؑ میں دل داغ دار لے کے چلے
خزاں میں ساتھ ہم اپنے بہار لے کے چلے

شیدا کا ایک اور سلام نقل کیا جاتا ہے۔

رو بھرئی ہے ماتمِ سرور گھڑی گھڑی
اشکوں کے کر نثار تو گوہر گھڑی گھڑی
یاد آتا ہے جو برچھیاں کھانا حسینؑ کا
نیزے الم کے لگتے ہیں دل پر گھڑی گھڑی
عشرے کی شب قریبِ سحر سر سے خود بخود
جاتی ہے ڈھلکی بانو کی چادر گھڑی گھڑی
اصحابِ شاہ کرتے تھے میدانِ رزم میں
نعرہ بہ عشقِ سبطِ پیمبرؑ گھڑی گھڑی
بے کس سمجھ امام کو کس طرح ہائے ہائے
کرتی یورش تھی فوج ستم گر گھڑی گھڑی
اعدا پکارتے تھے جو ھل من مبارز
منھ دیکھتا تھا باپ کا اکبر گھڑی گھڑی
دریائے خشم ہوتا تھا جو دل میں موج زن
قبضہ کو تھام لیتا تھا اکبر گھڑی. گھڑی

☆ لالہ سری رام، خمِ خانۂ جاوید، جلد پنجم، بار اوّل (مرتبہ پنڈت برج موہن دتاتریہ)، ناشر، لالہ امیر چند کھنہ، علی پور روڈ، دہلی ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۵۔۱۳۶

زینب کے بیٹے کھاتے تھے جب رن میں برچھیاں
کہتی تھی کوکھ تھام کے مادر گھڑی گھڑی

عباس کا سکینہ کو تھا بس کہ انتظار
آتی نکل وہ خیمے سے باہر گھڑی گھڑی

سوکھی زبان ہونٹوں پہ یاں پھیرتے تھے شاہ
واں موج زن تھا چشمۂ کوثر گھڑی گھڑی

کہتے تھے شاہ دھیان ہے بہنا نماز میں
بس اب مجھے پکارو نہ خواہر گھڑی گھڑی

شمرِ لعیں نے شاہ کو جس سے کیا تھا ذبح
زینبؑ کو وہ دکھاتا تھا خنجر گھڑی گھڑی

زینب پچھاڑیں کھاتی تھیں، واں رن میں شاہ کا
لیتا تھا کروٹیں تنِ بے سر گھڑی گھڑی

خولی بہت جو پاتا تھا زینبؑ کو بے قرار
لاتا تھا شہ کا اس کے قریں سر گھڑی گھڑی

صغرا کے گھر میں خوں بھرا طائر جو رک گیا
کہتی تھی دیکھ سوئے کبوتر گھڑی گھڑی

لایا ہے کربلا کے شہیدوں کی یہ خبر
تڑپے ہے دیکھ کیا دلِ مضطر گھڑی گھڑی

شیداؔ☆ کو اب بلائیے یا شاہِ کربلا
ہے سخت جبر ہند میں مجھ پر گھڑی گھڑی

۹۔ عابد علی عابدؔ کے ایک مرثیے کا اجمالی جائزہ

عابد علی کمیدان پلٹن ذوالفقار حیدری کے کپتان تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا

☆ شیداؔ، سلام منقول از قلمی بیاض مملوکہ سیّد زاہد حسین صاحب سہارن پوری، بہ توسل جناب خلش پراصحابی، مندرجہ بالا سلام کے لیے دونوں حضرات کا شکرگزار ہوں۔

اسم گرامی میر مہدی علی تھا جن کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ عابدؔ نے ابتدائی تعلیم و تربیت وطن ہی میں پائی۔

آغاز جوانی سے شاعری شروع کی طبیعت تغزل کی طرف مائل تھی۔ شیخ امام علی سحرؔ سے اصلاح لیتے رہے۔ اسی دوران توفیقِ خداوندی معاون ہوئی اور عنانِ توجہ کو مرثیہ گوئی کی طرف موڑ دیا۔ ''میر انیسؔ مرثیہ گو فرماتے ہیں کہ مجھ سے اصلاح لی۔''٭۱

عابدؔ نے تغزل میں بہت کچھ لکھا تھا اور مرثیہ نگاری میں کافی ذخیرہ یادگار چھوڑا تھا لیکن اب تک ان کا کلام شائع نہ ہوسکا، اس لیے اس پر تفصیل سے تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔

اتفاق سے ان کی ایک بیاض مراثی مکتوبہ ۱۳۰۶ھ کا حوالہ فہرست (ص ۵۷۸) کتب خانہ نواب سالار جنگ حیدرآباد سے حاصل ہوا۔ اس میں صرف ایک مرثیہ ہے۔ جو ص ۲ سے شروع ہوا ہے اور حشمت علی نام کے کسی بزرگ نے لکھا ہے۔ یہ مرثیہ کتب خانہ مذکور٭۲ سے دستیاب ہوگیا اور ہم اس کا اجمالی خاکہ قارئین کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

اس مرثیے کا مطلع ہے، ''کو علی کے وصف میں قاصرِ زبان ہے۔'' اس مرثیے میں ۱۶۳ بند ہیں صرف ایسے منتخب بند نقل کیے جارہے ہیں جن سے مرثیے کی خصوصیات کا اندازہ ہوسکے۔

چہرہ

قصیدے کا آغاز تشبیب سے ہوتا ہے اور مرثیے کی ابتدا چہرے سے ہوتی ہے جس کی مدد سے مرثیہ نگار سامعین/ قارئین کو اپنے موضوع سے متعارف کراتا ہے، اندازِ بیان کی دل کشی اور رعنائی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ چہرے کا پہلا بند کو علی کے

٭۱۔ محسن، سید محسن علی، تذکرہ سراپا سخن، بار اول، مطبع عالیہ میکلوڈ روڈ، لاہور (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن) ناشر انجمن، ... ، لاہور، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۶۹

٭۲۔ اس مرثیے کے حصول میں اپنے محترم مربی سید اشفاق حسین صاحب ... کا احسان مند ہوں۔

بارے میں ہے جسے شاعر نے عرش بھی کہا ہے اور لامکاں بھی اس لیے کہ:

بند ۲

اس کوہ پر سدا گزرِ بوتراب ہے | ہر ذرّہ یاں کا آئینۂ آفتاب ہے
یاں کوہِ بوقبیس☆ کی مٹی خراب ہے | کرسی نشینِ فخر یہ عرش انتساب ہے

جائے نزولِ رحمت ربِ قدیر ہے
یہ جلوہ گاہِ نفسِ سراجِ منیر ہے

اس کوہ کا عکس اگر کوہِ قاف پر پڑجائے تو ہر فرشتہ اس کے طواف پر آمادہ ہوجائے جس مقام پر مولائے کائنات کے فیض کا ظہور ہو وہی تو اہلِ نجات کا قبلہ ہے رواق کے اندر جو پردہ پڑا ہوا ہے وہاں پنجہ سلطانِ لافتیٰ کا نشان ہے۔

بیتِ خدا کہوں تو نہیں کچھ خلاف ہے
دستِ خدا کا نقش محلِ طواف ہے

اگر اس مقام پر کسی عارف کا گزر ہوجاتا ہے تو اس پر رازہائے سربستہ عیاں ہوجاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو یہ تو کاشفِ رموزِ خدا کا مکان ہے نیم باؤلی کی صفت بھلا کس زبان سے بیان کی جاسکتی ہے۔ مریض اگر اعتقاد سے اس کا پانی پے تو وہ صحت مند ہوجاتا ہے۔ بیمار کے لیے یہ چشمۂ آبِ حیات ہے۔

دسویں بند سے اٹھائیسویں بند تک مرزا مہدی اقبال خوش بیان سلطانِ ذاکرین وشمیرِ زمانیاں کے متعلق ایک روایت نظم کی گئی ہے۔

بند ۲۹

ہوتا رہا ہے یاں گزرِ شاہِ کائنات
ظاہر ہوئے ہیں خلق پہ اس جائے معجزات
اس جا پہ حل ہوئی ہیں ہزاروں کی مشکلات
ہر ہر اسیرِ رنج نے یاں پائی ہے نجات

☆ مکے کے قریب ایک پہاڑ کا نام

یہ پادشاہِ افضل و عالی کا فیض ہے
جاری یہاں خدائے نصیری کا فیض ہے

ہم اس کوہ کی عظمت کے اس لیے قائل ہیں کہ یہاں مولائے کائنات کے قدم ہائے مبارک کے نشان پائے جاتے ہیں۔

اُس پاؤں کی ضیا سے ہے یاں نور جوش پر
بیتِ خدا میں تھے جو محمدؐ کے دوش پر

بتیس بند کے بعد مطلع ثانی ہے۔
چند بند نقل کیے جاتے ہیں جن میں حضرت علیؑ کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔

بند ۳۳

حیدرؑ کی ذات مثلِ خدا بے مثال ہے
خورشیدِ آسمانِ جمال و کمال ہے
مرأتِ قدرت و صفتِ لایزال ہے
دست و زبان☆[1] و چشم و رخِ ذوالجلال ہے
علم☆[2] خدا نبیؐ و علیؑ پر تمام ہے
وہ آخرِ رسل ہے یہ اوّل امام ہے

بند ۳۶

مضموں ہے یہ حدیث کا اے صاحبِ شعور
اشجار گر قلم ہوں سیاہی بنیں بحور
کاتب ہوں جن و انس ملک اور ہر ایک حور
افلاک کے ورق ہوں جو قرطاس ہو ضرور

☆۱۔ ید اللہ، لسان اللہ، عین اللہ، وجہ اللہ، یہ سب حضرت علیؑ کے القاب تھے۔
☆۲۔ حدیث کی طرف اشارہ ہے انا مدینۃ العلم وعلی بابھا (میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں)

ہو تکملہ نہ مدحِ شہِ نیک نام کا
یک جز رقم نہ وصف ہو کل کے امام کا

بند ۳۸

وصف سخا وجود و عبادت لکھوں میں کیا
ظاہر ہے وہ رکوع وہ بخشش کا ماجرا
کافی دلیلِ آئینہ فرقاں ہے برملا
برپا رکھی نماز کی انگشتری☆ عطا
یہ فخر طاعت اور شرفِ فیض وجود ہیں
یہ مظہر کمالِ صفات ودود ہیں

"کس کو خبر ہے ذاتِ علی کیا ہے کیا نہیں۔" اس لیے ان کی ثنا بشر سے بھلا کیوں کر ممکن ہوسکتی ہے۔ ان کی جود و سخا کے ڈنکے سارے عالم میں بج گئے۔ جس طرح وہ شجاعت میں لاجواب تھے اسی طرح صبر میں بھی وحیدِ عصر تھے۔ ان کی چند صفاتِ ظاہری کا بیان کرنا مقصد ہے جو ادراکِ عام کے مطابق ہوں۔ آج تک درِ خیبر اُن کی طاقت کی گواہی دے رہا ہے۔ بیر العلم میں اُنھوں نے شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ دنیا "انگشت بہ دنداں" ہوگئی۔

ان کی سخاوت کا تذکرہ عابد کی زبان سے سنیے۔

بند ۵۲

ذکرِ سخائے شاہ ہے بے حد و بے شمار
سائل کو ایک نان کے دی اونٹوں کی قطار

☆ انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوۃ ویوتون الزکوۃ وھم راکعون۔ (چھٹا پارہ، سورۂ مائدہ، آیت ۵۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمھارے مالک سرپرست بس یہی ہیں، خدا اور اس کا رسولؐ اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

مانگا کسی نے ایک تو اس کو دیے ہزار
راہِ خدا میں بک گئے خود آپ چند☆ بار
بھوکے بھی آپ رہ گئے بوذر کو زر دیا
اب اور کیا کہوں رہِ خالق میں سر دیا

سراپا

مرثیے کے تعمیری دور میں سراپے کو بھی مرثیے کے قوام میں شامل کرلیا گیا۔ اسے انیسؔ مرحوم کا فیض کہنا چاہیے کہ ان کے شاگردوں نے بھی اس موضوع پر خوب خوب گل کاریاں کیں بند ۵۷ سے بند ۷۶ تک عابدؔ نے حضرت علیؑ کا سراپا نظم کیا ہے جسے پڑھ کر شاعر کی مضمون آفرینی، تخیّل کی سحرکاری اور زبان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

نمونے کے طور پر چند بند پیشِ خدمت ہیں۔

بند ۵۹

بدرِ شبِ برأت ہے پیشانیِ سفید
یا نجمِ بخت آئینۂ طلعت امید
ابرو ہیں یا ہیں طاقِ حرم یا ہلالِ عید
قفلِ درِ علومِ الٰہی کی ہے کلید
قوسین گر کہوں تو یہ ادنیٰ کلام ہے
اعلیٰ ہیں یہ کہ چشمِ علیؑ پر مقام ہے

حلالِ مشکلات کے پیشِ نظر شاعر نے مولائے کائنات کی پیشانی اقدس کو آئینۂ طلعت امید نظم کیا۔ ان کے ابروئے مبارک کی تشبیہ طاقِ حرم سے نہایت موزوں اور معنویت سے بھرپور ہے۔

☆ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغا مرضات اللہ واللہ رئوف بالعباد۔ (دوسرا پارہ سورہ البقرہ، آیت ۲۰۶) (ترجمہ: اور لوگوں میں خدا کے بندے) کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں خداوند تعالیٰ ایسے بندوں پر بڑا ہی شفقت والا ہے۔

مسلمانانِ عالم ہلالِ عید دیکھنے کے بے حد مشتاق ہوتے ہیں، شاعر کے ذہن میں حضور اکرم ﷺ کی حدیث☆ محفوظ ہے۔ اس لیے تیسرے مصرعے میں حضرت علیؑ کے ابرو کو قفلِ درِ علومِ الٰہی کی کلید سے تشبیہ دی ہے۔

چوتھے مصرعے کے بعد بہ ظاہر اس موضوع پر کسی اضافے کی گنجائش نہ تھی لیکن انیسؔ کی شاگردی کا بھرم بھی رکھنا تھا، اس لیے توجیہ پیش کی۔

''اعلیٰ ہیں یہ کہ چشمِ علیؑ پر مقام ہے''

اگلے بند میں شاعر نے حضرت علیؑ کی چشمِ پاک کے لیے مختلف تشبیہیں استعمال کیں لیکن اُس کا شعور گواہی دے رہا تھا کہ وہ اپنا مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہا جب تک اس نے یہ نہ کہہ دیا کہ:

''چشمِ خدا ہے چشمِ خدا ہے یہ چشمِ پاک''

شاعر کے طرزِ نگارش کی عمدہ مثال ہے۔

بند ۶۱

مژگانِ شاہِ کون و مکاں ہے جہاں نواز
جنبش سے اس کی ہو درِ مقصود پل میں باز
ہے مردمک جو شانِ امامت سے سرفراز
مژگاں صف کشیدہ ہیں شکلِ صفِ نماز
مژگان و چشمِ پاک سے ظاہر یہ راز ہے
کعبے کے در پہ مجمعِ اہلِ نیاز ہے

مندرجہ بالا بند تلازمۂ الفاظ و استخراجِ معانی کی حسین مثال ہے۔ اچھوتی اور نادر تشبیہات دنائے کائنات کے حسبِ حال اُن کی خصوصیات کی مظہر ہیں۔ یہ مصرع، ''مژگانِ صف کشیدہ ہیں شکلِ صفِ نماز'' کس قدر معنویت سے بھرپور ہے۔

بیت شاعر کی آمد اور جودتِ طبع کی مرقع کشی ہے بلکہ الہامی شاعری کا نمونہ

☆ انا مدینۃ العلم و علی بابہا۔

کہنا چاہیے۔

بند ۲ے بھی نقل کیا جاتا ہے تا کہ تسلسل قائم رہ سکے۔

پنجہ وہ پنجہ زورِ قضا جس کے ہات میں
خیبر کے در کو توڑ دیا جس نے بات میں
ہیں انگلیاں بھی عقدہ کشا مشکلات میں
کہتے ہیں اس کو دستِ خدا کائنات میں
پنجے سے آسماں کی کمر کو جو تھام لیں
سیارے سب سکوت ثوابت سے دام لیں

دستِ خدا کا یہ اعجاز ہے کہ کائناتِ عالم اس کے اشارے کی منتظر رہتی ہے نہ تو باری تعالیٰ کی قدرت سے انکار ممکن ہے اور نہ دستِ خدا کی معجز نمائی سے۔

اللہ ری قوت دستِ خدا کی۔ خیبر کے در کو توڑنا تو معمولی سی بات تھی۔ اس کی طاقت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ:

پنجے سے آسماں کی کمر کو جو تھام لیں
سیارے سب سکوت ثوابت سے دام لیں

غضب کی بیت ہے... "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

رزمیہ شاعری کے موضوع کے پیشِ نظر ہیرو کی شمشیرِ آبدار اور اسپِ سبک رفتار کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

تلوار کی تعریف

قلم کا دل شق ہے اور اس کی زبان بریدہ، اس لیے تیغ براں کی تعریف کس طرح ہو سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر لاکھ زبانیں ہوں پھر بھی اس کی توصیف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؑ کی ذوالفقار قدرتِ پروردگار ہے۔ وہ پر اثر بھی ہے اور برقِ قہر بھی۔ اس تیغ قضا شکوہ، کی ہیبت کا سکہ شش جہت میں ہر ایک کے دل پر بیٹھا ہوا ہے،

فلکِ نجم پر مریخ اس کے جوہر دیکھ کر حیران ہے، کوہ و دشت بھی اس کی برش سے لرزاں ہیں۔

بند ۸۱

شمشیرِ حیدری کی صفت اب کروں میں کیا
بیر العلم، تبوک و احد، خانۂ خدا
بدر و حنین و خیبر و خندق ہر ایک جا
بے فتح پائے منھ نہ کسی جنگ سے پھرا
ہے تیغ لاجواب مگر کس کے واسطے
یہ واسطے علیؔ کے، علیؔ اس کے واسطے

مختلف معرکوں میں حضرت علیؔ نے شجاعت کے جوہر دکھائے، ایسے تمام مقامات اب تک ان کی بہادری کے گن گاتے ہیں۔ حسبِ ذیل مفہوم کو شاعر نے بیت میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

لافتی الا علی لا سیفِ الا ذوالفقار

بند ۸۲

جس دم کھنچی نیام سے شمشیرِ بوتراب
کفارِ بد سرشت کی مٹی ہوئی خراب
اونچی ہوئی تو چرخ بنا اطلس خراب
اتری جو نیچے آنچ سے مچھلی ہوئی کباب
پست و بلندِ دہر کی سیر ایک دم میں ہے
اک شور الحذر کا وجود و عدم میں ہے

کتنے براق مصرعے ہیں، ذوالفقار کی زد میں فلکِ کج رفتار بھی ہے اور تحت الثری بھی۔ پانچویں مصرعے میں شاعر نے اسی مفہوم کو نہایت سلیقے سے ادا کر کے دل

کش انداز میں توضیح کردی۔ کائنات کی بسیط فضائیں شور الحذر سے گونج رہی ہیں۔

تیغ آب دار متضاد خصوصیات کی حامل ہے۔ اس میں آب بھی ہے، اور آتش بھی یہ کبھی رعد ہے اور کبھی برق، جب دریا کی طرف اس کا گزر ہوا تو وہاں اس نے آگ لگا دی اس کی آب نے آتش کدوں کی آگ بجھا دی آج وہی تیغ:

بند ۸۴

دکھلا رہی تھی دہر میں نیرنگیاں ہزار
ماہی کی طرح بحر میں ماہی میں مثلِ خار
صحرا میں باغ بن گئی اور باغ میں بہار
تھی آگ وہ تنور میں اور آگ میں شرار
تھی ماہِ نو فلک پہ مہِ نو میں ضو تھی وہ
محفل میں شمع، شمع کے شعلے میں لو تھی وہ

تشبیہات کا ایک سمندر ہے جو امڈا چلا آرہا ہے۔ ایک سے ایک بہتر تشبیہ ہے جس میں رعنائی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی شاعر نے بند ۸۷ سے بند ۱۲۵ تک جنگِ خیبر کی تفصیل نظم کی ہے۔ ہر بند میں جوش وخروش ہے اور معرکۂ کارزا کی گھن گرج۔

خیبر کے پہلوانوں میں مرحب انتخاب تھا اور اپنے عہد کا افراسیاب۔

بند ۱۰۸

مشہور ملک ملک میں تھا اس شقی کا نام
رستم☆[۱] کو زال☆[۲] جانتا سہراب☆[۳] کو غلام
جب معرکے میں جنگ کے پڑ جائے اس سے کام
بہرام☆[۴] گور ڈھونڈے نکلے سامنے سے سام

☆۱۔ رستم ایران کا مشہور پہلوان جو زال بن سام کا بیٹا تھا اور زابلستان کا حاکم تھا۔
☆۲۔ (ف) صفت بوڑھا، سفید بالوں والا، رستم کے باپ کا نام۔
☆۳۔ رستم کا بہادر بیٹا۔
☆۴۔ ملک عراق کے ایک بادشاہ کا نام تھا جس کو گور کے شکار کا بہت شوق تھا، گور کے معنی قبر بھی ہوتے ہیں۔

تھا وہ سوار اک فرس بدنہاد پر
گویا کہ تپ چڑھی تھی کسی دیوزاد پر

شاعر نے تلمیحات کی مدد سے مرحب کو متعارف کرایا ہے، چوتھے مصرعے میں صنعتِ مراعات النظیر ہے۔ بیت مرحب کی ہیئتِ کذائی کی عکاسی کرتی ہے۔ فرس اور اسوار دونوں کی متحرک تصویر کشی ہے، یہ ہے اعجازِ شاعری۔

رجز

اس مرثیے سے رجز کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں تاکہ شاعر کی طبعِ رسا کا اندازہ ہوسکے۔

مرحب پہلوان کا رجز

مرحب پہلوان گھوڑا بڑھا کے صفِ جدال میں آگیا اور نعرہ کیا کہ میں شجاعوں میں بے مثال ہوں۔ عفریت و دیو میرے نام سے کانپتے ہیں۔ ترکِ فلک بھی میری حسام سے ڈرتا ہے۔

بند ۱۱۰

مرحب ہے میرا نام میں ہوں رستمِ زماں
اب آئے وہ کہ جس کو نہ ہوئے عزیز جاں
ملتی نہیں ہے تیغ سے میری کبھی اماں
یہ سن کے مسکرانے لگے شاہِ انس و جاں
فرمایا موت سر پہ ہے مت پُرغرور ہو
مرحب کہوں تو نام کا تیرے ظہور ہو

حضرت علیؑ کے رجز کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے تیور ملاحظہ فرمایئے۔

میں شیرِ کبریا ہوں نیستاں سے پوچھ لے
باندھا ہے دستِ دیو سلیمانؑ سے پوچھ لے

جانِ نبیؐ ہوں قومِ نبی جاں سے پوچھ لے
حیدرؑ ہے میرا نام شقی، ماں سے پوچھ لے
دستِ خدا، وحیدِ زماں اور ہے کوئی
پتھر میں گاڑ دے جو نشاں اور ہے کوئی

عابدؔ نے مرحب اور حضرت علیؑ کے رجز کے بند نظم کرنے میں ایک ماہرِ نفسیات کے فرائض انجام دیے ہیں۔ مرحب کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ وہ اپنے آپ کو رستمِ زماں تصور کرتا تھا۔ اس کے زعمِ ناقص میں اس کی تیغ کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا تھا۔

مرحب کے تکبر آمیز کلمات سن کر شاہِ انس و جاں مسکرائے اور اپنے چند القاب کی طرف اشارہ کیا شیرِ کبریا، دستِ خدا اور اپنا نام حیدر بھی بتایا۔

''ماں سے پوچھ لے'' اس لیے فرمایا کہ مرحب کی ماں کاہنہ تھی اور اس نے اپنے بیٹے کو منع کیا تھا کہ حیدر نامی پہلوان سے نبرد آزما نہ ہونا، ورنہ وہ تجھے قتل کر ڈالے گا۔ معرکۂ کارزار کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجیے۔

بند ۱۱۳

مرحب نے جب سنا رجز شاہِ بحر و بر
مانندِ خوک مست اٹھایا غضب سے سر
آتا تھا اس طرح سے تگاور☆ پہ وہ نظر
چلیِ زماں چڑھا ہوا ہے ایک کوہ پر
غصہ بھرا تھا دل میں جو اس نابکار کے
تیوری چڑھی سر پہ شہِ ذوالفقار کے

بند ۱۰۹ کی بیت ذہن میں محفوظ رکھیے پھر مندرجہ بالا بند کا چوتھا مصرع پڑھیے۔ شاعر نے تشبیہ میں کس قدر تحرکاری اور تخیل کی بلندی سے کام لیا ہے۔ مصرع بار بار پڑھیے اور شاعر کے طرزِ بیان کی داد دیجیے جس میں انیسؔ مرحوم کا رنگ جھلک رہا ہے۔

☆ (ف) تیز رو گھوڑا

بند ۱۱۴

مولا نے روکا لے کے سپر سر پہ اس کا وار
زیرِ سحاب آ گیا خورشیدِ روزگار
دونوں طرف سے ہونے لگے وار بار بار
تھا زلزلہ زمیں کو ہلا چرخِ بے مدار
اٹھی جو گرد معرکۂ کارزار سے
گردوں بنا تھا شیشۂ ساعت غبار سے

شاعر نے دوسرے مصرعے میں مولائے کائنات کو خورشیدِ روزگار سے تشبیہ دی ہے اور سپر کو سحاب سے۔ تیسرے مصرعے میں تیغ آزمائی اور ہاتھ کی صفائی کا تذکرہ ہے۔ چوتھے مصرعے میں معرکۂ کارزار کے اثرات کی کامیاب مرقع بکشی ہے۔ اس کے ربط سے بیت کی معنی خیزی سبحان اللہ۔

مرحب اور حضرت علیؑ نے ایک دوسرے پر متواتر وار کیے، رہواروں کی تگ و تاز سے میدانِ جنگ میں اس قدر گرد اٹھی کہ وہ آسمان تک پہنچ گئی۔ شیشۂ ساعت☆ سے ذہن پرانے زمانے کی طرف منتقل ہوتا ہے جب گھڑی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

حرب و ضرب کی شد و مد کے بیان کے بعد شاعر کو مفہوم کی تشنگی کا احساس ہوا، اس لیے اس نے رزم کے مفہوم کی مزید وضاحت کی۔

بند ۱۱۵

میداں میں وہ غبار وہ تیغِ شہِ زماں
بجلی میانِ ابر ہو جس طرح سے عیاں

☆ شیشۂ ساعت (ف) مذکر، شیشہ کے دو چھوٹے کوزوں کے منھ باہم ملا کر باریک سوراخ رکھ کر اوپر کے کوزے میں ریت بھر دیتے، وہ ریت ایک ایک گھنٹے میں نچلے کوزے میں آ جاتی ہے، پھر اسے الٹا کر کے رکھ دیتے اور اس طرح وقت معلوم کرتے، اسے "بالو گھڑی" بھی کہتے تھے۔

خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
ایک ساعت مثلِ ریگِ شیشۂ ساعت نہیں (ذوقؔ)

نعرے وہ جس سے شیر کے بھی ہوش ہوں پراں
گوشِ فلک میں جاتی تھی آوازِ الاماں
اک شورِ الحفیظ اٹھا تھا جہات میں
پڑھتے تھے سورہ رعد☆ کا سب کائنات میں

تاکہ وہ اس معرکۂ کارزار کے اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

یک بار ذوالفقار چلی شہ کے ہات سے
احسنت کی پکار ہوئی کائنات سے

تیغ کے کارنامے اور یداللہ کی قوت کا اعجاز۔ اللہ اکبر۔

بند ۱۲۰

مرحب کے سر پہ آئی جو تیغ قضا سپر
خود سر کے خود و سر سے کیا سینے میں گزر
سینے سے پھر میانِ کمر جب گئی ادھر
دو کر کے اسپ کو اتر آئی زمین پر
گزری زمیں سے اور پرِ روح الامیں کٹے
دستے گئی اجنہ کے زیرِ زمیں کٹے

ذوالفقار یداللہ کی برش دیکھ کر ملائک کانپنے لگے مہرِ افلاک خجالت سے سرنگوں ہوگیا۔ اس تیغ تیز نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے۔ آج وہی برسرِ پیکار ہے۔ متعدد بار وار ہوئے، اس لیے تلواروں کی جھنکار سے فضائے عالم گونج گئی۔

اسد اللہ کے لال کو جلال آگیا اور انھوں نے ذوالفقار کا ایک بھرپور وار کیا راکب (مرحب) اور مرکب کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد روح الامیں کے پر کٹے،

☆ له معقبات من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من امر اللہ۔ (تیرھواں پارہ، سورۂ رعد، آیت نمبر ۱۰)
(ترجمہ) آدمی کسی حالت میں ہو مگر اس کے لیے اس کے آگے، اس کے پیچھے اس کے نگہبان فرشتے مقرر ہیں جو خداوند تعالیٰ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

گاؤ سک دہل کر رہ گئی اور قلعہ خیبر فتح ہوگیا، اس کی تفصیل لکھنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد گریز ہے جو فن کاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

"لیکن نوشتِ حال شہادت کا ہے خیال"

عبدالرحمن ابن ملجم نے حضرت علیؑ کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے اپنی تلوار زہر میں بجھائی تھی۔ شبِ انیس ماہِ مبارک رمضان ۴۰ھ وہ مسجدِ کوفہ میں آکر سو رہا۔ حضرت علیؑ نے علی الصباح اذان کہی اور ابنِ ملجم کو بیدار کیا۔ جب حضرت علیؑ سجدے میں گئے تو اس شقی نے آپ کے سرِ اقدس پر وار کیا جو شگافتہ ہوگیا۔

بند ۱۲۷

پہنچو نجف اب کہ قیامت بپا ہوئی — سر پر سرِ رسولؐ کے شمشیر چل گئی
زخمی ہوا ہے سجدے میں اللہ کا ولی — بے اختیار روتے ہیں فردوس میں نبیؐ
گھر ہوگیا تباہ رسولِؐ انام کا
مسجد میں خوں بہایا☆ شقی نے امام کا

حسنین علیہما السلام جب مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت علیؑ کو خون میں غلطاں دیکھ کر اپنا دل پکڑ لیا۔ گلیم میں لپیٹ کر انھیں بیت الشرف لے گئے۔

بند ۱۳۳

القصہ گھر میں آئی سواری امام کی — حالت ہے غیر حیدرِؑ عالی مقام کی
خوں میں بھری ہے شکل شہِ خاص و عام کی — بے چین جاں ہے نفسِ رسولِؐ انام کی

☆ اس ضمن میں مرزا دبیر مرحوم کے اس مرثیہ سے ایک بند نقل کیا جاتا ہے جس کا مطلع ہے:

"اے روزہ دار وآہ و بکا کے یہ روز ہیں"

ماہِ مبارکِ رمضاں اور خدا کا گھر — تڑکا وہ نور کا وہ شبِ قدر کی سحر
پیشِ خدا وہ سجدے میں شیرِ خدا کا سر — اور ہائے تیغِ ظلم کی ضربت وہ فرق پر
فوارے خوں کے زخمِ جبیں سے بہا کیے
سجدے میں آپ ربی الاعلیٰ کہا کیے

بستر پہ ضعف میں شہِ عالی وقار ہیں
ازواج، بیٹے، بیٹیاں سب اشک بار ہیں

اسی درد و کرب کی حالت میں بقیہ شب گزری۔ بستم ماہِ رمضان کو حضرت کی بے ہوشی اور تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ پائے اقدس پر ورم آگیا۔ بیبیوں کو تشویش ہوئی، وہ آہ وزاری کرنے لگیں۔

بند ۱۴۸

آیا ذرا سا جب شبِ بستم وکیم میں ہوش
دیکھا کہ اشک بار ہیں سب بیبیاں خموش
روتی ہیں چپکے چپکے دلوں میں ہے غم کا جوش
آنسو بہا کے بولے یہ مولائے سرفروش
زینت طرازِ مسندِ خیر الورا کو لاؤ
لاؤ حسنؑ کو نائبِ مشکل کشا کو لاؤ

بعد ازاں آپ نے حضرت امام حسنؑ کو وصیتیں فرمائیں۔
حضرت عباسؑ کو امامِ حسینؑ کے سپرد کیا اور کہا:
''مولا حسنؑ ہیں سب کے یہ مولا تمھارے ہیں''

بند ۱۵۶

ظاہر یہ کہتے ہی ہوئے آثار احتضار — امت کی مغفرت کی دعا کی بہ اختصار
آیا پسینہ موت کا ماتھے پہ ایک بار — کلمہ پڑھا تمام ہوئے شاہِ ذی وقار
ایک بار رونے پیٹنے کا غلغلہ ہوا
سب سینہ زن تھے سر تھا ہر اک کا کھلا ہوا

ہر ست و اعلیتا کی پکار تھی حضرتِ کلثوم خاک اڑاتی تھیں۔ حضرت زینبؑ بے قراری کی حالت میں فرماتی تھیں کہ گھر ماتم سرا بن گیا ہے۔ اے میرے سرپرست

پدر ہائے یہ کیا ہوگیا۔

فضائے عالم سوگوار ہوگئی۔ رنج و محن اور حزن و ملال کائنات پر محیط ہوگیا۔

آخری بند ۱۶۳

کیا حالِ غسل و دفن لکھوں اب نہیں ہے تاب
عابد ہجوم غم سے ہے بس دل کو اضطراب
کر عرض ہو قبول دعا یا ابوتراب
مقبول☆[1] اس مہینے میں ہو جلد کامیاب
مولا مرے عزیزوں کی حاجت روا کرو
قائل☆[2] کے غضنفر☆[2] کے مقاصد ادا کرو

مندرجہ بالا مرثیے کے مطالعے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عابد مرثیہ گوئی میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ مرثیے میں مرقع نگاری بھی ہے اور جذبات کی عکاسی بھی، رزمیہ شاعری میں غضب کا جوش و خروش ہے، ہمہمہ ہے، طنطنہ ہے، اسلحہ جنگ سے واقفیت اور زبان پر قدرتِ کاملہ رکھنے کی وجہ سے معرکۂ جنگ کی مرقع کشی قابلِ رشک ہے۔

نادر تشبیہات و استعارات محاورات کے برمحل استعمال، پاکیزگی زبان یہ سب خصوصیات عابد کے کمال کی آئینہ دار ہیں۔

۱۰۔ عروج، نواب مرزا باقر علی خاں بہادر

نواب مرزا باقر علی خاں بہادر خلف اشرف الدولہ نواب حاجی مرزا محمد علی خاں بہادر رئیس شیش محل، لکھنؤ۔

☆۱۔ قائمِ مقبول عابد علی عابد کے صاحب زادے تھے۔

☆۲۔ قائل اور غضنفران کے قریب ترین عزیز ہوں گے۔

(نوٹ) مرثیے کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

"بتاریخ ۱۰ ماہ ذی قعدہ ۱۳۰۶ھ روز چہار شنبہ وقت قریب شام بہ خاطر حضرت میر اکبر حسین صاحب قبلہ المتخلص بہ کوکب قبلہ مدظلہ العالی نوشتہ شد۔" بہ خط حشمت علی

نواب صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۵۰ء ہے۔ اردو، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی اور روسی زبانوں سے وہ واقف تھے، ان کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی "میر ببر علی انیسؔ سے عروض سیکھا اور انھیں سے اصلاح بھی لی تھی۔"☆۱

۸/ر جمادی الاوّل ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۸/ر جنوری ۱۹۲۱ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، غیر مطبوعہ کلام میں ایک مثنوی شاہدنامہ ہے اور بہت سے سلام اور مرثیے ہیں (جو نایاب ہیں) نمونے کے طور پر غزل کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

قبول ہو کہ نہ ہو یہ نمازِ مغرب و صبح　　ہمیں تو شام و سحر اس کا ذکر کر لینا

☆

جہاں تک ہم سے ہو سکتا ہے ہم ایذا اٹھاتے ہیں
جہاں تک ان سے ہو سکتا ہے وہ بیداد کرتے ہیں
عروجؔ اس زلف و رخ کو دیکھنے سے دل بھرے کیوں کر
کہ ہم سیر بہارِ گلشنِ ایجاد کرتے ہیں

☆

بھولے سے بھی جو کرتا ہے صیاد ذکرِ گل
بلبل قفس سے سنتی ہے گردن نکال کے

۱۱۔ فردوسؔ، میر ولایت علی

"فردوس رائے بریلی کے رہنے والے تھے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیسؔ کے شاگرد تھے۔"☆۲ ۱۹۱۰ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

غزل کے چند شعر پیش کیے☆۳ جا رہے ہیں۔

چھوڑ کر تیرے آستانے کو　　اب کہاں جاؤں سر جھکانے کو

☆۱۔ اختر امروہوی فیضانِ انیسؔ، مطبوعہ سہ ماہی اردو، شمارہ نمبر ۳ و ۴، جلد ۴۹، ۱۹۷۳ء، ص ۲۶۵۔۲۶۶

☆۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، اردو مثنوی، شمالی ہند میں، ص ۶۷۷

☆۳۔ فردوس، رسالہ مخزن، لاہور، دسمبر ۱۹۱۰ء

بے وفاؤں سے روٹھ کر پچھتائے　　کوئی آتا نہیں منانے کو
طور جل جائے غش ہوں طالبِ دید　　عشق اتنا تو ہو دکھانے کو
روئی انجامِ گل پہ شبنم تر　　آئی جس دم صبا ہنسانے کو

فردوسؔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ حسبِ ذیل اشعار بھی اسی رسالے سے نقل کیے گئے ہیں۔

گدائے کو غمِ دنیا نہ دارد　　کسے کو ہمتِ مردانہ دارد
بیا فردوسؔ رندی کن کہ امروز　　بہ ساقی محتسب یارانہ دارد

۱۲۔ لطیفؔ، محمد لطیف

"یہ میر انیسؔ کے شاگردوں میں بہت قابلِ توجہ ہیں۔ ان کے ۱۶ مرثیے ذخیرۂ ادیب میں موجود تھے۔ میر سید علی مانوسؔ نے ادیب مرحوم کو بتایا کہ ان کا نام محمد لطیف تھا۔ لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج میں رہتے تھے، میر انیسؔ کے انتقال کے بعد میر نفیسؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ عشرۂ محرم میں حیدرآباد دکن کے کسی رئیس کے یہاں مجلسیں پڑھنے جاتے تھے۔ ذخیرۂ ادیب میں لطیفؔ کا سب سے مختصر مرثیہ ۱۱۵ بند کا اور سب سے طویل ۲۷۹ بند کا تھا، ایک مرثیہ ایسی بحر میں ہے جس میں غالباً لطیفؔ کے کسی معاصر کا مرثیہ نہیں ملے گا اور ممکن ہے، پیش رووں میں بھی نہ ملے۔

"سمندِ طبع رسائے عالی بلا کی سرعت دکھا رہا ہے"

کاغذاتِ ادیب میں لطیفؔ کا مندرجہ ذیل انتخاب موجود ہے۔

سچ ہے یکتائے زمانہ تھے انیسؔ اور دبیرؔ
سامنے ان کے نہ حاصل تھی کسی کو توقیر

☆

بندش ہے پاک صاف عبارت نفیسؔ ہے　　کیا جوشِ بحرِ فیضِ جنابِ انیسؔ ہے

☆

لطیف تم نے کہا نہ کیا کچھ مگر نہ اصلا کسی نے پوچھا
مزہ سخن کا تھا جن کے دم سے گئے جہاں سے وہ وادریغا

☆

ہزار افسوس گر نہ لٹتا ریاضِ خوش رنگ لکھنؤ کا
تباہ برگ خزاں کی صورت نہ ذی کمالوں میں کوئی ہوتا

یا

نہالِ باغ سخن کا ہرگز ثمر کسی جا نہ اب ملے گا
محیطِ لطف و سخا کا تم کو گہر کسی جا نہ اب ملے گا

مندرجہ ذیل بند سے معلوم ہوتا ہے کہ لطیف اس وقت تک ۳۷۰ مرثیے کہہ چکے تھے مگر معروف نہ تھے۔

کہے ہیں سہ صد و ہفتاد مرثیے تو مگر — یہ کیا سبب ہے کہ چکا سخن نہ مثلِ قمر
ہیں چند شخص کہ نظمِ حقیر لکھ لکھ کر — کسی طرف کا جو کرتے ہیں لکھنؤ سے سفر
وہ بے قصور مرے دل کو سوخت کرتے ہیں
بدل بدل کے تخلص فروخت کرتے ہیں☆[۱]

۱۳۔ مرتجؔ، سیّد حسن علی

سیّد حسن علی ولد سیّد نثار علی رسالہ دار شاہی لکھنؤ میر بسم اللہ شاعر کے بھانجے تھے۔ تعلقاتِ خاندانی کی بنا پر بیس سال کی عمر میں میر ببر علی انیسؔ کی خدمت میں پہنچے اور استفادہ کیا۔ ان کے بعد میر خورشید علی نفیسؔ کو اپنا کلام دکھایا۔☆[۲]

۱۴۔ معززؔ، سیّد محمد علی

سیّد محمد علی مکن پور ضلع کان پور کے رہنے والے تھے۔ مہاراجا پٹیالہ کے یہاں

☆۱۔ نیر مسعود، ڈاکٹر، گرامی نامہ، مؤرخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۸ء

☆۲۔ جناب افسر امروہوی، فیضانِ انیسؔ، شمارہ سہ ماہی اردو، ۳ و ۴، کراچی، ص ۳۶۸

ملازم رہے،" وہ شاگرد میر انیسؔ مرثیہ گو تھے۔"[1]

نمونۂ کلام

لکھتے لکھتے اڑ کے پہنچا ہاتھ پر اس شوخ کے شوق نامہ کیا مرا بالِ کبوتر ہوگیا

☆

ہم نے دیکھی نہ آنکھ بھر شبِ وصل کدھر آئی، گئی کدھر شبِ وصل

۱۵۔ ملولؔ، میر جعفر علی

"ذخیرۂ ادیبؔ کی ایک قلمی بیاض میں میر جعفر ملولؔ کا ایک سلام ہے۔

مطلع

سلامیِ شہ کی یہ بزمِ عزا ہے مقامِ گریہ و آہ و بکا ہے

مقطع

ملولؔ اب تو ہوا مداحِ شبیرؑ تجھے محشر کے دن کا خوف کیا ہے

سلام کے آخر میں لکھا ہے، "تمت تمام شد یک پاس روز آمدہ بود ۱۲۵۳ھ[2] روز شنبہ۔" اس کے بعد کسی اور کے ناپختہ خط میں لکھا ہوا ہے، "ایں سلام گفتۂ میر جعفر ملولؔ اصلاح میر انیسؔ۔"[3]

ملولؔ کو مرثیہ گوئی میں انیسؔ مرحوم سے تلمذ تھا، اس کی تصدیق حسبِ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"واضح رہے کہ میر سید حسین صاحب عرف میر حسین جان صاحب کے خسر مرحوم مسمّی میر جعفر علی صاحب کہ میر (انیسؔ) صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ انھوں نے

☆۱۔ نساخ مولوی عبدالغفور، تذکرہ سخن شعرا، بار اول، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ، رمضان شریف ۱۲۹۱ھ (مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء، ص ۲۵۰

☆۲۔ مطابق ۳۸۔۱۸۳۷ء

☆۳۔ نیر مسعود، ڈاکٹر، گرامی نامہ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۸ء

برسوں کی جستجو میں کلیات میر صاحب ہی سے ایک سو پانچ مرثیے جمع کیے تھے۔"[☆۱]

۱۶۔ ناظمؔ

"ناظمؔ کا شمار بھی انیسؔ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام اور حالات کا علم نہ ہوسکا۔"[☆۲]

۱۷۔ یونسؔ، سیّد علی

"سیّد علی لکھنوی شاگرد میر ببر علی انیسؔ کے حالات بھی نہ مل سکے اور کلام بھی دستیاب نہ ہوسکا۔"[☆۳]

ان کی وفات کے بارے میں مندرجہ ذیل دو قطعات موصول ہوئے ہیں۔

(۱)

اوّلیں ماہِ جمادی بست و چارم روز جمعہ
حیف یونسؔ مرد شاگردِ انیسؔ آلِ نبی
نام و وصف و سالِ مرگش خامۂ جعفر نوشت
مدح گو اہلِ ولا خلد آشیاں سیّد علی

۱۳۳۱ھ

(۲)

شد بہ شہر منجمیں عالی حسب سیّد علی (۱۳۳۱ھ)
داشت طبع صاف شاگردِ انیسؔ باوقار (۱۹۱۳ء)
حسن تاریخی ببیں اے عیب پوشِ اہلِ فن
مرگِ یونسؔ اوّلیں جمعہ جمادی بست و چار[☆۴] (۱۳۱۳ھ)

(سمت ۱۹۷۰ء)

☆۱۔ سردار مرزا، رد واقعات انیسؔ، اصح المطابع، لکھنؤ، ص ۱۶

☆۲۔ میر علی احمد ولد میر علی محمد عارف مرحوم بہ حوالہ ڈاکٹر نیر مسعود گرامی نامہ مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۸ء

☆۳۔ افسر امروہوی، فیضانِ انیسؔ، مطبوعہ سہ ماہی اردو شمارہ نمبر ۳ و ۴، جلد ۴۹، ص ۴۷

☆۴۔ نواب سیّد محمد جعفر علی خاں، مجموعہ تواریخ، دفتر تاریخ، حصہ ششم، مطبوعہ نظامی ہند پریس، فتح گڑھ، ۱۹۱۶ء بحوالہ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب گرامی نامہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۷۸ء

مندرجہ بالا قطعات حسبِ فرمائش حکیم پیارے صاحب متوطن کان پور کہے گئے تھے۔ پیارے صاحب حکیم سیّد محمد اصغر جعفری نعمت اللّٰہی کی عرفیت تھی۔ ان قطعات کو پڑھ کر اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یوسؔ مرثیہ گوئی میں میر انیسؔ سے تلمذ رکھتے تھے۔

مرثیہ خوانی میں میر صاحب کے شاگرد

مرثیہ خوانی

عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے شعرا نے مختصر مرثیے غزل یا قصیدے کے طرز پر لکھے جو بعد میں چو مصراعی ہوگئے۔ اُس زمانے میں مرثیہ کا مفہوم رونا یا رلانا تھا۔ اس کے پیشِ نظر چند اشخاص پر درد لہجے میں نوحے یا سوز کے طرز پر مرثیے پڑھتے، مرثیہ خواں کے بازو چوتھا مصرع دہراتے تھے۔ پر سوز لہجے اور آوازوں کی ہم آہنگی سے سامعین کے دلوں پر حزن و ملال کی کیفیت طاری ہوجاتی اور وہ اشک بار ہوجاتے تھے۔ دہلی میں قصہ خوانی کا رواج ہوا، اس ضمن میں فضلی☆ کی کربل کتھا کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں بارہ مجلسیں ہیں اور پانچ فصلیں ہیں۔ اس کتاب میں نثر اور نظم دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ فضلی نے بھی چو مصراعی مرثیے لکھے جو بہت پسند کیے گئے۔

مشہور ہے کہ چند افراد اشعار یا بند، ہم آہنگ ہوکر پڑھتے رثائیت، خلوص اور عقیدت کی وجہ سے مآلِ مجلس حاصل ہوجاتا۔

مربع کی شکل بھی قصہ خوانی کے لیے مقبول ہوئی، سکندر اور سودا کے عہد سے

☆ فضلی، فضل علی، کربل کتھا، بار اوّل، مولف (مرتبین مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین احمد) مطبع دیال پرنٹنگ پریس، دلی، ناشر ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، اکتوبر ۱۹۶۵ء۔

نوٹ: فضلی نے کربل کتھا ۱۱۴۵ھ (مطابق ۱۷۳۲ء) میں تحریر کی اور اس پر ۱۱۶۱ھ (مطابق ۱۷۴۹ء۔۱۷۴۸ء) میں نظرِ ثانی فرمائی۔ ۱۹۶۵ء میں وہ شائع ہوئی۔

مرثیے کی ہیئت مسدس متعین ہوئی، اس وقت تک سوز خوانی کا رواج تھا، اسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب دھنیں بھی منتخب کی گئیں۔

مرثیے کے تعمیری دور میں تحت اللفظ خوانی کا رواج ہوا، اس ضمن میں میر ضمیر اور میر خلیق کی مساعی قابلِ ذکر ہیں۔

"اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کی ابتدا میں میر ضمیر نے مرثیہ نگاری اور تحت اللفظ خوانی ایجاد کر کے ڈرامے اور اداکاری کے فن میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تو سارا لکھنؤ چونک اٹھا...

... میر ضمیر کے مرثیے اور خوانندگی میں رزم کی گمک اور تلوار کی چمک نے سارے لکھنؤ کو اپنی طرف متوجہ کیا، ان کے شاگرد میرزا دبیر ہوئے اور اپنے عہد میں وہ عزت پائی کہ ایک شاہی مجلس میں پڑھتے ہوئے شگیرے کے کسی حصے سے دھوپ، ان کے چہرے پر آنے لگی، یہ دیکھ کر خود شاہِ اودھ منبر کے پاس چتر لے کر کھڑے ہوگئے اور مرزا صاحب کو قسم دی کہ، "آپ کو صاحبِ منبر کی قسم، اسی طرح پڑھتے جائیے" جب تک شگیرہ درست نہیں ہوا، شاہِ اودھ چتر لیے منبر کے پاس کھڑے رہے۔"☆

شاہانِ اودھ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی ذریعۂ عزت بن گئی۔ میر خلیق کے فرزند میر انیس نے بیس پچیس برس کی عمر تک اپنے والدِ ماجد کی نگرانی میں مشقِ سخن کی۔ اس زمانے کی مجلسوں میں شریک ہوئے، ان کے بعد منبر پر گئے۔

انھوں نے فنِ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو بامِ عروج تک پہنچا دیا، ان کے انتقال پر مرزا دبیر نے بے مثل تاریخ کہی۔

"طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس"

مرثیہ خوانی ایک فن ہے جس کے لیے ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور فطری صلاحیت کی بھی۔ اکتسابِ فن استاد کا رہینِ منت ہوتا ہے جو فن کے رموز اپنے شاگردوں کو سمجھاتا اور بتاتا ہے۔ اس ضمن میں چند عمومی اشارات پیشِ خدمت ہیں۔

☆ صفدر آہ، ڈاکٹر، فردوسِ ہند، ص ۵۵

ا۔ حافظہ

مرثیہ خواں کے لیے قوتِ حافظہ کی بڑی اہمیت ہے۔

مرثیہ خواں کو مرثیہ زبانی یاد ہو تو بہتر ہے یا اس کے ذہن میں مرثیے کے اکثر بند محفوظ ہوں یا بند کا پہلا مصرع دیکھ کر اسے پورا بند یاد آجائے۔ مثلاً:

مطلع "یا رب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر"

بند

یا رب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر ۔۔۔ اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر ۔۔۔ گم نام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلم رو سے نہ جائے

یا مصرعے کا پہلا لفظ دیکھنے کے بعد اسے پورا مصرع یاد آجائے۔ مثلاً بہ خدا،

مصرع۔ "بہ خدا فارسِ میدانِ تہور تھا حر۔"

قوتِ حافظہ کی مدد شاملِ حال ہو تو الفاظ اور مصرعوں کی صحیح طریقے سے ادائگی ہو سکے گی۔

۲۔ مصرع کے ٹکڑے کرنا

مصرع کی صحیح ادائگی کے لیے اس کے ٹکڑے کرنا ضروری ہیں یعنی مصرعے کے چند فقروں میں وقفہ ہو اور انھیں موزوں لہجے سے ادا کیا جائے تاکہ سامعین مرثیہ یا سلام کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکیں مثلاً انیس مرحوم کا یہ بند اس طرح پڑھیے۔

خود شیر ہے، جد شیر، چچا شیر، پدر شیر
نعرے ہیں جدا شیر کے، دل شیر، جگر شیر
پلکیں ہیں اگر شیر کا پنجہ تو نظر شیر
کیوں کر نہ ہو اس طرح کے شیروں کا پسر، شیر

ٹلتے نہیں میداں سے، یہ پیشہ ہے انھیں کا
کہتے ہیں نجف جس کو، وہ بیشہ ہے انھیں کا

مونس کے مشہور سلام کا مصرع ہے۔

جہاں میں آئے نحیف و نزار بن کے چلے
ہوا چمن کی یہ بگڑی کہ خار بن کے چلے
جہاں میں آئے (وقفہ) نحیف و نزار بن کے چلے
ہوا چمن کی یہ بگڑی (وقفہ) کہ خار بن کے چلے

"واقعاتِ انیس" میں احسن نے کسی رئیس زادے کا تذکرہ فرمایا ہے جو انیس مرحوم سے خوانندگی سیکھنے کے خواہش مند تھے۔

انیس مرحوم نے حسبِ ذیل مصرع کئی مرتبہ پڑھ کر بتایا لیکن رئیس زادے اسے ادا کرنے سے قاصر رہے۔

"کھینچے جو کماں دے نہ اماں چیلِ دماں کو"

اس مصرعے کی صحیح ادائیگی کے لیے تکرارِ قافیہ پر وقفہ ضروری ہے۔

کھینچے جو کماں   دے نہ اماں   چیلِ دماں کو

انیس کے ایک شاگرد عابد علی عابد کے مرثیے☆ سے ایک بند پیشِ خدمت ہے جس میں مصرعے کے ٹکڑے کردیے گئے ہیں۔

جس دم کھنچی نیام سے   شمشیر بوتراب   کفار بدسرشت کی   مٹی ہوئی خراب
اونچی ہوئی   تو چرخ بنا اطلس خراب   اتری جو نیچے   آنچ سے پگھل ہوئی کباب
پست و بلند دہر کی سیر   ایک دم میں ہے
اک شور الحذر کا   وجود و عدم میں ہے

۳۔ رخ سے مصرع کی ادائیگی

بعض مصرعے ایسے ہوتے ہیں جن کی ادائیگی کے لیے ایک سے زائد

☆ عابد، مطلع "گو علی کے وصف میں قاصر زبان ہے" بند ۸۲

اندازِ بیان اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اسی کو رخ کہتے ہیں، ایک مصرع ایک مرتبہ سے زائد پڑھا جاتا ہے اور نئے معانی کا حامل ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت کے لیے انیس مرحوم کی ایک مشہور رباعی پیشِ خدمت ہے۔

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

چوتھا مصرع بار بار پڑھیے چشم و ابرو کے اشاروں سے۔

(الف) کیا کیا دیکھوں۔ کائنات کی کن کن چیزوں کا مشاہدہ کیا جائے۔
(سوالیہ لہجے میں پڑھیے)

(ب) کیا کیا "خداوند تعالیٰ کی قدرت کے لاکھوں جلوے ہیں۔"
(حیرت و استعجاب کے لہجے میں پڑھیے)

(ج) کیا کیا اللہ کیسے کیسے حسین مناظر ہیں (محویت کے عالم میں پڑھیے)

(د) کیا کیا جلووں کی یہ فراوانی اور رعنائی اور صرف دو آنکھیں، (اپنی بے بضاعتی کا اظہار کرتے ہوئے پڑھیے)

۴۔ لہجہ

انسان کے دل میں مختلف اوقات میں مختلف جذبات موج زن ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی اس پر خوشی اور مسرت کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کبھی وہ رنج و غم سے دوچار ہوتا ہے، کبھی وہ غصے سے مغلوب ہوجاتا ہے اور کبھی وہ اظہار نفرت پر مجبور ہوجاتا ہے، زبان اظہارِ خیالات کا ذریعہ ہے جس میں لہجے کو بہت دخل ہے، جب کسی انسان پر مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں تو اس کے لہجے میں تغیر پیدا ہونا فطری امر ہے۔ اسی طرح سوال کا لہجہ الگ ہے، جواب کا لہجہ علیحدہ ہے۔ کبھی وہ کسی مسحور کن سماں کو دیکھ کر عش عش کرنے لگتا ہے اور کبھی دل خراش منظر اُس کے کلیجے کو پاش پاش کردیتا ہے۔ غرض

جذبات اور خیالات کا اظہار کرتے وقت انسان کا لہجہ بھی بدلتا رہے گا۔ اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ لہجے کو بیان میں کلیدی حیثیت حاصل ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ:

بیاں کی ہوتی ہے توضیح چشم و ابرو سے
فقط زباں ہو تو چتون کا کام کر نہ سکے
(فارغؔ)

مرثیہ خواں کا فرض ہے، ''چشم و ابرو سے مختلف تاثر پیدا کرنا چتون سے یکے بعد دیگرے متضاد جذبات کے اظہار پر قدرت حاصل کرنا، دلی جذبات کے مطابق آنکھوں میں اثر لانا، چشم و ابرو کی حرکت میں حسن پیدا کرنا۔''☆۱

مرثیہ ڈراما نہیں ہے لیکن مرثیہ خوانی میں ایک حد تک ڈرامائی انداز کا ہونا ضروری ہے، اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ ڈرامے کی ایکٹنگ (اداکاری) مرثیے کی اداکاری سے مختلف ہوتی ہے، مرثیہ خوان چہرے کے تاثرات اور معمولی اشارات سے اپنے فرائض سے بہ خوبی عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ ڈرامے کی اداکاری، رقص اور موسیقی میں بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن بھاؤ بتانے سے منبر اور صاحبِ منبر کا وقار مجروح ہوجاتا ہے۔

''مرزا دبیرؔ کی بابت مشہور ہے کہ فطری طور پر کہیں خود بہ خود ہاتھ اٹھ جاتا تھا تو اٹھ جاتا تھا ورنہ منبر پر بیٹھ کر بتلانے کو وہ عیب یا گناہ جانتے تھے، آنکھ و ابرو کا اشارہ بھی اسی قدر ہوتا تھا، جتنا باتوں میں ہوتا تھا۔''☆۲

خوانندگی میں ''میر انیسؔ نے اپنے والدِ بزرگوار ہی کا تتبع کیا، یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے سب کام نکالتے تھے۔''☆۳

☆۱۔ صفدر آہ، ڈاکٹر، فردوسِ ہند، ص ۷۸

☆۲۔ افضل حسین ثابت، حیاتِ دبیر، حصہ اول، باب ۳، ص ۵۵

☆۳۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ اردو ادب، ناشر عشرت پرنٹنگ ہاؤس، لاہور، ص ۳۲۰۔۳۲۱

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آواز کے زیر و بم اور اعضا کی حرکات میں ایک قسم کا ربط ضروری ہے، انسان کا چہرہ آئینہ ہے جو اُس کے جذبات و خیالات کی عکاسی کرتا ہے، اس لیے مرثیہ خواں کے چہرے سے motions یعنی حرکات وسکنات کی صحیح طور پر ادائیگی ضروری ہے اور یہ بھی کہ چشم و ابرو کی حرکات میں حسین امتزاج ہو اور ہم آہنگی بھی۔

انیسؔ مرحوم اور ان کے شاگردوں کے کلام سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں تاکہ مندرجہ بالا بیان کی وضاحت ہو سکے۔

چہرہ انسان کی قلبی واردات اور دلی کیفیات کا مظہر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ابرو کے بارے میں مرثیہ گو شعرا کے خیالات پیشِ خدمت ہیں، مرثیہ نگاروں نے ابرو کی تشبیہات میں بڑی جدت سے کام لیا ہے۔

ابرو

چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

ابرو نہیں ہیں چشمِ مروّت خصال پر
حیدرؑ کی ذوالفقار ہے حمزہؑ کی ڈھال پر
(انیسؔ مرحوم)

مرثیہ خوان ابرو کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرائے، اس کے بعد ہاتھ کے معمولی اشارے سے یہ ظاہر کرے کہ ذوالفقار رکھی ہوئی ہے، ڈھال کا اشارہ آنکھ کی طرف کرے تاکہ مفہوم واضح ہو سکے۔ نفیسؔ مرحوم نے حضرت علی اکبرؑ کا سراپا نظم کرتے وقت ابروئے کشیدہ کو خمِ شمشیر سے تشبیہ دی۔

"ابروئے کشیدہ خمِ شمشیر سے بہتر"

مرثیہ خواں ابرو چڑھا کر اس مصرعے کو پڑھے اور اپنے ہاتھ سے ابروئے کشیدہ کی طرف اشارہ کرے۔

تیور

نظر، چتون اور نگاہ کا انداز۔

پسرِ سعد نے جب حضرت علی اکبرؑ کو اپنے لشکر میں شامل ہونے کی دعوت دی، اُس وقت کی کیفیت مونسؔ نے یوں نظم کی۔

کانپا یہ سخن سنتے ہی شہزادۂ ذی جاہ
پیدا ہوا تیور سے جلالِ اسد اللہ

پہلا مصرع پڑھتے وقت مرثیہ خواں اپنے اوپر غصّے کی کیفیت طاری کرے اور اپنے بدن کی جنبش سے اس غصّے کا اظہار کرے۔ دوسرے مصرعے میں غصہ عروج پر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی نگاہِ غیظ سے غصّے کے تاثرات کا اظہار کرے۔

چیں بہ جبیں ہونا

تیوری پر بل ڈالنا، ترش رُو ہونا۔
حضرت علی اکبرؑ کے غصّے کے بارے میں مونسؔ نے یوں فرمایا:

غصّے میں جو وہ شیرِ ژیاں چیں بہ جبیں ہے
ہر ایک شکن غیرتِ آئینۂ چیں ہے

مرثیہ خواں کا فرض ہے کہ غصّے کی حالت میں وہ اپنی پیشانی پر شکن ڈالے تاکہ مصرع صحیح طریقے سے ادا ہو سکے۔ مرثیہ خواں کو چاہیے کہ اپنی روح پر وہ کیفیت طاری کرے جس کی وہ ترجمانی کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ خوانندگی کا حق ادا کر سکے۔
مرثیہ گو شعرا نے نظرِ غیظ کی مختلف کیفیات نظم کی ہیں۔

نظرِ غیظ

انیسؔ مرحوم نے امامِ حسینؑ کی نظرِ غیظ کو 'قہرِ خدا' کہہ دیا۔
''شہ کی نظرِ غیظ تھی یا قہرِ خدا تھا''
مرثیہ خواں اپنے چہرے سے انتہائی غصّے کا اظہار کرے، قہرِ خدا کائنات کی تباہی کا باعث ہوتا ہے، یہی اثر امامِ حسینؑ کی نظرِ غیظ کا ہے۔
مونسؔ نے بھی حضرت علی اکبرؑ کے غصّے کی نظر کے تاثرات نظم کیے ہیں۔

جنگاہ کو جب تکتے ہیں غصّے کی نظر سے
تلوار تڑپ کر نکل آتی ہے کمر سے!

مرثیہ خواں غصّے کی نظر سے میدانِ جنگ کی طرف دیکھے اس کے بعد نیام کی طرف دیکھے۔ انگلی سے اشارہ کرے جیسے تلوار میان سے نکل رہی ہو۔

نفیسؔ مرحوم نے امامِ حسینؑ کی نگاہِ قہر کے بارے میں یوں نظم فرمایا۔

دیکھی نگاہِ قہر جو حیدرؑ کے لال کی
جنبش ہوئی زمین کو دشتِ قتال کی

مرثیہ خوان دشتِ قتال کی طرف غیظ آلودہ نظروں سے دیکھے اور ہاتھ سے یوں جتائے گویا رن کی زمین کو جنبش ہو رہی ہے۔

مرثیہ خواں کا فرض ہے کہ جذبات، خیالات، تفکرات اور چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیات کو ڈرامائی انداز سے ادا کرے، اس ضمن میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اس کی خوشی جو تھی کہ ملی اب رہِ ثواب
چہرے کا رنگ سرخ ہوا مثلِ آفتاب
(نفیسؔ)

مرثیہ خواں کو چاہیے کہ مندرجہ بالا شعر اس طرح پڑھے کہ اس کے چہرے سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہو۔

کبھی چہرہ غصّے کی وجہ سے بھی سرخ ہو جاتا ہے۔

غصّے میں سرخ ہے رخِ روشن کا ہے یہ حال (فارغؔ)

مرثیہ خواں کو چاہیے کہ مندرجہ بالا مصرع پڑھتے وقت اپنے چہرے پر غصّے کے تاثرات پیدا کرے، غیظ و غضب کا جذبہ طاری کرے او نفسیات کا سہارا لیتے ہوئے چہرے پر سرخی کے آثار نمایاں کرے۔

غیظ و غضب کی بھرپور مثال

حضرت حبیب ابن مظاہر بہت ضعیف اور مسن واقع ہوئے تھے لیکن

جذبۂ مودّت اور شوقِ شہادت سے سرشار معرکۂ کارزار کے لیے یوں آمادۂ پیکار ہوئے۔

ہاتھوں سے یوں چڑھائے وہ ابروئے بے مثال
پٹی جبیں پہ کھینچ کے باندھی بہ صد جلال
پلکیں اٹھیں اُبل پڑیں آنکھیں وہ لال لال
تیوری چڑھی لرزنے لگا عرصۂ قتال
خطِ نظر کھنچی ہوئی شمشیر بن گیا
چہرہ خدا کے قہر کی تصویر بن گیا
(فارغ)

مندرجہ بالا بند کو ادا کرنے کے لیے ڈرامائی انداز اور صوتی اداکاری کی سخت ضرورت پڑے گی۔ مرثیہ خواں کو چاہیے کہ وہ ہاتھ سے ابرو کی طرف اشارہ کرے پھر غصّے کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھوں سے یوں بتائے گویا وہ اپنی پیشانی پر پٹی باندھ رہا ہو پلکوں کو ذرا سا بلند کرے، ابروؤں پر بل ڈال لے اور غصّے کی کیفیت طاری کرے، ایسا معلوم ہو کہ سرخ سرخ آنکھیں ابل پڑی ہوں (داخلی کیفیات کے پیشِ نظر) بعد ازاں مرثیہ خواں اپنی تیوری پر بل ڈالے اور میدانِ کارزار کی طرف اشارہ کرکے بتائے کہ اس کو غضب ناک دیکھ کر لشکرِ مخالف دہشت کی وجہ سے خوف زدہ ہوگیا (اپنے اوپر خوف اور دہشت کی کیفیت طاری کرے) ہاتھوں کی جنبش سے بتائے کہ رزم گاہ میں تزلزل سا پیدا ہوگیا۔

اللہ رے جلال کی خطِ نظر کھنچی ہوئی شمشیر کے اثرات کا حامل ہے،مرثیہ خواں اپنے چہرے سے انتہائی غصّے کے آثار کا اظہار کرے اور ہاتھ کے اشارے سے کھنچی ہوئی شمشیر کی تصویر سامعین کے سامنے پیش کرے، غیظ و غضب کی حالت میں وہ اپنے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کرے کہ غصّے کی لہر نے کائنات عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ہر چیز مائل بہ تباہی ہے۔

کل من علیہا فان

مندرجہ بالا اشارات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرثیے کے مختلف اجزائے ترکیبی کی ادائیگی کے لیے حسبِ ذیل امور بھی قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ چہرہ

چہرہ مرثیے کا تعارف ہوتا ہے، اس لیے اسے مدھم آواز میں ادا کرنا چاہیے، ''مرثیے کے مطلع کا پہلا مصرع ایک سانس میں ایسی آواز میں پڑھنا چاہیے جو نہ بہت بلند ہو نہ اتنی کم ہو جسے اہلِ مجلس نہ سن سکیں، البتہ مصرعے میں قافیہ پر پہنچ کر آواز پر تھوڑا زور دینا چاہیے تاکہ سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ لفظ قافیہ ہے، اس کے بعد آواز کو پہلی سطح پر لے آنا چاہیے۔''☆

فضائل پڑھتے وقت چہرے سے خوشی اور مسرت کے تاثرات ظاہر ہوں، لب و لہجے میں خلوص ہو عقیدت کے جذبات کا اظہار ہو تاکہ سامعین کو ان روحانی مسرتوں کا احساس پیدا ہو جائے جو ان کو امام حسینؑ اور ان کے اعزہ و اقربا اور انصار سے ہے۔

۲۔ سراپا

سراپا کی ادائیگی کے لیے ڈرامائی انداز ایک حد تک ضروری ہے۔ سراپا میں استعجاب کا عنصر کارفرما ہوتا ہے، اس لیے مرثیہ خواں سراپا کے بند پڑھتے وقت کبھی کبھی اس حیرت سے دوچار ہو جاتا ہے، کبھی تخیل کی رفعت اور بلندی کے پیشِ نظر اس کی رسائی عالمِ بالا تک ہو جاتی ہے، اس لیے ڈرامائی اداکاری سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

۳۔ رخصت

بسا اوقات رخصت کا منظر نہایت دل خراش ہوتا ہے، اس لیے رخصت کے بند پڑھتے وقت لہجے سے رنج و غم کا اظہار ہونا چاہیے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر مرثیہ خواں جذبات سے بہت زیادہ مغلوب ہو جائے تو اس کی آواز بھرا جاتی ہے اور الفاظ کی ادائیگی

☆ سید یوسف حسین زیدی، مرثیہ خوانی میں خاندان میر انیسؔ کا مقام، مطبوعہ قومی زبان، مئی ۱۹۷۳ء، ص ۳۲

میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، اس لیے صوتی اداکاری کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ آمد

سپاہِ حسینی کا ہر مجاہد نہایت آن بان سے حق پر جان دینے کے لیے معرکۂ کارزار میں جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوف و ہراس کے بجائے اس کے چہرے پر شگفتگی ہوتی ہے اور مسرت کے آثار بھی نمایاں ہوتے ہیں، اس لیے مرثیہ خواں کو چاہیے کہ وہ فرقِ مراتب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہر مجاہد کے جذبات و خیالات کی اداکاری کے فرائض انجام دے۔

۵۔ رجز

رجز پڑھتے وقت مرثیہ خواں کی آواز اور اس کے لہجے میں جوش و خروش ہونا چاہیے، رجز خوانی کا حق ادا کرنے کے لیے بعض اوقات سینہ پھلانے کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ اس پر تفاخر کی کیفیت طاری ہو جائے۔ سامعین بھی محظوظ ہوں اور متاثر ہوں اور کربلا والوں کے جذبات سامعین تک بہ خوبی پہنچ سکیں۔

۶۔ رزم

صورت ہو رزم پڑھنے میں تیغوں کے وار کی
جب ہاتھ اٹھے تو ضرب پڑے ذوالفقار کی
(فارغ)

مرثیہ خواں اس طرح پڑھے کہ تیغوں کی جھنکار کے علاوہ معرکۂ کارزار میں قرنا کا غل، طبل و بوق کا شور، آواز کوس و دف بھی سنائی دے، کمانوں کی کڑک اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھمک کی منظر کشی کے لیے اداکاری کی بھی ضرورت ہے، کامیاب رزم خوانی سے سامعین کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ بھی میدانِ جنگ میں موجود ہیں اور مناظرِ جنگ کے عینی شاہد ہیں۔

۷۔ ساقی نامہ

معرکۂ کارزار میں جب گھن گرج کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں، اس وقت شاعر

ساقیِ کوثر سے مئے زلال طلب کرتا ہے جس میں نشہ مؤدّت ہوتا ہے، اسی نشے سے سرشار ہوکر کبھی اس کی آواز ہوتی ہے کہ:

"میں یا حسینؑ کہہ کے اٹھالوں پہاڑ کو" (نفیس)

اور کبھی اپنے ہیرو کی کامیابی کی دعائیں مانگتا ہے، ساقی نامے کے بند پڑھتے وقت مرثیہ خواں پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجائے تاکہ امام علیہ السلام کے عقیدت مند بھی اس کیفیت سے محظوظ ہوسکیں۔

۸۔ شہادت

شہادت پڑھتے وقت مرثیہ خواں کو چاہیے کہ الفاظ کھینچ کر پڑھے اور پُرخلوص لہجہ اختیار کرے تاکہ سامعین کے جذبات کو ابھارنے میں وہ کامیاب ہوسکے، شہادت کی عظمت، عزم و ہمت، یمن و سعادت کے جذبات کی نشان دہی صوتی اداکاری کے ذریعے کرے۔ سامعین کے ایمان کی جلا ہو اور ان کی روح میں بالیدگی پیدا ہو۔

۹۔ بین

رثائی ادب میں بین کی اہمیت مسلم ہے بعض اوقات مرثیہ خواں بین سے اس قدر متاثر ہوجاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں اور آواز بھی جواب دے جاتی ہے، اس لیے کثرتِ مشق سے آواز پر قابو حاصل کرنا ضروری ہے۔ مرثیہ خواں کے لیے الفاظ کھینچ کر پڑھنے کی اہمیت قابلِ غور ہے تاکہ سامعین کا دل بھی پسیج جائے۔ بین اس طرح پڑھے جائیں جس طرح ایک ماں اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اشک بار ہوجاتی ہے۔

مرثیے کے تسلیم شدہ اجزائے ترکیبی کو مدنظر رکھتے ہوئے خوانندگی کے بارے میں نہایت اختصار سے چند اشارات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے لیکن یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ فنِ مرثیہ خوانی کی ایسی باریکیاں بھی ہیں جو نہ تحریر میں آسکتی ہیں اور نہ سمجھائی یا بتلائی جاسکتی ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ خوانندگی کے ان رموز کا تعلق ذوق یا

وجدان سے ہے۔ اس لیے مرثیہ خواں کی فطری صلاحیتیں ہی اس منزل پر اُس کی رہ نمائی کے فرائض انجام دے سکتی ہیں۔

انیسؔ مرحوم کے ایسے شاگردوں کا ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جو اُن سے خوانندگی کے اسرار و رموز معلوم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

میر انیسؔ مرحوم نے مرثیہ خوانی میں بھی کم شاگرد بنائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ”جب کوئی شخص میر صاحب سے اندازِ مرثیہ خوانی سیکھنے کی کوشش کرتا تھا تو وہ اس سوال سے بہت منغض ہوجاتے تھے۔ راقم کے والد مرحوم☆[1] نے ایک روز اس کا سبب دریافت کیا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ جب کوئی شخص مجھ سے اصولِ خوانندگی سیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ کیا سیکھے گا اور میں کیا سکھاؤں گا۔ بھائی یہ کچھ سیکھنے کا فن ہے، وقت پر جو کچھ ہو جاتا ہے، ہم خود نہیں سمجھتے کہ ہم نے کیا کیا، کوئی فن کیوں نہ ہو جب تک انسان کو فطرتاً اس سے لگاؤ نہ ہو اکتساب سے تاثیر پیدا نہیں ہوسکتی، جذبات اصلی سے وہی شخص ماثور و مغلوب ہوگا جو خود شاعر ہو یا کم از کم شاعرانہ باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو، خود مصنف ہو اور خود خوانندہ تو دادِ کمال و ستائش، محاسنِ شاعری سے اندازِ خوانندگی میں حسن پیدا ہوجاتا ہے۔“☆[2] اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ”ہر کسے را بہرِ کارے ساختند۔“

خوانندگی میں شاگرد

۱۔ ”داروغہ اچھے صاحب ایک بزرگ لکھنؤ (مرثیہ خوانی میں) جناب انیسؔ مرحوم کے شاگرد تھے اور دربارِ انیسؔ کے حاضر باشوں میں داخل تھے۔ سال بھر کے بعد تک مجلس بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے اور تمام رؤسائے شہر اور شرفا و کاملین سے وعدہ لیتے تھے اور مرثیہ خوانی کا بڑا دعویٰ تھا۔ مقررہ مجلس میں میر انیسؔ کا نیا مرثیہ پڑھا

☆۱۔ میر حسن علی۔

☆۲۔ احسن، سید مہدی حسن لکھنوی، واقعاتِ انیس (پاکستان میں) پہلی مرتبہ مطبع، منظور پریس، لاہور، ناشر سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۴۹۔۵۰

میر انیسؔ مرحوم بھی موجود تھے۔ داروغہ صاحب نے اپنی دانست میں مرثیہ خوانی کے خوب خوب جوہر دکھائے اور بڑے فخر و مباہات سے مرثیہ تمام کیا، مجلس ختم ہوگئی، والد مرحوم[☆1] فرماتے تھے کہ اس روز جو میں حسبِ دستور میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو میر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ نے داروغہ صاحب کا پڑھنا دیکھا، میں نے بھی تعریف کی۔ میر انیسؔ مرحوم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور پھر فرمایا، بھئی تم ایسا کہتے ہو، میرے مرثیے کی ہڈیاں پسلیاں توڑیں، میرے مضامین پر ظلم کیا، میرے قلب پر جو کچھ صدمہ گزرا ہے، اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔"

"کچھ دیر بعد داروغہ صاحب بھی داد لینے کے لیے تشریف لائے۔ میر صاحب نے میر نفیسؔ سے فرمایا کہ خدا جانے آج تک اس مرثیے کو میں کیا پڑھا اور تم کیا پڑھے۔ مرثیے کے جوہر تو آج داروغہ کے پڑھنے سے کھلے ہیں۔"[☆2] داروغہ صاحب اس لطیف طنز کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

۲۔ آغا میر

آغا میر کا تعلق فیض آباد سے تھا اور ان کا تخلص ثباتؔ تھا۔

شاگردانِ انیسؔ میں خوانندگی کے لحاظ سے وہ پہلے نمبر پر تھے۔ میر سلامت علی کے بیٹے مولوی عبداللہ نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کو بتایا کہ "میر انیسؔ کے شاگردوں میں آغا صاحب سب سے اچھا مرثیہ پڑھتے تھے، ان کے بعد میرے والد کا نمبر تھا۔"[☆3]

۳۔ شیخ امیر علی

"دبیر و انیسؔ کے لکھنؤ میں ایسے جھنڈے گڑے ہوئے تھے کہ ان دونوں کے سوا کسی تیسرے ذاکر کے پڑھنے کی مجلس میں ویسا مجمع مشکل سے ہوتا تھا۔"

☆۱۔ میر حسن علی

☆۲۔ احسن میر مہدی حسن، واقعاتِ انیسؔ (پاکستانی اڈیشن) ص ۱۰۶۔ ۱۰۷

☆۳۔ مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم، انیسیات، بار اوّل، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۵۲

(حاشیہ) ''اور اگر مجمع کثیر ہوتا تھا تو پھر ان دونوں کے کسی مشہور شاگرد کی مجلس میں آغا میر اور شیخ امیر علی میر صاحب کے مشہور شاگردوں میں اور میر شرف الدین و میر محمد رضا و میرزا مغل مرزا صاحب کے شاگردوں میں لکھنؤ میں بہت اچھے پڑھنے والے ذاکر زمانہ شاہی میں مشہور تھے۔''☆۱

۴۔ امیر منشی امیر علی

۴۔ ''امیر منشی امیر علی ساکن غازی پوری مدت العمر دیار گردی نمودہ، چنانچہ ہمہ دریں اثنا شاگردِ میر انیس مرحوم لکھنوی مرثیہ گو بودہ حال بہ عہدۂ انجینئری کلکتہ ماموره شہرہ شعر خوانی اش بہ طرزِ میر انیس مرحوم زباں زدِ نزدیک و دور مرد با مذاق است در لطفِ صحبت نہایت مشتاق اکثر در بزمِ مشاعرہ شریک می شود و لطفِ تازہ بہ اہل بزم می بخشد آدم خوب است خدائش بایں مسرت افزائی کامیاب مقاصد دارد۔''☆۲

میر انیس نے مرثیہ خوانی کو ایک فن کی حیثیت بخشی، ان کے مرثیوں کو سامعین نہایت شوق سے سنتے اور دل کھول کر داد دیتے، کچھ باذوق اور باصلاحیت افراد مرثیہ کی خواندگی کی طرف متوجہ ہوئے اور میر صاحب کی شاگردی اختیار کی۔

۵۔ میر سلامت علی

ایسے ہی اشخاص میں ایک بزرگ میر سلامت علی تھے جو مفتی گنج میں سکونت پذیر تھے، ان کو میر انیس ان کے بھائیوں (انس، مونس) اور فرزندِ ارجمند میر نفیس سے بہت عقیدت تھی۔ یہ حضرات اعلیٰ درجے کے شاعر بلند پایہ مرثیہ گو اور کامیاب مرثیہ خواں گزرے ہیں۔

میر سلامت علی نے ان مرثیہ گویوں کے پچاسوں مرثیے اپنے ہاتھ سے نقل کیے جن میں سے کچھ دست بردِ زمانہ سے تلف ہوگئے، کچھ قدر دانوں تک پہنچ گئے اور

☆۱۔ افضل حسین ثابت، حیاتِ دبیر، حصہ اول، باب ۷، ص ۱۲۶

☆۲۔ محمد علی نجف تحفۂ ارم (۱۲۹۹ھ) مطبوعہ کلکتہ، رجب ۱۳۰۱ھ

۱۲۹۹ھ

کچھ مرثیے اب بھی میری سلامت علی کے پرنواسے سیّد منتخب حسین صاحب کے پاس [☆۱] محفوظ ہیں۔"

اکثر مرثیوں کے آخر میں کاتبِ مرثیہ میر سلامت علی کے نام کے ساتھ کہیں شاگردِ میر انیس سلمہٗ اللہ تعالیٰ اور کہیں شاگردِ قدیم میر انیس مرحوم و مغفور درج ہے۔ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ مرثیے کی کتابت کس سن ہجری میں کس تاریخ کو اور کس وقت تکمیل کو پہنچی۔ مرثیوں کی یہ نقلیں ۵۰/۵۵ برس کی مدت کے اندر کی گئیں یعنی ۱۲۵۱ھ سے ۱۳۰۴ھ تک) مطابق ۳۶۔۱۸۳۵ سے ۸۷۔۱۸۸۶ء تک۔ سیّد منتخب حسین صاحب نے تحریر فرمایا کہ "ان کے نانا میر عبدالعلی بیان کرتے تھے کہ ان کے والد میر سلامت علی کا میر انیس کے اچھے شاگردوں میں شمار ہوتا تھا اور جب بھی میر انیس کسی وجہ سے کسی مجلس میں پڑھنے کے لیے نہ جاسکتے تھے تو میر سلامت علی کو بھیج دیتے تھے۔ میر عبدالعلی نے میر انیس کو اور اپنے والد میر سلامت علی کو مرثیہ خوانی کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ میر عبدالعلی نے تقریباً پچانوے برس کی عمر میں ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔" [☆۲]

۶۔ "عکس، مرزا محمد عباس لکھنوی ضیا برج کلکتہ در مرثیہ خوانی نامی است و در بزم آرائی مشغلۂ رؤسائے گرامی از میر انیس مرحوم و حضرت بہار لکھنوی تلمذ دارد... خلیقے خوش خواست و نہایت فرحت جو۔" [☆۳]

۷۔ میر علی حسن

"احسن صاحب کے والد مرحوم تو خالص میر انیس مرحوم کے شاگرد تھے اور مرثیہ خوب پڑھتے تھے۔" [☆۴]

☆۱۔ راقم الحروف کو ان تمام مرثیوں کے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی

☆۲۔ سیّد منتخب حسین صاحب، گرامی نامہ، مورخہ ۲۱ر اگست ۱۹۷۶ء

☆۳۔ محمد علی نجف، (غنچۂ ارم، ۱۲۹۹ھ) ص ۱۵۲،۱۵۱

☆۴۔ افضل حسین ثابت، حیاتِ دبیر، حصہ اوّل، باب ۶، ص ۱۲۷

اختتامیہ

مقالہ "شاگردانِ میر انیس تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مرثیے کے آغاز، اُس کے ارتقا اور اس کی تکنیک پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مرثیے کے تعمیری دور میں اس کا ایک ڈھانچا تیار ہوگیا تھا اور اس کے اجزائے ترکیبی مقرر کردیے گئے تھے۔ اس ضمن میں میر ضمیر، میر خلیق، مرزا فصیح اور دلگیر کی مساعی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں بہت شہرت حاصل کی۔ مرثیہ گوئی میں ان کے بہت سے شاگرد ہوئے جن کا تذکرہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے "دبستانِ دبیر" میں کیا ہے۔

میر خلیق کے ہونہار فرزند میر انیس نے صنفِ مرثیہ کی روایات کو عروج تک پہنچا دیا۔ ان کے خاندان کے افراد اور اُن کے شاگردوں نے بھی مرثیے کی روایات کو برقرار رکھا اور بعض گوشوں کو مزید ترقی دی۔ مونس کے مرثیوں میں مصوری کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ نفیس نے ساقی نامہ کے موضوع پر خوب طبع آزمائی کی۔ فارغ نے رزمیہ مضامین کے نظم کرنے میں اپنی جدتِ طبع کا ثبوت دیا۔ انیس کے شاگرد ریاض الدین ریاض کا ایک مرثیہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جس کا مطلع ہے:

"آئینۂ اقرار کو اخفا سے جلا ہے"

اس مرثیے کا موضوع 'وفا' ہے۔ اس کی ابتدا محضر شہادت پر (امام حسینؑ کے) دستخط سے ہوتی ہے، اس کے بعد شہادت امام علیہ السلام اور پھر شیریں سے وعدہ کے ایفا پر اس کا اختتام ہوتا ہے، اس نقطۂ نظر سے ریاضؔ کو ان جدید مرثیہ نگاروں پر اولیت حاصل ہے جو ایک موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے مرثیے تصنیف کر رہے ہیں۔

پہلے باب میں انیسؔ مرحوم کے ان سترہ شاگردوں کا تذکرہ ہے جن حضرات نے مرثیہ گوئی اور خوانندگی میں ان سے استفادہ کیا۔ جن شعرا کا کلام حاصل ہوسکا، ان پر تبصرہ کردیا ہے۔

استدادِ زمانہ کی وجہ سے چند شعرا کا کلام تلف ہوگیا۔ مثلاً شریفؔ (شریف العلما) کا صرف ایک بند مل سکا جو نقل کردیا ہے۔

انیسؔ مرحوم کے بعض شاگردوں کا کلام کوشش کے باوجود اب تک دستیاب نہ ہوسکا۔ اس لیے اُن کے اسمائے گرامی لکھ دیے ہیں۔

دوسرے باب میں مرثیے کے ارتقا کے ہر دور کے نمائندہ مرثیہ گو شاعر کے کلام کا نمونہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔

انیسؔ مرحوم کے سترہ شاگردوں کا تذکرہ بھی اس باب میں شامل ہے، ان کے کلام پر مجمل طریقے سے اظہار خیال بھی کردیا ہے، بعض شعرا کے کلام کا نمونہ اب تک نہ مل سکا بہرحال اس کے حصول کی کوشش جاری ہے۔

تیسرے باب میں خوانندگی کے بارے میں کچھ اشارات تحریر کیے ہیں۔

میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ نے اس فن کو ترقی دی۔ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے مرثیہ خوانی میں ایسی شہرت حاصل کی جو انھیں حضرات سے وابستہ ہوکر رہ گئی، مرزا دبیرؔ نے صرف اپنے فرزند مرزا اوجؔ کو خوانندگی کے رموز بتائے اور ایک شاگرد آغا حیدر کو۔ اللہ۔ اللہ خیر سلاّ۔

لیکن انیسؔ نے اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ اور بھی بہت سے شاگردوں کو فن خوانندگی کے اسرار و رموز سے واقف کیا۔ مشہور ہے کہ ان کے شاگرد کم سے کم دو

سال تک اس فن کو سیکھتے اس کے بعد منبر پر جاتے۔

خاندانِ انیسؔ کا یہ نمایاں کارنامہ ہے کہ اس نے مرثیہ خوانی کو بھی ایک بلند مرتبے تک پہنچایا۔ اس خاندان سے استفادہ کرنے والے حضرات (غیر شعوری طور پر سہی) آج بھی اس فن سے ضرور واقف ہوں گے۔

تیسرے باب میں صرف سات شاگردوں کی بابت لکھا گیا ہے ممکن ہے اور بھی باذوق اصحاب ہوں جنھیں اس فن سے لگاؤ ہو۔

اس مقالے میں انیسؔ مرحوم کے چھیالیس☆ شاگردوں کا تذکرہ حوالوں سمیت کیا گیا ہے۔ ممکن ہے جستجو اور تلاش سے مزید شاگردوں کا علم ہو سکے۔ لہٰذا ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب فاروقی کا بیان کہ "میر انیسؔ صاحب کا کوئی شاگرد نہیں تھا اور اُن کے بھائیوں یا بیٹوں کے علاوہ جو شخص مرحوم کی شاگردی کا دعویٰ کرے وہ غلط گو ہے۔" صداقت پر ہرگز ہرگز محمول نہیں کیا جا سکتا۔

☆ ضمیموں میں مزید پانچ شاگردوں کا تذکرہ شامل ہے، اس طرح جملہ شاگردوں کی تعداد چھیالیس ہو جاتی ہے۔

ضمیمہ باب اوّل

شاگردانِ انیسؔ

مانوسؔ، سیّد علی

سیّد علی مانوسؔ ابن سیّد ضامن علی "میر انیسؔ کے حقیقی نواسے اور میر نفیسؔ کے خویش ہیں۔

ان کی پیدائش[1] ۱۲۶۴ھ کی ہے... غدر کے دوسرے سال اپنی والدہ کے انتقال کے بعد سے جب کہ ان کا سن نو دس برس کا تھا، وہ اپنے نانا میر انیسؔ کے ساتھ رہنے لگے اور اُن کے انتقال کے وقت یعنی ۲۷ سال کی عمر تک انھیں کے ساتھ رہے۔"[2]

ص ۵۱ کے فٹ نوٹ میں حسبِ ذیل درج ہے۔

"میر سیّد علی صاحب شاعر ہیں، مانوسؔ تخلص کرتے ہیں۔ غزل کبھی نہیں کہی صرف رباعیاں، سلام اور مرثیے کہے، میر انیسؔ اور میر نفیسؔ سے کلام پر اصلاح لینے کا فخر حاصل ہے۔ نمونۂ کلام کے طور پر ایک رباعی یہاں درج کی جاتی ہے۔

مضطر ہوں کمال شیب کے آنے سے ❊ قوت نہ رہی شباب کے جانے سے
رعشہ ہاتھوں کا یہ خبر دیتا ہے ❊ دیکھ آب چھلکنے کو ہے پیمانے سے

☆۱۔ مطابق ۱۸۴۹ء۔۱۸۴۸ء، وفات تقریباً ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء

☆۲۔ پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی، انیسیات، پاکستان میں پہلی بار، ص ۵۱، ناشر طاہر نیوز ایجنسی، کراچی۔

ایک اور رباعی نقل کی[1] جاتی ہے۔

غم سے حاصل نجات ہوتی ہی نہیں دم ہے یہ خفا کہ بات ہوتی ہی نہیں
کہتا ہے سپیدۂ سحر پیری کا وہ دن ہوں کہ جس کی رات ہوتی ہی نہیں

"خواندگی میں میر انیس کے شاگرد تھے اور پیش خوانی بھی کرتے تھے۔"[2]

نگاؔر، مولوی سیّد محمد مہدی

مولوی سیّد محمد مہدی المتخلص بہ نگاؔر اپنے عہد کے مقبول و کامیاب مرثیہ گو تھے۔ موضع موئی ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔

اپنے اسلاف کی طرح وہ بھی عربی اور فارسی سے کماحقہٗ واقف اور علومِ عقلیہ و نقلیہ میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔

گداز بدن، پست قد، آفتابی چہرہ، وجیہ و شکیل، پابندِ صوم و صلوٰۃ، مہذب اور متین، خلیق اور متواضع بزرگ تھے۔ مطالعے کا آپ کو شوق تھا۔ اہلِ علم و فن حضرات کے فیض صحبت سے بھی استفادہ کیا۔

آپ نے ریاست بنارس میں ملازمت کر لی تھی۔ فرائض منصبی کی ادائگی کے بعد اکثر و بیش تر وقت وہ کتب بینی، تصنیف و تالیف میں گزارتے۔

تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۳۳۶ھ (مطابق ۱۸۔۱۹۱۷ء) میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

شاعری

آپ کی شاعری کا آغاز مدح گوئی سے ہوا۔ چند سال میں مناقب، رباعیاں، سلام، نوحے، مسدس، مخمس، تضمین، قطعات، قصائد اور مراثی سیکڑوں کی تعداد میں کہہ ڈالے۔ اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ پوربی زبان میں بھی سلام کہے۔

☆۱۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، اردو رباعیات، بار اوّل، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ، ناشر نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۳۱۹

☆۲۔ بہ قول سید یوسف حسین صاحب زیدی (خلف سید علی محمد عارفؔ مرحوم)

آپ کے ابنِ عم اور شاگردِ رشید سید سجاد حسین صاحب وقارؔ مرحوم کا بیان تھا کہ آپ نے سو مرثیے اساتذۂ لکھنؤ کو دکھانے کے بعد بہ غرضِ طباعت دہلی بھیجے تھے جو سب کے سب تلف ہو گئے۔ آپ کے اکلوتے فرزندِ صالح سید محمد مرتضیٰ حسین کی موت نے آپ کو زندہ درگور کر دیا تھا۔ اس لیے دوسرے مشاغل قریب قریب ترک ہو گئے اور عبادتِ الٰہی میں زیادہ تر مشغول رہنے لگے۔ بہن بھائی کو لے کر زیارتِ عتباتِ عالیات کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں علاوہ دیگر سلام و مرثیہ کے ایک خاص سلام کہہ کر پڑھا جس کا مطلع ہے:

اب اے زمیں نہیں ہے مجھے ڈر فشار کا
تکیہ مزارِ شاہ پہ ہے خاکسار کا

کچھ عرصے قیام کرنے کے بعد جب وہاں سے وطن واپس آئے تو صحت میں اختلال کے باوجود طبیعت میں ایک حد تک سکون پیدا ہو گیا تھا۔

نظرِ ثانی کے بعد پندرہ مرثیے پھر دہلی روانہ کیے جو مطبع یوسفی☆ میں شائع ہوئے۔ بعد ازاں افکار و علائق نے بقیہ کثیر مراثی و سلام وغیرہ کی ترتیب کا موقع ہی نہ دیا۔ بہت سے مرثیے، سوز کے ایک جلد قصائد کی، بہ سلسلۂ چہاردہ معصومین کے، تین جلد صاف قلمی مرثیے غیر مطبوعہ ہیں۔

نگارؔ کو عزاداری سے شغف تھا۔ سوز، نوحہ، تحت اللفظ، حدیث، حسبِ موقع مجلس میں بہ طریقِ احسن پڑھتے تھے۔

نمونے کے طور پر ایک غیر مطبوعہ مرثیے کے پانچ بند پیش کیے جاتے ہیں، جنابِ عباسؑ کی رخصت کے وقت مظلومِ کربلا کے حسرت آگیں، کلمات نے اہلِ حرم کو گریاں اور بے قرار کر دیا تھا۔

(۱)

یہ سن کے اہلِ بیت میں رونے کا غل ہوا　　تھا سیاہ شر میں شبہِ جز و کل ہوا

☆ سید زید الواسطی، ربیع الاول ۱۳۴۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء، بار ثانی بہ تعداد ۵۰۰، بہ مطبع یوسفی، دہلی، طبع کردہ شائع شدہ کتاب بڑے سائز پر بہت اچھی چھپی ہے۔ تعداد صفحات ۱۵۳ ہے، ہر مرثیے کے آخر میں میر انیسؔ کی رباعیاں درج ہیں۔

تھا شور اب چراغِ تمنا کا گل ہوا بن بھائی کا نبیرۂ ختم الرسل ہوا
کیسی گھٹا یہ درد و مصیبت کی چھا گئی
کشتیِ آلِ پاک تباہی میں آ گئی

(۲)

آخر ہر اک کو دے کے تسلی بہ حالِ زار تسلیم کر کے بھائی کو چاہا کہ ہوں سوار
نکلے محل سے حضرت عباسؑ ذی وقار ہم راہ آئے تا بہ فرسِ شاہِ نام دار
جوشِ ولا جو تھا دلِ پُراضطراب کو
تھاما لرزتے ہاتھوں سے بڑھ کر رکاب کو

(۳)

تھرا کے اس جری نے کہا باصدِاضطراب مجھ کو گناہ گار نہ فرمایئے جناب
فرمایا یہ تو امر نہیں باعثِ عتاب خدمت میں رہروانِ عدم کے بھی ہے ثواب
پالا ہے تم کو فاطمہؑ کے نورِ عین نے
پھر کیا ہوا رکاب جو تھامی حسینؑ نے

(۴)

رونے لگا جو گر کے قدم پر وہ باوفا ہاتھوں سے دل پکڑ کے یہ بولے شہِ ہدا
اچھا رکاب تھامے گا فرزندِ مرتضا روؤ نہ ٹکڑے ہوتا ہے غم سے جگر مرا
انساں کو فکرِ کسبِ سعادت ضرور ہے
بعد از پدر چچا کی اطاعت ضرور ہے

(۵)

ایک ہم ہیں جب کہ مرنے کو مقتل میں جائیں گے
تنہا فرس کو دیکھ کے آنسو بہائیں گے
کوئی رکاب تھامنے والا نہ پائیں گے
دل تھام کے ہر اک کو مکرر بلائیں گے

موقوف کرکے نالہ و فریاد و بین کو
بنت علی سوار کرے گی حسینؑ کو[☆۱]

نگاؔر مرحوم کے جو مرثیے مطبع یوسفی دہلی میں شائع ہوئے، اس کے سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو۔

مراثیِ نگاؔر

من تصنیفِ لطیف مولوی سید محمد مہدی صاحب نگاؔر، رئیس جون پور

تلمیذِ رشید

خدائے سخن استادِ کامل حضرت انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ

کتاب کے سرورق پر جو عبارت جلی حروف میں لکھی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نگاؔر، انیسؔ مرحوم کے شاگرد تھے۔

"علی ضامن خاں صاحب نے بتایا کہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں میں شاگرد تھے۔"

"یہ بات علی ضامن خاں کے حوالے سے درج کی جاتی ہے جو نگاؔر کے ہم وطن ہیں۔"[☆۲]

نگاؔر جون پوری کے مطبوعہ مراثی کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

نمبر شمار	مطلع	تفصیل	تعدادِ بند
۱۔	خسرو مملکت صبر و رضا ہے شبیرؑ	شہادت امام حسینؑ	۷۶
۲۔	آرائش کلام ثنائے حسینؑ ہے	روانگی و آمد حرم در شام	۸۰
۳۔	کیا انقلاب گردش چرخ کہن میں ہے	ایضاً	۹۱
۴۔	ناز پروردۂ اللہ و پیمبر ہے حسینؑ	ایضاً	۹۸
۵۔	جلوہ گر پھر رخ زیبائے سخن ہوتا ہے	شہادت امام حسینؑ	۱۴۳

☆۱۔ سید سبط حسین صاحب، خوشتر جون پوری، نگاؔر کا غیر مطبوعہ کلام، اسد اخبار، لکھنؤ، محرم نمبر ۱۳۵۶ھ

☆۲۔ محمد رشید صاحب، گرامی نامہ مورخہ ۱۸ر اپریل ۱۹۷۹ء

۶۔ کام آئی جبکہ فوجِ خدا رزم گاہ میں	ایضاً	۷۶
۷۔ آفتابِ فلکِ عز و ولا ہے زہراؑ	شہادت امام حسینؑ اور روانگی حرم طرف شام	۱۳۷
۸۔ غربت میں جو پیاسوں کو شہادت کی شب آئی	شہادت امام حسینؑ	۱۱۰
۹۔ وطن میں مائلِ درد و الم کی آمد ہے	واپسی حرم در مدینہ	۵۹
۱۰۔ عجیب رنگ زمانے کا انقلاب میں ہے	شہادتِ عون و محمد	۹۱
۱۱۔ رن میں جب خاتمۂ پنجتنِ پاک ہوا	حالات اور قتلِ لشکرِ امام، روانگیِ حرم برائے شام	۴۰
۱۲۔ جب گل چراغِ خامسِ آلِ عبا ہوا	شہادتِ امام حسینؑ	۱۲۸
۱۳۔ ناموسِ مصطفیٰ سے وداعِ حسین ہے	ایضاً	۱۰۴
۱۴۔ اے مومنو غمِ شہِ عالم میں اجر ہے	آمدِ حرم در شام	۳۶
۱۵۔ ...... مطلع نقل کرنے سے رہ گیا		

نگارؔ جون پوری کے ایک مرثیے☆ پر تبصرہ

نگارؔ کے ایک مطبوعہ مرثیہ کا مطلع ہے:

"ناموسِ مصطفیٰؐ سے وداعِ حسینؑ ہے"

اس مرثیے میں نہ چہرہ ہے، نہ سراپا، بلکہ رخصت امام حسینؑ سے اس کی ابتدا کی گئی ہے۔

بند۱

ناموسِ مصطفیٰؐ سے وداعِ حسینؑ ہے
دولت سرا میں حشر ہے وہ شور و شین ہے

☆ یہ مرثیہ محمد رشید صاحب نے مجھے نقل کر کے روانہ کیا ہے جس میں ۱۰۳ بند ہیں لیکن صحیح تعداد ۱۰۴ ہے۔ اس لیے بندوں کی نمبر شماری اور تسلسل کے بارے میں تیقن سے نہیں کہا جاسکتا۔

لب پر ہر اک کے ہائے شہِ مشرقین ہے
آہیں ہیں دل خراش جگر سوز بین ہے
سب سوگوار خاکِ عزا سر پہ ڈالے ہیں
بنتِ ابوترابؑ کو فضہ سنبھالے ہیں

پہلے بند سے اکتیس بند تک رخصت کے منظر کا نہایت تفصیل سے بیان ہے۔ مرثیے کا یہ حصہ نہایت دردناک ہے اور جذبات نگاری کی کامیاب مرقع کشی ہے۔ شاعر نے حفظِ مراتب کا بھی خیال رکھا ہے۔

حضرت کبریٰ اشک بار ہیں اور اپنے پدر کا دامن تھامے ہوئے کہہ رہی ہیں، بابا آپ کے بعد ہم کو کسی کی آس نہ رہے گی۔ آپ نے راانڈ بیٹی سے فرمایا کہ تقدیر کے معاملات میں بشر مجبور ہے۔ اپنے دل کا حال اب اپنے بیمار بھائی سے کہنا، مجھے جانے دو۔

حضرت سکینہ کا کلام دل کے لیے نشتر ہے۔ اپنے بابا سے ان کی ضد کس قدر فطری ہے۔

حضرت سدھارے گر تو منھ اشکوں سے دھوؤں گی
فرمایئے کہ سینے پہ پھر کس کے سوؤں گی

امام علیہ السلام نے اپنی بیٹی حضرت سکینہ کو گلے سے لگالیا اور فرمایا مشیتِ ربِ کریم سے کسی کا زور نہیں چلتا۔

حضرت رقیہ کے دل پر شوہر کا بھی داغ ہے اور اولاد کا بھی۔ انھوں نے کہا، مولا! آپ سے بڑی ڈھارس تھی، آپ بھی عازم جناں ہیں، امام عالی مقام نے فرمایا، خدا پر بھروسا رکھو، وہی سب کا معین و مددگار ہے۔

زوجۂ حضرت عباسؑ غم سے مضطرب ہیں اور نہر کی جانب نظر کیے ہوئے چلا رہی ہیں:

صاحب کہاں چلے گئے آفت میں چھوڑ کے
آقا کو روکتے نہیں ہاتھوں کو جوڑ کے

امامؑ نے ان کو بھی صبر کی تلقین فرمائی۔

بانوئے نام دار حضرت کے قدموں پر گری ہوئی ہیں اور کہہ رہی ہیں، میرے والی آپ رزم گاہ کی طرف جا رہے ہیں، میری بھی مانگ اجڑ جائے گی۔ یہ تو بتلائیے کہ سر سے چادر چھن جائے تو اپنا سر کس طرح چھپاؤں۔ سلطانِ بحر و بر نے جناب شہر بانو سے ارشاد فرمایا۔ اپنا سر تو اٹھاؤ۔ اس قدر مضطرب نہ ہو، تمھارے بین سن کر میرا دل و جگر پاش پاش ہوا جاتا ہے، تم کو صبر سے کام لینا چاہیے۔

کھولو نہ سر کے بال نہ آہ و بکا کرو
ہو خاتمہ بہ خیر مرا یہ دعا کرو

حضرت زینبؑ اپنے سرِ اقدس کو امام حسینؑ کے دوشِ مبارک پر رکھے ہوئے ہیں اور فرما رہی ہیں، بھیا! مجھ میں تابِ مفارقت نہیں ہے۔ اگر خانماں خراب خیمے لوٹ لیں تو میں کہاں جا کر بیٹھوں، آپ کا ماتم کہاں بپا کروں۔ یہیں آپ کی لاش پر آہ و بکا کروں یا وطن واپس جانے کے بعد وہاں صفِ ماتم بچھاؤں۔

بند ۱۱

فرماتے ہیں بہن سے یہ رو کر شہِ ہدا　　کیوں کر وطن کو جاؤ گی اے بنتِ مرتضیٰؑ
قسمت میں ہے کہ قتل ہو جب سبطِ مصطفیٰؐ　　خیمے جلیں، اسیر ہوں رانڈیں، چھنے ردا
جکڑی ہوئی رسن میں سوئے شام جاؤ گی
ماتم کہاں کا لاش پہ رونے نہ پاؤ گی

امام عالی مقام نے حضرت زینبؑ کو پیش آنے والے واقعات سے آگاہ فرمایا تاکہ وہ اپنے آپ کو اس سفر کی قیادت کے لیے شعوری طور پر بھی تیار کر سکیں۔ شاہِ مشرقین نے سب کو صبر کی تلقین کی۔ بعد ازاں بیمار کربلا کے پاس تشریف لے گئے اور اس طرح وصیت فرمائی۔ اے میرے مہ لقا، آج صبر کا امتحان ہے۔

گھبرائیو نہ گو غم و ہم کا ہجوم ہے
بیٹا یہ ارثِ مسلکِ بابِ علوم ہے

میرے غم میں رانڈیں اشک بار ہوں تو ان کو سمجھانا اور تسلی دینا۔

بند ۳۱

پھر جھک کے آہ کان میں بیٹے کے کچھ کہا سن کر جسے تڑپ گیا بیمارِ کربلا
روتے ہوئے حسینؑ چلے وا مصیبتا آلِ رسولؐ پاک میں محشر ہوا بپا
ٹھہرا گیا نہ پھر شہِ عالی مقام سے
سمجھا کے سوگواروں کو نکلے خیام سے

قریب در ذوالجناح حضرت کا منتظر تھا لیکن رکاب تھامنے والا کوئی نہ تھا اس لیے:

رکھ کر عناں پہ دستِ مبارک بہ چشمِ تر
جلوہ فضائے زیں ہوئے سلطانِ بحر و بر

آمد

بند ۳۲ سے بند ۳۵ تک امام حسینؑ کی رزم گاہ میں آمد کا بیان ہے۔ جب وہ تیغ بہ کف معرکۂ کارزار میں پہنچے تو فوج میں ہل چل مچ گئی اور اعدائے دیں کی نگاہوں میں اجل کی شکل پھرنے لگی۔ بڑے بڑے پہلوانوں کے زہرے آب ہوگئے اور بہادروں کے دل چھوٹ گئے۔ شہِ آسماں پناہ کے نہیب کا کیا کہنا، وہ تنہا ہیں لیکن دشمن کے سپاہی خوف سے لرزاں ہیں، امامِ عالی مقام نے پسرِ سعد کو یوں مخاطب کیا۔

رجز کے دو بند ہیں، ایک بند نقل کیا جارہا ہے۔

بند ۳۶

او بے خبر نتیجۂ دنیا و دیں ہوں میں
دانندۂ رموزِ جہاں آفریں ہوں میں
ثابت حدیث سے ہے کہ حبل المتیں ہوں میں
شاہد کلامِ حق ہے امامِ مبیں ہوں میں
میں پارۂ جگر ہوں رسالت مآبؐ کا
میں جزوِ تن ہوں جامعِ اُم الکتاب کا

سب جانتے ہیں کہ میں رحمت کا باب ہوں، حسنؑ کا بازو، ہوں، جگرِ بوترابؑ ہوں اور یہ وقتِ عتاب خدائے پاک کا قہر ہوں۔

چاہوں اگر تو پھر نہ یہ کوفہ نہ شام ہو
مجبور ہوں کہ امتِ خیر الانام ہو

بند ۳۸ سے بند ۴۱ تک اتمامِ حجت ہے۔ امامِ عالی مقام نے پسرِ سعد کو عملِ خیر کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ دنیا کی عزت و حشم و اقتدار۔ اسباب و مال و دولت و زر کا شمار، طبل و علم، سپاہ و خدم کا وقار، یہ سب ناپائیدار اور نا قابلِ اعتبار ہے۔ اے خانماں خراب، تو کعبے کو کیوں گراتا ہے، خدا کے قہر سے ڈر کہیں، تجھ پر عتاب نازل نہ ہو۔

مہماں بلا کے دشمنِ ابن علیؑ ہوئے
دل میں چھپے ہوئے تھے جو کینے جلی ہوئے

امام علیہ السلام اتمامِ حجت میں مشغول تھے کہ اعدائے دیں نے تیروں کی بارش شروع کردی۔ اسد اللہ کے لال نے نیام سے تلوار نکالی اور فرمایا:

''ہشیار برق گرتی ہے اے قومِ روسیاہ''

تلوار کی تعریف

رزمیہ شاعری میں معرکۂ کارزار کے مناظر کی مرقع کشی ہوتی ہے۔ اس لیے رزم نگار شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ مختلف اسلحۂ جنگ سے واقف ہو مثلاً نیزہ بازی، شمشیر زنی، تیر اندازی وغیرہ۔ وہ شہ سواری اور پہلوانوں کے داؤ، پیچ سے کماحقہٗ آگہی رکھتا ہوتا کہ حرب و ضرب کی جزئیات اور کیفیات اس طرح نظم کرے کہ جنگ کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

تلوار اور گھوڑے کی تعریف، رزمیہ شاعری کا اہم جز ہے، تلوار کی تعریف دراصل تلوار چلانے والے کی تعریف ہوتی ہے۔

بند ۴۳ سے بند ۵۷ تک تیغِ سر انداز و پُر شرر کی توصیف میں شاعر رطب اللسان ہے۔

بند ۴۴

آئی جدھر وہ برق لپک کر شرر اڑے
برگ خزاں رسیدہ کی مانند سر اڑے
ٹکڑے کمانیں ہوگئیں تیروں کے پر اڑے
ڈھالوں کے پھول تیغوں کے پھل سر بسر اڑے
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہہ گیا
نخلِ حیاتِ فوجِ ستم جل کے رہ گیا

بند ۴۵

مانند شعلہ تھی جو وہ آتش فشاں بلند
تھرا رہے تھے خوف سے نیزوں کے بند بند
سہمی تھی یہ کماں کہ نہ پہنچے مجھے گزند
گوشہ اماں کا ڈھونڈ رہے تھے خطا پسند
کٹنے کا خوف تھا سپرِ تیرہ رنگ کو
لالے پڑے تھے جان کے مرغِ خدنگ کو

مندرجہ بالا دو بند میں صنائع و بدائع میں آمد ہے، تشبیہات کی معنی آفرینی ہے، محاورات کی دل آویزی ہے۔

جب تیغِ ابن ید اللہ سن سے چل گئی تو سب نے یہ خیال کیا کہ برق تڑپ کر نکل گئی۔ دم بھر میں ضلال و کفر کی بستی جل گئی۔ شمشیر شعلہ ور آگ برسا رہی تھی۔ اس لیے ناری جل جل کر خاک ہو رہے تھے، میدانِ رزم گلزار و نار بنا ہوا تھا۔

تیغ دودم کا وار سیلِ فنا سے کم نہ تھا، امامِ برحق کا وار قہرِ حق تھا۔

انتشار کی کیفیت

بند ۵۲

اس صاعقہ مثال کی اللہ رے جھلک
خیرہ تھی چشمِ برق یہ چہرے پہ تھی چمک

ہیبت سے اس کی چرخ پہ تھراتے تھے ملک
اک تہلکہ بپا تھا ثریا سے تا سمک
تھیں بدحواسیاں سپہِ روم و شام میں
ترکش میں تیغ رکھتے تھے پیکاں نیام میں

شاعر نے شمشیرِ آب دار کی بھی تعریف کی اور اس دستِ مبارک کی بھی جس میں وہ تھی لیکن وہ تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر رہا، اسی مفہوم کو حسبِ ذیل بند میں ادا کیا ہے۔

بند ۵۳

کیوں کر رقم ہو وصفِ حسامِ شہِ عرب
کھلتے نہیں ہیں خوفِ برش سے قلم کے لب
آشوبِ دہر خانہ برانداز قہرِ رب
سفاک و شوخ، آفتِ دوراں قضا لقب
حیراں ہے عقل اس ظفر آرا کو کیا کہے
لاسیف جس کی شان میں خود کبریا کہے

مندرجہ بالا بند میں خط کشیدہ الفاظ اور ترکیبیں صنعتِ تنسیق الصفات کی عمدہ مثالیں ہیں۔ چھٹے مصرعے میں تلمیح ہے لافتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار۔

آج وہی ذوالفقار کربلا میں اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔ ابن ید اللہ کی ضرب سے رن میں چاروں طرف شور دارو گیر بپا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ افواجِ شر نے حربوں کو پھینک پھینک کے راہِ فرار اختیار کی۔

غل الاماں کا قاف سے تا قاف ہوگیا
سیلاب آبِ تیغ سے رن صاف ہوگیا

جب ستم شعار میدانِ جنگ سے بھاگ گئے تو شاہِ نام دار نے کاندھے پر تیغ رکھ لی۔ اس کے بعد شاعر نے ڈراما نگار کے فرائض انجام دیے۔ suspense کی کیفیت پیدا کردی۔

ناگاہ شمال کی جانب سے غبار نمودار ہوا۔

یہ امر پسرِ سعد کے پیشِ نظر تھا کہ فوجی ہراساں اور پریشان ہیں۔ معاً اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ یزید نے مزید کمک روانہ کی ہے، اب مہم سرد ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

بند ۵۹ سے بند ۶۴ تک بصرے کے پہلوان کی آمد اور اس سے شمر کی گفتگو نظم کی گئی ہے۔ جب اس بہادر نے یزیدی لشکر کی طرف رخ کیا تو شمر نے اس کو خوش آمدید کہا اس نے دریافت کیا کس کی تیغ کے خوف سے دَل کے دَل بھاگ رہے ہیں۔ ہر ایک دلیر کیوں مضطرب ہے اور بے حواس ہے، ''کس سے مقابلہ ہے ظفر سے جو یاس ہے۔''

بند ۶۲

بولا یہ ہاتھ جوڑ کے تب شمر بے ادب　　اس سے ہے یہ جدال جو ہے اشجع العرب
گو تین روز سے یہ بہادر ہے تشنہ لب　　پر ہیں وہی حواس وہی آن بان سب
یکتائے روزگار ہے شیروں کا شیر ہے
لاکھوں میں منتخب ہے جری ہے دلیر ہے

سچ تو یہ ہے کہ اس صف شکن پر جرأت کا خاتمہ ہے اسی لیے اس کے مقابلے کے لیے صف سے کوئی بہادر نہیں نکلتا۔ کس کی مجال ہے جو اس سے نبرد آزما ہو۔ شمر نے بصرے کے وحیدِ زمانہ پہلوان کی حمیت اور غیرت کو للکارا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا، اس پہلوان کو غیظ آ گیا اور اس نے کہا:

''بے سر کیے یہ جنگ مجھے چین اب کہاں''

اس دلیر نے اپنے رہوار کو مہمیز کیا اور امام علیہ السلام کے قریب پہنچ کر اپنی بہادری کے گن گانے لگا۔

حضرت نے فرمایا:

کہنے کی احتیاج ہے کیا جانتے ہیں ہم
لاریب تو دلیر ہے پہچانتے ہیں ہم

اے عمر سعد تیری تو کچھ ایسی ضرورت نہ تھی، کیا ایک مسافر کے واسطے یہ فوج اعدا کافی نہ تھی۔

بند ۴۹

انگشتری عقیق کی پھر دے کے یہ کہا
چلنے لگا تھا جب کہ وطن سے پئے دعا
مانگا تھا تیری بیٹی نے اے بندۂ خدا
لے اپنے پاس رکھ لے یہ ہدیہ فقیر کا
آمادہ لوٹنے پہ ہر اک بدخصال ہے
پائے نہ پائے تو یہی مجھ کو خیال ہے

بند ۷۰ سے ۷۱ جذبات نگاری کے عمدہ نمونے ہیں جن میں امام حسینؑ کے جناب فاطمہؑ صغریٰ سے بچھڑنے کے تاثرات کا بیان ہے۔

بند ۷۳ سے بند ۸۸ تک بصرے کے پہلوان اور امامِ عالی مقام کی گفتگو کو نظم کیا گیا ہے۔

گفتگو اور مکالمے

نظم میں گفتگو یا مکالمے لکھنا بہت مشکل ہے۔ مکالمہ فطری ہونا چاہیے، زبان سلیس اور سادہ ہو حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے، تشبیہات اور استعارات سے گریز بھی ضروری ہے۔

مکالمے کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ شاعر کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔

بند ۷۳

مسکن کہاں حضور کا ہے اور کہاں مقام
کہہ دیجے صاف صاف کہ ہو مطمئن غلام
بیٹی کا اپنی فاطمہؑ صغرا رکھا جو نام
کیا آپ ہیں محبِّ شہنشاہِ خاص و عام

محبوبِ کبریا کو نبیؐ جانتے ہیں آپ
دامادِ مصطفیٰؐ کو بھی پہچانتے ہیں آپ

امام حسینؑ کا جواب ملاحظہ ہو:

بند ۷۵

پوچھا جو تو نے مسکن و ماویٰ غریب کا
دل پاش پاش ہوتا ہے کیا دوں تجھے پتا
پہلے مدینہ تھا وطنِ حالِ جفا
ایذا سے دشمنوں کے چھٹی قبرِ مصطفیٰؐ
دکھ پر جو دکھ ہوا تو محن پر محن ہوا
اب دشتِ کربلائے معلّی وطن ہوا

مدینے کا نام سن کر وہ دین دار بہت شاد ہوا اور کہا، جہاں میں وہی تو کعبۂ مراد ہے، وہیں تو شہنشاہِ مشرقین امام حسینؑ جلوہ گر ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کے فضل و کرم سے اب تو حضرت علی اکبرؑ و حضرت قاسمؑ بھی جوان ہو گئے ہوں گے:

"پھولا پھلا رسولؐ خدا کا چمن رہے"

بعد ازاں اس نے آپ کا اسمِ مبارک دریافت کیا اور قومیت کے بارے میں استفسار کیا۔

بند ۸۰

ہاتھوں سے دل پکڑ کے یہ بولے شہِ ہدا چھریاں جگر پہ چل گئیں بھائی یہ کیا کہا
سیّد ہے قوم، نام ہے محتاج و بے نوا پابندِ غم، اسیرِ بلا، حالِ جفا
حیدرؑ کی جان فاطمہؑ کا نورِ عین ہوں
اے عاشقِ ولیِ خدا میں حسینؑ ہوں

بند ۸۱

. تو جن کو پوچھتا ہے وہ سب خوں میں بھر گئے
پردیس میں حسینؑ کو برباد کر گئے
تلواریں بھوک و پیاس میں کھا کر گزر گئے
مرنے کے جن کے دن نہ ابھی تھے وہ مر گئے
محتاج غسل و گور و حنوط و کفن کے ہیں
بکھرے ہوئے یہ پھول ہمارے چمن کے ہیں

بند ۸۲ سے بند ۸۷ تک بکھرے ہوئے پھولوں کا دل خراش اور دردناک بیان ہے، مسلم و جعفر کے یادگار جناں میں پہنچ گئے۔ زینبؑ کے گل عذار بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ قاسم کا حال کس طرح بیان کیا جائے۔ وہ بھی تشنہ لب شہید کیا گیا اور اس کا جسم گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر دیا گیا۔ میرے بھائی عباسؑ علم دار لشکر کو بھی شہید کر دیا گیا، سامنے جو لاش خون میں تر نظر آ رہی ہے، وہی تو مجھ غریب کا نوجوان پسر علی اکبرؑ شبیہِ پیغمبرؐ ہے۔ "توڑا سناں کے پھل نے مرے لال کا جگر" لیکن مجھے

اپنا الم نہ فرقتِ اکبرؑ کا رنج ہے
گر ہے تو بے ردائیِ خواہر کا رنج ہے

اس خونچکاں واقعہ کو سن کر:

بند ۸۸

بولا یہ سر کو پیٹ کے ہاتھوں سے وہ جواں
حیرت ہے کیوں جہاں میں نہ محشر ہوا عیاں
کیسا غضب یہ ہو گیا اے قبلۂ جہاں
افسوس باغیوں نے اجاڑا یہ بوستاں
رن میں بضاعتِ اسد اللہ لٹ گئی
سرکارِ بادشاہِ فلک جاہ لٹ گئی

اس دل ملول نے ہاتھ جوڑ کر امام علیہ السلام سے جنگ کی اجازت مانگی تو شہنشاہِ بحر و بر نے اس سے رو کر کہا، یہ نوحہ گر تجھے کیوں کر رضائے جنگ دے، اے نکو سیر تیرا نام شہیدوں کی فہرست میں نہیں ہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ:

''رونا مرے الم میں شہادت سے کم نہیں''

اس پہلوان کو جنگ کی اجازت نہ ملی تو وہ امام حسینؑ سے بہ صد نالہ و بکا رخصت ہوا اور بصرے کی سمت خاک اڑاتا ہوا چلا گیا۔

شہادت

مرثیہ عموماً ہیرو کی شہادت پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ واشنگٹن ارونگ نے بھی امام عالی مقام کو ہیرو تسلیم کیا ہے۔ امامؑ نے بیعتِ یزید سے اس لیے انکار کیا تھا کہ اسلام کا بول بالا رہے، اس مشن کی تکمیل کے لیے وہ طرح طرح کے مصائب سے دو چار ہوئے اور آخرکار:

لٹا دیا رہِ خالق میں اپنا گھر دیکھو
حسینؑ ابنِ علیؑ کا دل و جگر دیکھو

بند ۹۳ سے بند ۱۰۰ تک

امام مظلوم پر لشکرِ جفا کی یورش کو نظم کیا گیا ہے۔ نگارؔ نے شہادت نہایت تفصیل سے بیان کی ہے۔ ایک مسافر کے قتل کے لیے شمشیر و نیزہ ہائے سوارانِ روم و زنگ تھے۔ خنجر، کٹار، تیر سہ پہلو، کلوخ و سنگ تھے، ان کے علاوہ گرزِ گراں سناں اور خدنگ بھی امام پر ہر طرف سے پڑتے تھے۔ ان کی ساری پسلیاں تیغِ ستم سے فگار ہیں اور برچھیوں کے پھل سینۂ اقدس کے پار ہیں، ہر زخمِ تن سے لہو کی دھار چھوٹ رہی ہے، اس لیے امامِ مظلوم کو بار بار غش آ رہا ہے اور گھوڑے پر ڈگمگا رہے ہیں، بالآخر:

زخمِ جگر کے درد سے غش کھا کے گر پڑے
تپتی ہوئی زمین پہ تھرا کے گر پڑے

شہادت کے خونچکاں واقعات کے تصور ہی سے کلیجا منھ کو آجاتا ہے اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔

بین: مرثیے کا یہ حصہ نہایت دل سوز ہوتا ہے انسان کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے اور بے ساختہ اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔

دکنی مرثیوں میں بین، کو بڑی اہمیت حاصل تھی، مرثیے کے تعمیری دور میں بھی اسے مرثیے کا اہم جزو تسلیم کیا گیا۔

بند ۱۰۱ اور ۱۰۲ میں اہلِ حرم کے بین کا نہایت مجمل طریقے سے تذکرہ ہے۔ شمرِ بدگہر خنجر بہ کف امامِ مظلوم کی طرف بڑھا تو بیبیاں خیمے سے برہنہ سر نکل آئیں، ان کے لبوں پر آہ و زاری تھی، وہ مقتل کی سمت چلی جا رہی تھیں۔

آخری بند ۱۰۴

اب کیا کہوں نگاؔر جگر کو نہیں ہے تاب
پہنچی ہیں ہائے لاش پہ کب وہ جگر کباب
جب قتل ہو چکا تھا دل و جانِ بوتراب
نیزے پہ تھا علم سرِ شہ مثلِ آفتاب
جنبش میں تھی زمین فلک تھرتھراتے تھے
گھوڑے تنِ حسینؑ پہ دوڑائے جاتے تھے

اس مرثیے میں نگاؔر نے چند تسلیم شدہ اجزائے مرثیہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً رخصت نہایت تفصیل سے نظم کی ہے جس میں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ شاعر نے حفظِ مراتب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آسان اور سلیس زبان میں اپنے مفہوم کی ترجمانی کی ہے۔ آمد اور رجز کے ضمن میں چند بند ہیں لیکن رزم کے بیان میں نگاؔر نے اپنی جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ معرکہ کارزار کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں، حرب و ضرب کے ہنگاموں کو پڑھ کر اس کا علم ہوتا ہے کہ وہ فنونِ جنگ سے واقف تھے۔

نگارؔ نے شہادتِ امام حسین علیہ السلام بھی تفصیل سے نظم کی ہے جسے پڑھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔

نگارؔ کا بہت سا کلام تلف ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں ان کے پندرہ مرثیے شائع کیے گئے تھے جو اِن دنوں قریب نایاب ہیں۔

ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے پیشِ نظر اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ نگارؔ نہایت پُرگو شاعر گزرے ہیں اور مختلف اصنافِ سخن پر انھیں قدرت حاصل تھی۔

maablib.org

ضمیمہ باب دوم

حکیم آغا حسن ازلؔ کے ایک مرثیہ کا تجزیہ

حکیم آغا حسن ازلؔ کا ایک مرثیہ ☆۱ دستیاب ہوا ہے جس کا مطلع ہے:

"جب کربلا میں روزِ ستم بھی گزر گیا"

اس سے قبل ☆۲ تذکرہ کیا جاچکا ہے کہ ازلؔ اپنے مرثیوں پر یکے بعد دیگرے انیسؔ مرحوم، دبیرؔ مرحوم اور مرزا عشقؔ مرحوم سے اصلاح لیتے تھے لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس مرثیے پر کس استاد کی اصلاح ہے، اس میں ۱۲۰ بند ہیں اور یہ امام حسینؑ کے حال میں ہے۔

یزیدی لشکر کے بردار پسر سعد نے امام حسینؑ کی صلح کی شرائط نامنظور کردیں اور پیش کش مسترد کردی، امام علیہ السلام سے جنگ کا مصمم ارادہ کرلیا۔

☆۱۔ محمد رشید صاحب لکھنوی نے مرثیہ مذکورہ ۲۵/ جنوری ۱۹۷۹ء کو مجھے روانہ فرمایا ہے، اس عنایت کے لیے صاحب موصوف کا شکرگزار ہوں۔ مرثیہ کے آخر میں لکھا ہے۔ مرثیہ بتاریخ دوئم صفر المظفر روز یکشنبہ ۱۲۸۳ھ باتمام رسید، اس مخطوطہ کا نمبر ۱۲۸۳ ہے اور بہت ہی بوسیدہ خط شکست میں ہے، یہ مخطوطہ (مطابق ۱۸۶۶ء) نورالحسن کوکب ایجنٹ ریاست دھول پور (میر انیسؔ کے ہم عصر) کے ذخیرۂ مراثی سے ملا تھا اور اب محمد رشید صاحب کے کتب خانے میں ہے۔

☆۲۔ حوالہ باب دوم، ص ۲۱۷

ازلؔ نے پہلے بند میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب کربلا میں روزِ نہم بھی گزر گیا   لڑتا سپاہِ شام کا شہ سے ٹھہر گیا
بن کر خبر لڑائی کی ہر ایک ڈر گیا   خورشید کا بھی خوف سے چہرہ اتر گیا
آمد سنی فلک نے جونہی ماہتاب کی
مغرب کی سمت رکھ دی سپر آفتاب کی

مکالمہ

مکالمے لکھنا بظاہر آسان ہے لیکن درحقیقت نہایت مشکل ہے، بالخصوص نظم میں۔

چہرہ

چہرے کے بند مکالمے کی خصوصیات کے حامل ہیں، نمونتاً چند بند پیش کیے جاتے ہیں۔

بند ۲

مریخ نے فلک سے کیا کانپ کر سوال
یہ کون سی ہے رات بتا مجھ کو پیرِ زال
میں آج دیکھتا ہوں جہاں کا عجیب حال
بعضے فرشتے ڈرتے ہیں بعضوں کو ہے ملال
اپنے تو ہاتھ پاؤں تردد سے سرد ہیں
تو دیکھ تو فرشتوں کے چہرے بھی زرد ہیں

بند ۳

پیرِ فلک نے یوں کیا مریخ سے کلام
کیا تجھ سے میں بیان کروں اے فلک مقام
بیٹا جو ہے علیؑ کا جہاں میں حسینؑ نام
کل اس قمر کو قتل کرے گی سپاہِ شام

کہرام سن رہے ہیں جو ہم آج رات کو
روتے ہیں سب فرشتے اسی خوش صفات کو

پیرِ فلک نے مریخ کو بتایا کہ کل سپاہِ شام حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کرے گی، اس لیے کہرام برپا ہے اور سب فرشتے اس غم میں ملول و اشک بار ہیں۔

بعد ازاں زمین نے آسمان سے اداسی کا سبب دریافت کیا، یہ سن کر خورشید نے زمین کو جواب دیا کہ ذوالفقار جنابِ امیر کل نیام سے باہر آئے گی۔ یہ سنتے ہی زمین کانپ گئی اور کہا کہ انسانوں کا دہشت زدہ ہونا تو قرینِ قیاس ہے کیوں کہ وہ زمین پر ہیں لیکن آپ کو کاہے کا خوف ہے۔ آپ تو چرخِ بریں پر ہیں۔ خورشید کا جواب ملاحظہ ہو:

بند ۹

بولا یہ آفتاب کہ اے ارضِ خوش سیَر مہتاب کا تو سانحہ روشن ہے خلق پر
بے وجہ آج شام سے ہم کو نہیں ہے ڈر شق القمر کا آتا ہے ساماں ہمیں نظر
بے وجہ خوف سے نہیں منھ میرا فق ہوا
وہ بھی تو تھا فلک پہ جو انگلی سے شق ہوا

رسولِ مقبولؐ کی انگشتِ مبارک کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ان کے قوت بازو (حضرت علیؑ) کو قادرِ مطلق نے ذوالفقار عطا فرمائی۔ ضربِ اسد اللّٰہی سے کون واقف نہیں۔ حضرت جبریل بھی اپنے پروں کو سمیٹے ہوئے لرزتے ہیں، کل وہی ذوالفقار امامِ وقت کے دستِ مبارک میں ہوگی۔ اس لیے:

''کیا عجب ہے کہ زمانہ تہ و بالا ہو جائے۔'' شبِ عاشور کہیں حزن و ملال کے آثار ہیں، کہیں اداسی چھائی ہوئی ہے، خیامِ اہلِ بیت میں سب بے چین اور تشنہ کام ہیں۔ امام عالی مقام نے اپنی لاڈلی بیٹی جناب سکینہ کو گود میں لے کر تسکین آمیز جملے فرمائے، صبر کی تلقین کی اور ذہنی طور پر ان مصائب کے برداشت کرنے کے لیے آمادہ بھی کرتے ہیں جو ان کی شہادت کے بعد رونما ہونے والے ہیں۔

بند ۱۲

کہتے ہیں لے کے گود میں بیٹی کو بار بار　　بیٹا پدر کی طرح کرو صبر اختیار
ایسا نہ ہو کہ روتی پھرو کل بھی زار زار　　ایذائیں تم کو دے گی بہت فوج بدشعار
رہ جائے میری لاش نہ مقتل میں کانپ کے　　رونا بہت نہ گرتے سے منھ ڈھانپ کے

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنی چہیتی بہن زینبؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ستارے جھلملانے لگے، مشرق کی سمت کچھ روشنی نظر آنے لگی۔

صبح کا منظر

ازلؔ نے چند بند میں صبح کے منظر کی مرقع کشی کی ہے۔ نسیم صبح چل رہی ہے، چاروں طرف پھولوں کے انبار نظر آ رہے ہیں، اس وقت چمنِ روزگار نکھار پر ہے۔

بند ۱۸

تھم تھم کے چل رہی نسیمِ سحر جو یاں
کیا لطف دے رہی ہے کریں اس کو کیا بیاں
قدرت خدا کی ہوتی ہے ہر جھونکے سے عیاں
بشاش دل میں ہوتے ہیں سب پیر اور جواں
بیمار بھی نسیمِ سحر سے بحال ہیں
یہ وہ ہوا ہے جس سے شجر سب نہال ہیں

شاخوں پہ طیور نغمہ سنج ہیں، یہ عبادت پروردگار کا وقت ہے۔

شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ نے اذان دی۔

بند ۲۳

ناگہ سنی سبھوں نے جو تکبیر کی صدا　　منھ کو امامِ دیں کے ہر اک دیکھنے لگا
پڑھنے لگا نماز دو عالم کا پیشوا　　سب آئے مقتدی عقبِ سرورِ ہدا

آمادۂ صلوٰۃ جو سب تھے شروع سے
پڑھنے لگے نماز خضوع اور خشوع سے

نماز سے فراغت کے بعد امامِ عالی مقام نے اپنے رفقا سے فرمایا کہ اس بھوک پیاس میں تم اپنی جانیں نہ دو، میرے ساتھ تمھارا بدن کیوں ٹکڑے ہو مجھے تو غسل وکفن بھی نصیب نہ ہوگا۔

تمھیں شہادت کا ثواب حاصل ہوگیا، میں تم سے یہ خوشی کہہ رہا ہوں کہ☆ یہاں سے چلے جاؤ۔ غازیوں نے عرض کی، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم ٹھہرے آپ کے جاں نثار و وفا شعار اگر ہزار بیٹے ہوں تو حضور پر صدقے کردیں، ہم کو نہ تو آل اولاد کی فکر ہے اور نہ اپنے گھر کا خیال دامن گیر ہے۔ یہ سن کر شاہ دیں نے فرمایا:

"اس کے عوض میں اجر تمھیں دے خدائے پاک"

آغازِ جنگ

اتنے میں سپاہِ اعدا آمادۂ وغا ہوئی۔ رفقا نے امام علیہ السلام سے رضائے جنگ لی، معرکۂ کارزار میں دشمنوں سے نبرد آزما ہوئے اور:

"ایسے لڑے کہ آج تلک نام رہ گیا"

بعد ازاں امام حسینؑ کے اعزہ نے جنگ کی اجازت لی، شجاعت کے جوہر دکھائے، بالآخر جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اب امامِ عالی مقام تنِ تنہا رہ گئے۔

رخصت

مرثیے کا یہ جزو عموماً بہت دردناک ہوتا ہے۔ ایک ہی بات کو مختلف پیرایوں میں بیان کرنا اور پھر فطرت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر مرثیہ نگار کے بس کی بات نہیں، اس مرثیے میں ازلؔ نے بند ۳۲ سے ۳۸ تک رخصت کے جاں گداز واقعات

☆ اکثر روایات متفق ہیں کہ امام حسینؑ نے اپنے اعزہ اور رفقا کو شبِ عاشور جمع کرکے خطبہ دیا تھا، شمع گل کردی تھی اور فرمایا تھا کہ میں اپنی بیعت تمھاری گردنوں سے اٹھائے لیتا ہوں، تم اس رات کی تاریکی میں یہاں سے چلے جاؤ۔ اکثر مرثیہ نگاروں نے بھی اسی واقعے کو نظم کیا ہے۔

نظم کیے ہیں۔

امام علیہ السلام رخصت کے لیے خیمے میں تشریف لے گئے تو آپ کی ہمشیر حضرت زینبؑ نے فرمایا کہ مجھ دلِ ملول کے بزرگوں میں تمھارے علاوہ اور کوئی باقی نہیں، رن میں جانے کی تم کو کیسے رخصت دے سکتی ہوں۔

امام حسینؑ کی جذباتی اپیل ازلؔ کی زبان سے سماعت فرمایئے۔

بند ۳۶

خواہر تمھیں خدا و پیمبرؐ کا واسطہ خواہر تمھیں جوانیِ اکبرؑ کا واسطہ
ہمشیر تم کو حیدرِؑ صفدر کا واسطہ رخصت کرو بہن علی اصغرؑ کا واسطہ
کچھ اس میں شک نہیں یہ مقامِ بکا تو ہے
گو ہم نہیں ہیں سر پہ تمھارے، خدا تو ہے

یہ سن کر زینبِؑ مضطر نے اپنے بھائی کو رن کی اجازت دے دی۔ چلتے وقت امام علیہ السلام نے اپنی بہن کو یوں صبر کی تلقین فرمائی۔

رو کر نہ تم کبھی سرِ شبیرؑ دیکھنا!
جو کچھ خدا دکھائے وہ ہمشیر دیکھنا!

شاہِ دیں ذوالجناح پر سوار ہوئے اور رزم گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

سراپا

بند ۴۲ سے بند ۴۶ تک امام حسینؑ کا سراپا نظم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کا آخری بند پیشِ خدمت ہے جس میں امامؑ کے عظیم کردار کی چند جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

بند ۴۶

ہاتھوں سے راہِ حق میں بہت کچھ کیا عطا
مدِ نظر تھی عقدہ کشائی انھیں سدا
پاؤں کبھی بڑھے نہیں جز طاعتِ خدا
جو کام فرض تھا اسے جلدی کیا ادا

کس منھ سے وصف کیجیے اس بے نظیر کے
کیوں کر نہ ہو پسر تھے جناب امیر کے

آمد

امامِ عالی مقام کی آمد سے افواجِ اعدا میں ہلچل مچ گئی۔ بڑے بڑے بہادروں کے زہرے آب ہو گئے، فاتحِ خیبر کے لال سے نبرد آزما ہونا موت کو دعوت دینا ہے، فوج کے جوانوں نے ایک زبان ہو کر کہا:

ہرگز کریں گے قتل نہ ہم اس سعید کو
چاہے وہ لکھ کے بھیج دے نامہ یزید کو

مخبر نے جب پسر سعد کو یہ خبر پہنچائی تو وہ بہت گھبرایا اور لشکریوں کے پاس جا کر ان کو بہت سمجھایا، ان کو غیرت دلائی اور ڈرایا دھمکایا بھی۔

بند ۵۲

ہم جانتے تھے تم کو بہادر بڑے ہو تم
لاکھوں سے اور ہزاروں سے اکثر لڑے ہو تم
بودے نہیں ہو جنگ میں دل کے کڑے ہو تم
ہٹ جاؤ میرے سامنے سے کیوں کھڑے ہو تم
ہے شرط میں زبان تمھاری قلم کروں
نامہ ابھی یزید کو جا کر رقم کروں

رزم گاہ میں پہنچ کر امامِ عالی مقام اتمامِ حجت کے لیے افواجِ اعدا سے پھر ایک بار مخاطب ہوئے، ان کو اپنا حسب نسب یاد دلایا اور ذوالفقار حضرت علیؑ کی چند خصوصیات کی طرف بھی اشارہ فرمایا۔

بند ۶۰

یکتا ہمارے والدِ ماجد کی تیغ ہے   زاہد کی، متقی کی، مجاہد کی تیغ ہے

سر خم ہے اس لیے کہ یہ ساجد کی تیغ ہے   پرہیز تم کرو کہ یہ عابد کی تیغ ہے

ناری یہاں ہر ایک ابھی جل کے خاک ہو
قصہ تمھارا آج کوئی دم میں پاک ہو

امام علیہ السلام نے بے ثباتیِ دنیا کا تذکرہ کیا اور فرمایا، اس دنیا پر کیوں جان دیتے ہو، یہ تو سرائے فانی ہے۔ عقبیٰ کے واسطے اعمالِ خیر کا توشہ ضروری ہے۔ یہ سن کر سرکشانِ شام نے جواب دیا:

طاعت سے کچھ غرض ہے نہ عقبیٰ سے کام ہے
دنیا میں ہم۔ ہیں ہم کو تو دنیا سے کام ہے

اگر آپ کو جدال و قتال پسند نہیں تو یزید کی بیعت سے کیوں انکار ہے۔
امامِ عالی مقام نے فرمایا، میرے سامنے بیعت کا تذکرہ ہرگز نہ کرنا، اچھا آؤ، تم یزید کے کہنے سے مجھ سے جنگ کرو۔ یہ کہہ کر حضرت نے نیام سے ذوالفقار نکالی۔

رزمیہ شاعری

رزمیہ شاعری میں شمشیرِ آب دار اور سبک رفتار رہوار کی تعریف ناگزیر ہوا کرتی ہے۔ ازلؔ نے بند ۷۵ سے بند ۹۸ تک تلوار کی تعریف کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ شمشیر زنی اور شہ سواری سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔

تیغ کے قد و قامت کی کیا توصیف ہو سکتی ہے۔ اس کی رفعت کی یہ ادنیٰ مثال ہے کہ یہ سرکشوں کے سروں پر چڑھتی ہے، اہلِ نار اس سے جلتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک بند پیش کیا جاتا ہے جس سے لشکرِ اعدا کے انتشار کا قدرے اندازہ کیا جا سکتا ہے، خاک پر زخمی تڑپ رہے ہیں۔ میدانِ جنگ میں خون کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

بند ۷۹

چلتی ہے جب یہ تیغ دو پیکر اِدھر اُدھر
گرتی ہیں رن میں لاشیں برابر اِدھر اُدھر

لرزاں کھڑی ہے فوج بد اختر اِدھر اُدھر
ٹوٹے پڑے ہیں نیزہ و خنجر اِدھر اُدھر
دیکھو جسے وہ خوف سے اس دم خموش ہے
چاروں طرف کو خون کے دریا کا جوش ہے

تیغ کے بارے میں ایک بند نقل کیا جاتا ہے جس میں زبان کی چاشنی بھی ہے، محاوروں کی دل کشی بھی اور قافیوں کی دل فریبی بھی۔

بند ۸۰

کہتی ہے فتح تیغ دو سر سے چمک چمک
ہے حکمِ تیغ یکِ قضا کو سرک سرک
ہر مرغ قید پر ہے تقید پھڑک پھڑک
ڈر سے فرشتے پھرتے ہیں مضطر فلک فلک
دل باغیوں کا رنج سے کیا داغ داغ ہے
زخم اس قدر لگے ہیں کہ تن باغ باغ ہے

صنائع و بدائع

حسنِ بیان کے سلسلے میں صنائع و بدائع پر نظر پڑتی ہے لیکن یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ صنعتوں کے استعمال میں آمد ہو تو حسنِ کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر آورد ہو تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

یومِ عاشور فوجِ بدخصال دھوپ میں کھڑی ہوئی تھی۔ آفتاب کی حدت اور تاب و تب کی وجہ سے سب ہی بے چین و بے قرار تھے۔ جب دوپہر ڈھل گئی تو زوال نظر آ گیا۔

کچھ دن بھی ذوالفقار کے چلنے سے کٹ گیا
بڑھنے لگا جو خوف تو سایہ بھی گھٹ گیا (بند ۸۵ کی بیت)

ازلؔ کے صنائع و بدائع کے استعمال میں حسنِ سلیقہ سے کام لیا ہے۔ سیّد الشہدا

ذوالفقار کے جوہر دکھا رہے تھے کہ وقتِ عصر آ گیا۔ مشاہدہؔ ہے کہ زوال کے وقت سایہ گھٹنے لگتا ہے، شاعر نے اس کی وجہ خوف بتائی ہے، بیت حسنِ تعلیل اور صنعتِ تضاد کی عمدہ مثال ہے۔

دوپہر ڈھل چکی ہے، اس لیے دھوپ بہ تدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔

بند ۸۶ کی بیت بھی حسنِ تعلیل کی اچھی مثال ہے۔

میدانِ کارزار میں ہیبت یہ بڑھ گئی
آخر کو دھوپ رن کی درختوں پہ چڑھ گئی

شاعر نے اس کا یہ سبب بتایا ہے کہ ذوالفقار حیدری کی دہشت سے دھوپ درختوں پر چڑھ گئی۔ شاید امن و امان کی کوئی صورت وہاں نظر آ جائے۔

ایک مدت کے بعد حسامِ علی اعدا کی صفوں پر چلی تھی۔ بالآخر امام علیہ السلام کے حملوں سے میدانِ کارزار لرز اٹھا جب ذوالفقار چرخ کی طرف بلند ہوئی، اس وقت:

قدسی پکارے دیکھ کے اس کو کہاں کہاں

اس کا جواب ملاحظہ ہو: بولی یہ تیغ ہوگا ارادہ مرا جہاں

بعد ازاں:

بند ۹۷

جب آسماں سے تیغ زمیں کی طرف جھکی
چلائے ڈر کے مردمِ آبی کہ یا علیؑ
ہم بے خطا ہیں ہم کو بچا بازوئے نبیؐ
صدمہ یہ تھا کہ آپ میں گاوِ زمیں نہ تھی
پانی زمیں سے نکلا طبق توڑ توڑ کے
مردے لحد سے بھاگے کفن چھوڑ چھوڑ کے

فوجِ اعدا میں جو زندہ بچ گئے تھے۔ انھیں قربِ قیامت کا احساس ہونے لگا انھوں نے آخری حربہ استعمال کیا اور رسالتؐ پناہ کی دوہائی دینے لگے جس کو (climax)

سن کر امام حسینؑ کو اپنے نانا کی امت پر رحم آ گیا۔ تیغ نیام میں رکھ لی اور فرمایا:

"سر کاٹ لو کہ شوقِ شہادت کمال ہے"

شہادت

یہ سن کر اعدائے دیں نے تشنہ کام امام پر چاروں طرف سے تیروں کی بوچھار کردی۔ امام مظلوم زخموں سے چور چور ہوگئے۔ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے۔ اس وقت شمر نے ظلم و ستم کی انتہا کردی، خنجر لیے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔

جناب فضہ نے حضرت زینبؑ کو اس سانحے کی اطلاع دی، وہ دونوں قتل گاہ پہنچیں تو دیکھا کہ:

"غش میں ہیں شاہ سینے پہ ہے شمرِ بدگہر"

اس کے بعد خنجر اور گلو کا مرحلہ تھا۔ حضرت زینبؑ اس جاں گداز اور جاں گسل منظر کی تاب نہ لاسکیں۔ خاک اڑا کر سوئے شاہِ دوسرا دوڑیں اور لاشۂ شہ سے لپٹ گئیں۔ جناب فضہ نے سید الساجدین کو امام علیہ السلام کی شہادت کی اطلاع دی تو وہ بھی قتل گاہ کی طرف اُفتاں و خیزاں روانہ ہوئے لیکن چند قدم چلنے کے بعد ان پر ضعف و نقاہت کی کیفیت طاری ہوگئی اور ان کو غش آ گیا، جب حضرت زینبؑ ان کے قریب پہنچیں، ان کو بے ہوش دیکھ کر ان کا شانہ ہلایا۔

بند ۱۱۹

عابد نے کھولا آنکھوں کو غش سے جو ایک بار
زینبؑ سے بولے روتی ہو کیوں ہو کے بے قرار
جیتا ہوں میں نہ روؤ پھوپھی بہرِ کردگار
نکلے گا دم مرا نہ ابھی ہائے زینہار
صدمہ جدائی کا نہ ابھی دے کے جاؤں گا
سر ننگے شام میں تمھیں میں لے کے جاؤں گا

اس مرثیے میں شبِ عاشور اور یومِ عاشور کے روح فرسا واقعات کا بیان ہے۔ رخصت کے بند خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں جن میں اہلِ بیت علیہم السلام کے جذبات کی ترجمانی ہے۔

رزمیہ شاعری کے بھی عمدہ نمونے ہیں، تلوار کی تعریف اور رزم گاہ کے مناظر کی بالتفصیل مرقع کشی ہے۔ مرثیے کی زبان سلیس ہے، محاوروں اور صنائع بدائع کا برجستہ استعمال کیا ہے۔ ازلؔ کے دیگر مراثی کے مطالعے کے بعد ہی ان کے کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔

عطاؔ، آغا وزیر حسین خاں

''دولھا صاحب کے ایک شاگرد جناب مہدی حسین عرف اقبال بہادر ترکمان صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کے دادا آغا وزیر حسین خاں عطاؔ، میر انیسؔ کے شاگرد تھے اور فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ شاگرد شاعری میں تھے لیکن مرثیہ نہیں کہتے تھے، نوحے اور غزلیں کہتے تھے۔'' ☆

☆ ڈاکٹر نیر مسعود، گرامی نامہ، مورخہ ۲ر مئی ۱۹۷۹ء

ضمیمہ باب سوم
حضور نواب امجد علی خاں

"اشرف الدولہ نواب امجد علی خاں جن کے یہاں کی مجلس کا یہ ذکر ہے۔ خود وزیر نہیں تھے بلکہ وزیر اودھ منور الدولہ احمد علی خاں کے بیٹے (ان کی دوسری بیوی عمدہ خانم سرفراز محل کے بطن سے) تھے۔

میر انیسؔ، میر انسؔ، میر مونسؔ،[☆۱] میر نفیسؔ کے خطوں میں ان کا برابر ذکر ملتا ہے۔ یہ مرثیہ گو بھی تھے۔ حضورؔ تخلص کرتے تھے اور غالباً میر مونسؔ کے شاگرد تھے۔ مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ کے شاگرد بتائے جاتے ہیں اور ایک روایت کے مطابق انیسؔ[☆۲] کے پاؤں دبانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

غدر کے بعد پنجابی ٹولہ والے مکان سے میر انیسؔ کا بہت سا اسباب اور کچھ مرثیے چوری ہو گئے تھے۔ یہ مرثیے امجد علی خاں نے چار سو روپے کو خریدے۔[☆۳]

ان کا شمار لکھنؤ کے بہت بڑے رئیسوں میں تھا۔ آغا حجو شرفؔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

کہوں کیا میں امجد علی خاں کا حال　　　بہت سا ہے اندوختہ نقد و مال

☆۱-۲ بیانات سید علی مانوسؔ و میر نواب علی (قلمی) نوشتہ سید مسعود حسن ادیبؔ ذخیرہ ادیبؔ

☆۳- بیان سید علی مانوسؔ

منور بدولہ کے فرزند ہیں یہی جاں نشیں اُن کے دل بند ہیں
یہ ہیں لکھ پتی ہے بڑا اختیار قلیل الغذا ہیں یہ پرہیزگار

(نقل مخطوطہ سبطین آباد کلکتہ، ذخیرہ پروفیسر مسعود حسن ادیب)

قبل غدر امجد علی شاہی فوج کے کمان دار تھے۔ ان کے بیٹے نواب باقر علی خاں کے لیے انگریزوں نے نوابی کا خطاب موروثی قرار دیا۔"☆۱

"میر انیسؔ کی وفات ۲۹ر شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء کے وقت امجد علی خاں عتباتِ عالیات کی زیارت کو گئے ہوئے تھے۔ شروع صفر ۱۲۹۲ھ میں بیمار ہوکر واپس آئے اور انیسؔ کی وفات کے چار مہینے بعد ۲۹ر صفر ۱۲۹۲ھ مطابق ۷ر اپریل ۱۸۷۵ء کو انتقال کر گئے (نقل خط انسؔ و مونسؔ بنام حکیم سیّد علی ذخیرۂ ادیب)

میر مونسؔ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ بہ خطِ مونسؔ ذخیرہ ادیب میں موجود ہے جس کا یہ آخری شعر ہے۔

بہ گوش از سرِ جنت آواز آمد
کہ ہیہات نواب امجد علی خاں

"ہیہات نواب امجد علی خاں" کے اعداد ۱۲۸۹ھ ہیں، سرِ جنت یعنی 'ج' کے تین عدد کا تعمیہ کرنے سے سال وفات ۱۲۹۲ھ نکلتا ہے۔☆۲

میر امجد حسین

امجد حسین صاحب کو بھی مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔

"مولوی سردار مرزا صاحب سلمہٗ خلف مفتی نواب مرزا صاحب مرحوم مجھ سے ناقل تھے کہ جناب میر انیسؔ مرحوم کے ایک شاگرد نے ایک روز زمانۂ شاہی لکھنؤ میں مرزا صاحب سے آکر کہا کہ مجھے ملکہ زمانی کی مجلس میں آج پڑھوا دیجیے۔ فرمایا بہت اچھا اپنے پاس سے تمام قیمتی شال کپڑے ان کو پہنوائے ایک پینس میں خود دوسری میں ان کو

☆۱۔ مینول آف اودھ، مترجمین بنواری لال سکینہ لکھنوی و رام گوپال، اودھ پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۹ء، ص ۲۶۔۳۳

☆۲۔ سیّد نیر مسعود، ڈاکٹر، میر انیسؔ (کچھ غیر معروف حالات) غیر مطبوعہ۔

سوار کرا کے ہم راہ لے گئے۔ سلطان عالیہ ملکہ زمانی سے بہت تعریف کی اور پڑھوایا۔ وہاں سے دو شالہ اور شالی رومال اور شاید پانچ سو روپیہ ان کو ملے گھر واپس آ کر وہ مرزا صاحب کے شال کپڑے اتارنے لگے (انھوں نے فرمایا، آپ نے شاہ زادی کا ہدیہ تو قبول فرمالیا، اب یہ فقیر کا ہدیہ کیوں رد فرماتے ہیں، شال کپڑوں کے ساتھ دو سو روپیہ اپنے پاس سے اور دیے۔"

(حاشیہ ص ۶۸) جناب میر اصغر حسین صاحب ساکن لکھنؤ کاظمین نے مجھ سے ۱۳۳۰ھ[☆۱] میں بیان فرمایا کہ یہ میرے والد ماجد میر امجد حسین صاحب مرحوم پر مرزا صاحب نے احسان فرمایا تھا، ان کو ملکہ زمانی مرحومہ کے یہاں پڑھوایا تھا۔ یہ میر صاحب معمر ۷۰ سالہ ہیں اور نہایت ثقہ بزرگوار ہیں، ان کے والدِ ماجد میر صاحب کے شاگردِ رشید تھے۔"[☆۲]

❁

☆۱۔ مطابق ۱۲۔۱۹۱۱ء

☆۲۔ حیاتِ دبیر، حصہ اوّل، باب ۳، ص ۶۷۔ ۶۸

"شاگردانِ انیسؔ" کے بارے میں

چند محققین کی آرا

آپ نے "شاگردانِ انیسؔ" کے نام سے اردو کے مرثیہ نگاروں کی ایک کثیر تعداد کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ خدا آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔

فارغؔ سیتا پوری کی رزمیہ شاعری کو آپ نے جس طرح اجاگر کیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ مونسؔ کی مرثیہ گوئی پر بھی آپ کا محاکمہ خوب ہے، سبحان اللّٰہ۔

مرثیہ خوانی سے متعلق جتنی معلومات بھی آپ نے فراہم کردی ہیں، وہ پہلی بار عوام کے سامنے آئی ہیں۔ مرثیے کا یہ پہلو بالکل منفرد اور شائقینِ ادب کی خصوصی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہے۔

آپ کی تلاش سخت محنت طلب اور لائقِ ستائش ہے اور آپ کا کام بالکل اچھوتا، مفید اور تاریخِ مرثیہ نگاری کا ایک اہم باب ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری، کراچی

۳؍اکتوبر ۱۹۷۹ء

آپ کا کام بالکل منفرد ہے اور اب کوئی اور اس طرح کے کام کی ہمت نہیں کرسکتا۔ جو کرے گا، وہ صرف patch work ہوگا۔ آپ کا کام خالص تحقیقاتی اور قدرِ اوّل کا ہے۔

محمد رشید

جعفر منزل، لکھنؤ

۱۷؍ستمبر ۱۹۷۹ء

تعارف

انیسؔ کے شاگردوں پر ایک گراں قدر تحقیقی کام

جب انیسؔ کا جشنِ صد سالہ شروع ہوا تو مجھ سے بھی مضمون کی فرمائش کی گئی لیکن اس وقت میں اپنی کتاب ''میر اور میریات'' کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف تھا اور انیسؔ کے موضوع پر کوئی نئی چیز لکھنا میرے لیے بہت دشوار تھا۔ انیسؔ کے کلام کے چند محاسن بیان کر کے واہ واہ سبحان اللہ کرا دینا مشکل نہ تھا لیکن انیسؔ سے اپنے خصوصی تعلق کی بنا پر میں ان پر کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس میں افادیت کے ساتھ تنوع بھی ہو۔ اس ضمن میں میری نظر میں تین موضوع تھے:

(۱) انیسؔ کے سوانحِ حیات کی درستی (جس میں لاتعداد غیر مستند اور غلط واقعات بھرے پڑے ہیں)۔

(۲) کلامِ انیسؔ کی فرہنگ کی تیاری بشکلِ کتاب یا بشکلِ مشرح مضمون۔

(۳) شاگردانِ انیسؔ کی تفصیل کا تجسس

بمبئی سے ساٹھ میل دور گنیش پوری کے جنگل میں بیٹھ کر میرے لیے یہ تینوں کام بے حد دشوار تھے۔ خاص کر پیری اور علالت کے ساتھ جب میں ایک اہم ترین کام کی تکمیل میں مصروف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ تینوں کاموں کے لیے مستند ترین اور مناسب ترین آدمی پروفیسر مسعود حسین ادیب ہی ہو سکتے تھے لیکن اسی سال کی عمر میں پہلے اور دوسرے کام کا بوجھ اٹھانے کی توقع ان سے فضول تھی۔ ہاں شاگردانِ انیس کا

تجنس ان سے بہتر کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ خاص کر جب ادیب صاحب کے نانا بھی انیس کے شاگرد تھے۔ میں نے موصوف کو بار بار اس طرف متوجہ کیا لیکن غالباً صحت کی خرابی اور کبرسنی کی وجہ سے وہ اس اہم ذمے داری کو قبول نہ کرسکے۔

فرہنگِ انیس کے متعلق مجھے خبر ملی تھی کہ کوئی صاحب اسے لکھ رہے ہیں لیکن پتا نہیں کہ اس فرہنگ کا کیا ہوا۔ انیس کے شاگرد نسبتاً کم تھے پھر بھی ان کے تلامذہ اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ان شاگردوں میں کچھ تو ایسے ہیں جنھوں نے انیس سے صرف خوانندگی سیکھی، دوسرے شاگرد وہ ہیں جنھوں نے خوانندگی کے علاوہ میر صاحب سے اپنے مرثیوں پر بھی اصلاح لی ہے۔

میر انیس کے جن شاگردوں کے مراثی کی مطبوعہ جلدیں ہمارے پاس موجود ہیں، وہ صرف چار ہیں۔ ان چار میں سے تین مرثیہ گو خود خاندانِ انیس کے ہیں یعنی انیس کے بھائی انس، مونس اور انیس کے بڑے بیٹے نفیس، چوتھے شاگرد فارغ ہیں جو ہر اعتبار سے فخرِ دبستانِ انیس ہیں۔ اب تک تلامذۂ انیس میں انس، مونس، نفیس اور فارغ ہی کے نام لیے جاتے تھے۔ اس فہرست میں انیس کے دو بیٹوں رئیس اور سلیس کے نام اور بڑھائے جاسکتے تھے لیکن ان دونوں حضرات کا کوئی مطبوعہ مرثیہ دستیاب نہ ہوسکا۔ بہرحال یہ دونوں شاگردانِ انیس تو ہیں ہی مطبوعہ مراثی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے شاعرانہ مرتبے کا تعین مشکل ہے۔ اس علم کے باوجود کہ اس فہرستِ تلامذہ میں بہت کافی اضافے کی گنجائش ہے، ہم ہندوستان والے انیس کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر بھی اس معاملے میں کچھ نہ کرسکے۔

اس بار ہند و پاکستان کی ڈاک کھلنے پر میرے پاس ڈاکٹر سید تقام حسین جعفری کی ایک کتاب ''آثارِ انیس'' کے نام سے آئی جس میں انیس کے متعلق موضوعات پر ڈاکٹر جعفری کے چند مضامین شائع ہوئے ہیں، انھی مضامین میں ایک مضمون ''شاگردانِ انیس کا ایک جائزہ'' بھی تھا جس میں مستند طریقے پر انیس کے چوبیس شاگردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ افادیت کے اعتبار سے ڈاکٹر جعفری کا یہ تحقیقی مقالہ انیس کے جشنِ صد سالہ کا

اہم ترین مضمون ہے جس نے انیسیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ شاگردانِ انیسؔ کا تجسس ڈاکٹر جعفری کا ایک بے مثل تحقیقی کام ہے۔

موصوف ایک محنتی نوجوان محقق ہیں۔ چھیالیس شاگردانِ انیسؔ کے حالات مع نمونۂ کلام مہیا کر کے ڈاکٹر جعفری نے اردو میں ایک یادگار کتاب کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر صفدر آہ
گنیش پوری، بمبئی
(ہندوستان)

کتابیات

آثر، مرزا جعفر علی خاں لکھنوی، انیس کی مرثیہ گوئی اور ان پر چند اعتراضات، طبع اول، مطبع، ادبی پریس، لکھنؤ، ناشر، دانش محل، لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۱ء

احسن، سید مہدی حسن لکھنوی، واقعاتِ انیس، پاکستان میں پہلی مرتبہ، منظور پریس، لاہور، ناشر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء

افضل حسین ثابت، حیاتِ دبیر، حصہ اول، بار اول، جارج انیثم پریس، لاہور ۱۹۱۳ء

امرت لال، ڈاکٹر، سخن ورانِ بنارس، حصہ اول، مطبوعہ لیتھو الیکٹرک مشین پریس، وارانسی، بنارس

امیر، منشی امیر احمد، انتخابِ یادگار، مطبوعہ تاج المطابع، حیدرآباد، ۳رذی الحجہ ۱۲۹۰ھ (مطابق ۱۸۸۰ء)

انیس، میر ببر علی، مراثیِ انیس، جلد اول، (مرتبہ نائب نقوی) علمی پرنٹنگ ورکس لاہور، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۹ء

برتر، سید رحیم بخش، تاریخ واسطی، مطبع ریاضی، امروہہ

تاجور نجیب آبادی، پیامِ زندگی، جلد اول، بار اول، پبلشرز میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز، لاہور، ناشر اردو مرکز، لاہور

جرأت، شیخ قلندر بخش، مراثیِ جرأت، (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی) بار اول، اشرف پریس، لاہور، ناشرین، اردو دنیا، لاہور/ کراچی، ۱۹۷۳ء

حالی، خواجہ الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، باب الاسلام پرنٹنگ پریس، کراچی، ناشر، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۸ء

حامد حسن قادری، پروفیسر، مختصر تاریخ مرثیہ گوئی، مطبوعہ سپر آرٹ انگریورز، کراچی، ناشر اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۴ء

حیدر، سید ظہیر الدین، آبروئے وفا، بار اول، مطبوعہ پنجاب آرٹس پریس، لاہور، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۳ء

حیدر، سید ظہیر الدین، اعزازِ نفس، بار اول، مطبوعہ منظور پریس، لاہور، ناشر سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۷۵ء

ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستانِ دبیر، بار اول، مطبوعہ صفدر پریس، لکھنؤ، ناشر نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۶ء

رئیس، میر محمد عسکری، مراثیِ رئیس

زورؔ، محی الدین قادری، ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس، کراچی، ناشرین اردو اکیڈمی سندھ، کراچی جون ۱۹۶۰ء، اردو مرکز لاہور

زورؔ، محی الدین قادری، ڈاکٹر، اردو شہ پارے، جلد اوّل، مکتبہ ابراہیمیہ، امداد باہمی حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹ء

سردار مرزا، رو واقعات انیس، اصح المطابع، لکھنؤ

سری رام لالہ، خم خانۂ جاوید، جلد اوّل، بار اوّل، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۰۸ء

سری رام لالہ، خم خانۂ جاوید، جلد دوم، بار اوّل، رائے گلاب سنگھ پریس، لاہور ۱۹۱۱ء

سری رام لالہ، خم خانۂ جاوید، جلد سوم، بار اوّل، دلی پرنٹنگ ورکس، دلی، ۱۹۱۷ء

سری رام لالہ، خم خانۂ جاوید، جلد پنجم، بار اوّل، دلی پرنٹنگ ورکس، دلی، ۱۹۱۷ء

(مرتبہ پنڈت برج موہن دتاتریہ) ناشر لالہ امیر چند کھٹ علی پور روڈ، دلی، ۱۹۳۰ء

سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادبِ اردو، مطبوعہ تاج پریس، لاہور (مترجمہ مرزا محمد عسکری)، ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور

سلیس، میر محمد، مراثیٔ سلیس

شادؔ عظیم آبادی، پیمبرانِ سخن، پاکستان میں پہلی بار، مرتبین سید نقی احمد ارشاد قاسمی، ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی، مطبوعہ اردو ڈائجسٹ پرنٹرز، لاہور، ناشر بارگاہِ ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء

شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد اوّل، رشید آرٹ پریس، لاہور، ناشر ملک نذیر احمد، اردو بازار، لاہور

شبلی نعمانی، موازنۂ انیس و دبیر، مطبوعہ الامان پریس، لاہور، ناشر مکتبہ دین و دنیا، لاہور

شبیب علی حسین، شاہکار وحید، بار اوّل، مطبوعہ اسرار کریمی پریس، الٰہ آبادی، ناشر گہرستان، ودریہ، جون پور، فروری ۱۹۶۲ء

شدید، سید سجاد حسین، ریاضِ شدید، جلد سوم، بار اوّل، مطبوعہ سرفراز قومی پریس، ناداں محل روڈ، لکھنؤ، ناشر: مرزا صادق حسین شہید، ۱۹۶۷ء

صفدر آہ، ڈاکٹر، فردوسِ ہند، قادری پریس، محمد علی روڈ، بمبئی، ناشر کتاب کدہ، ۱۳۰۔ وائکیور روڈ، بمبئی ۱۹۵۸ء

صفدر حسین زیدی، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، بار اوّل، مطبوعہ پنجاب آرٹ پریس، لاہور، ناشر مکتبہ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۱ء

ضیاؔ، سید باقر حسن، مثنوی ضیائے دکن مع حصہ دوم، طبع ثانی، مطبع برہانیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۰۸ھ (مطابق ۱۸۹۲ء)

ضیغمؔ، محمد عبداللہ، یادگارِ ضیغم، ۱۳۰۲ھ (مطابق ۸۵۔۱۸۸۳ء)

عابد علی عابدؔ، پروفیسر، اصولِ انتقادِ ادبیات، طبع دوم، ریڈنگ پرنٹنگ پریس، لاہور، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور، مئی ۱۹۶۶ء

عروجؔ، عبدالرؤف، اردو مرثیے کے پانچ سو سال، بار اوّل، انٹرنیشنل پریس، کراچی، ناشر ع۔ س مسلم، مکتبہ نیا راہی، کراچی

عزیزؔ، مرزا محمد ہادی لکھنوی، نالۂ عزیز، نور المطابع، تحصیل نول، لکھنؤ

عشرتؔ، عبدالرؤف، تذکرۂ آبِ بقا، (مرتبہ مرزا جعفر علی نشتر) بار اوّل، مطبع تاج پریس لکھنؤ، ستمبر ۱۹۲۸ء

فارغؔ، سید محمد افضل، کوکبِ فارغ، بار اوّل، مطبوعہ امیر المطابع، سیتاپور ۱۹۱۵ء

فروغؔ، سید ظہور الحسن، شجراتِ طیبات، بار اوّل، امیر المطابع، سیتاپور، ۱۹۱۸ء

فضلیؔ، فضل علی (مولف)، کربل کتھا (مرتبہ مالک رام و ڈاکٹر مختار الدین احمد) اشاعت اوّل، اکتوبر ۱۹۶۵ء، مطبع دیال پرنٹنگ پریس، دلی، ناشر، ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ

فیضؔ، سید محمد تقی لکھنوی، تقریظ مسکت شائستہ بجواب انتخاب نساخ، مطبع قادریہ، کلکتہ، ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳۔۱۸۸۴ء)

محسنؔ، سیّد محسن علی، تذکرہ سراپا سخن، (مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن) بار اوّل، مطبع عالیہ، فیمل روڈ، لاہور، ناشر اظہار سنز، لاہور، جنوری ۱۹۷۰ء

محمود فاروقی، میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء مطبوعہ ہمدرد پریس، راولپنڈی، ناشر پنجاب اینڈ فرینکز بک ڈپو، لاہور

مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر (مرحوم)، روحِ انیسؔ، انڈین پریس لمیٹڈ، الٰہ آباد

مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر (مرحوم)، انیسیات، بار اوّل، ناشر اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

مونسؔ، مراثی مونسؔ، جلد اوّل، دوم و سوم، مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ

ناصرؔ، سعادت خاں، تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا، جلد اوّل، طبع اوّل، (مرتبہ مشفق خواجہ)، ناشر مجلس ترقیِ ادب، لاہور اپریل ۱۹۷۰ء

نجمیؔ، مولوی محمد عبدالغنی، بحر الفصاحت، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۶ء

نساخؔ، مولوی عبدالغفور، تذکرہ سخن شعراء بار اوّل، مطبع نول کشور، لکھنؤ، رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ (مطابق اکتوبر ۱۸۷۴ء)

نفیسؔ، گلزار نفیسؔ، مطبوعہ سندھ آفسٹ پریس، کراچی، جنوری ۱۹۷۵ء

نہال حسین، حکیم، حالِ قارئ، بار اوّل، مطبوعہ مرقع عالم پریس، ہردوئی، ۱۹۰۲ء

ہاشمؔ، سیّد محمد، مجموعہ تاریخ معروف بہ تاریخ آئینۂ جمال ۱۳۵۲ھ (مطابق ۱۹۳۳ء)

ہاشمی، نصیر الدین، دکن میں اردو، مکتبہ ابراہیمیہ پریس، حیدرآباد ۱۹۵۲ء

وقارؔ، سیّد فضل علی، خورشید خاوری (جلد ریاضِ وقار) بار اوّل، ۱۹۳۷ء

اخبار و جرائد

روزنامہ "جنگ" کراچی، ۲۵ر فروری ۱۹۷۵ء

"آج کل" (ماہنامہ)، دہلی، ۱۹۶۵ء

"اردو" سہ ماہی، انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ نمبر ۳ و ۴ (جلد ۴۹) ۱۹۷۳ء

"ارمغان فرخ"، دسمبر ۱۸۹۸ء

"افکار" (ماہنامہ)، رابسن روڈ، کراچی، شمارہ نمبر ۱۹

"انیس" (پندرہ روزہ)، لاہور، یکم تا ۱۶ر جنوری ۱۹۵۱ء

"روشنی" لکھنؤ، ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء

سرفراز، محرم نمبر، لکھنؤ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء

"صحیفہ" (سہ ماہی) مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ نمبر ۵، بابت جون ۱۹۵۸ء

"غنچۂ ارم"، ۱۲۹۹ ہجری (مطابق ۸۲_۱۸۸۱ء)

"قومی زبان" (ماہنامہ) انجمن ترقی اردو، کراچی، مئی ۱۹۷۶ء

"گل دستۂ سلام" ۱۳۴۴ ہجری مطابق ۲۶_۱۹۲۵ء

"ماہ نو" (ماہ نامہ)، کراچی، اپریل ۱۹۷۱ء

"ماہ نو" انیس نمبر، اضافی شمارہ، کراچی، ۱۹۷۲ء

مجلہ "انیس"، شائع کردہ دبستان انیس، راولپنڈی ۱۰ر دسمبر ۱۹۷۴ء

"مخزن"، لاہور دسمبر ۱۹۱۰ء

معاصر (حصہ ۳) مرتبہ عبدالستار بیدل، دائرۂ ادب، پٹنہ، دسمبر ۱۹۵۲ء

مخطوطات

احسانؔ	ق ۳-۶۳۹	کتب خانۂ خاص، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی
حسینی، شاہ ندیم اللہ	ق ۳-۶۸۳	کتب خانۂ خاص، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی
شاہیؔ	ق ۳-۶۱۱	کتب خانۂ خاص، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی
عابدؔ	ق ۳-۶۱۱	کتب خانۂ خاص، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی
نظامیؔ	ق ۳-۶۱۱	کتب خانۂ خاص، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی
ہاشمی	ق ۳-۶۱۱	کتب خانۂ خاص، انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی

maablib.org

مخطوطات

بیاضِ مراثی، مکتوبہ ۱۳۰۶ھ کتب خانۂ نواب سالار جنگ، حیدرآباد، (مطابق ۸۹-۱۸۸۸ء)

مخطوط نمبر ۱۰۱-۵۷ نیشنل میوزیم، دہلی

قلمی بیاض، ذخیرۂ ادیب، دین دیال روڈ، ادبستان، لکھنؤ

غیر مطبوعہ مراثی

رئیسؔ، میر احسان علی مطلع، کھولا جو مہر نے علمِ زرنگار کو

ریاضؔ، ریاض الدین، مطلع، ۱۔ جوہرِ تیغِ سخن ذہن رسا ہے میرا

۲۔ آئینۂ اقرار کو ایفا سے جلا ہے

۳۔ کس بجشتی کی رن میں آمد ہے

۴۔ ہاں اے زبانِ کلک مسیحا کا کام کر

قطعہ تاریخ

تمام حسین جعفری صاحب نے

جو صدق دل سے ہیں پرستار انیسؔ
شاگرد انیسؔ کے کیے ہیں یک جا
گویا کہ سجا دیا ہے دربار انیسؔ
ہے سب کے کلام میں انیسؔ کا رنگ
ہر مصرع ہے آئینۂ گفتار انیسؔ
اخلاف انیسؔ پر نہیں ہے موقوف
شاگرد بھی ہیں مطلع انوار انیسؔ
سو سال گزر گئے ہیں لیکن اب تک
قائم ہے وہی گرمیٔ بازار انیسؔ
فردوسیٔ ہند ان کو کہنا ہے بجا
لاریب یہ رتبہ ہے سزاوار انیسؔ

تاریخ ہے انتہائے اعزاز کے ساتھ
اللہ غنی زینتِ گلزار انیسؔ

۱۹۷۹ء

افسرؔ صدیقی

ہماری نئی کتابیں

نفی سے اثبات تک (تنقید)	جمال پانی پتی	۲۰۰ روپے
دو مصور: بشیر مرزا اور آزر زوبی (شخصیت و فن)	شفیع عقیل	۴۰۰ روپے
کہیں کچھ کھو گیا ہے (شاعری)	میر ظفر حسن	۱۵۰ روپے
عصری ادب اور سماجی رجحانات (تنقید)	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۱۵۰ روپے
مرگ زار (افسانے)	محمد حمید شاہد	۱۵۰ روپے
شاہکار سندھی کہانیاں (افسانے)	ترجمہ: شاہد حنائی	۲۰۰ روپے
۹/۱۱ سے پہلے اور بعد (کرنٹ افیئرز)	سلیم یزدانی	۶۰۰ روپے
تعبیر کی شرح (تنقید)	شمس الرحمٰن فاروقی	۲۰۰ روپے
سخن در سخن (خامہ بگوش کی شگفتہ تحریریں)	مرتبہ: مظفر علی سید	۲۰۰ روپے
سخن ہائے ناگفتنی (خامہ بگوش کی شگفتہ تحریریں)	مرتبہ: مظفر علی سید	۲۰۰ روپے
مژگاں تو کھول (افسانے)	حمرا خلیق	۱۲۰ روپے
دل ہی تو ہے (افسانے)	ڈاکٹر شیر شاہ سید	۳۰۰ روپے
علی شریعتی اقبال شریعتی (تنقید و تجزیہ)	ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	۲۰۰ روپے
دامن (شعری کلیات)	باقر نقوی	۴۰۰ روپے
سلاسل (ایلکس ہیلے کے ناول کا ترجمہ)	مترجم: انوار فاطمہ جعفری	۳۵۰ روپے

اکادمی بازیافت

آفس #17، گلی نمبر 3، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی۔ 74200

فون: 7751428-7751324

شاگردانِ انیس

ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری

FAZLEE'S BOOK
شاگردان انیس
32012 250 Feb10